ISSN:2788-4066-Online
ISSN:2518-9794-Print
Vol:6, Issue:3 July-Dec 2018

(Biannual Abstracted Research Journal)

AL-IRFAN

Faculty of Islamic Studies & Shariah
Minhaj University Lahore

www.mul.edu.pk/crd

HEC کے معیار کے مطابق

ISSN:2788-4066-Online
ISSN:2518-9794-Print
جلد۳، شمارہ:۲، جولائی۔دسمبر ۲۰۱۸ء

ششماہی علمی وتحقیقی مجلہ

العرفان

فیکلٹی آف اسلامک سٹڈیز اینڈ شریعہ
منہاج یونیورسٹی، لاہور

ششماہی علمی وتحقیقی مجلہ
العرفان
جولائی۔دسمبر ۲۰۱۸ء
فیکلٹی آف اسلامک سٹڈیز اینڈ شریعہ، منہاج یونیورسٹی، لاہور

العرفان

(ششماہی، علمی و تحقیقی مجلہ)

جلد:3 شمارہ:6 جولائی تا دسمبر 2018

مجلسِ ادارت

سرپرست اعلی	ڈاکٹر حسن محی الدین قادری،چیئرمین سپریم کونسل، منہاج القرآن انٹرنیشنل، لاہور
سرپرست	پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم غوری، وائس چانسلر، منہاج یونیورسٹی، لاہور
مدیر اعلیٰ	پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم رانا، ڈین فیکلٹی آف اسلامک سٹڈیز اینڈ شریعہ،منہاج یونیورسٹی، لاہور
مدیر	ڈاکٹر ممتاز الحسن، پرنسپل، کالج آف شریعہ اینڈ اسلامک سائنسز،لاہور
نائب مدیر	پروفیسر ڈاکٹر ثمر فاطمہ، پرنسپل منہاج کالج فار ویمن، منہاج یونیورسٹی، لاہور
معاون مدیر برائے اُردو	ڈاکٹر شبیر احمد جامی،چیئرمین شعبۂ علوم اسلامیہ،منہاج یونیورسٹی، لاہور
معاون مدیر برائے عربی	ڈاکٹر ممتاز احمد سدیدی، چیئرمین شعبہ عربی، منہاج یونیورسٹی،لاہور

فیکلٹی آف اسلامک سٹڈیز اینڈ شریعہ، منہاج یونیورسٹی،لاہور

برائے رابطہ فون: 0321-4457966, 03344053291

ای میل ایڈریس: alirfan@mul.edu.pk

مجلسِ مشاورت (بین الاقوامی)

۱. الأستاذ الدكتور محمد عبد الرحيم البيومي، عميد كلية أصول الدين، جامعة الأزهر، زقازيق، مصر

۲. الدكتور بان حميد الراوي، رئيس قسم علوم القرآن، كلية التربية للبنات، جامعة بغداد، عراق

۳. الدكتور غلام محمد قمر الأزهري، أمريكة

۴. پروفیسر ڈاکٹر شاہ کوثر مصطفی، یونیورسٹی آف ڈھاکہ، بنگلادیش

۵. پروفیسر ڈاکٹر درمش بلگر، استنبول یونیورسٹی، ترکی

۶. پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد سلیم، برطانیہ

۷. ڈاکٹر محمد رفیق حبیب، گلاسگو، برطانیہ

۸. ڈاکٹر حافظ منیر، برطانیہ

۹. ڈاکٹر محمد یعقوب بشوی، المصطفی انٹرنیشنل یونیورسٹی، قم ایران

مجلسِ مشاورت (قومی)

۱. پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، چیئرمین ہجویری چیئر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۲. پروفیسر ڈاکٹر نوراحمد شاہتاز، ڈائریکٹر، شیخ زید اسلامک سنٹر، کراچی یونیورسٹی، کراچی

۳. پروفیسر ڈاکٹر ہمایوں عباس، شعبہ علوم اسلامیہ، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

۴. پروفیسر ڈاکٹر خالق داد ملک، صدر شعبہ عربی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۵. پروفیسر ڈاکٹر سلطان شاہ، ڈین علوم اسلامیہ، جی سی یونیورسٹی، لاہور

۶. پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمید خان عباسی، شعبہ عربی واسلامک سٹڈیز، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

۷. پروفیسر ڈاکٹر محمد عبد اللہ صالح، شیخ زاید اسلامک سنٹر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۸. ڈاکٹر حافظ محمد سجاد، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ علوم اسلامیہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

۹. ڈاکٹر شمس الرحمٰن، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ علوم اسلامیہ، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

۱۰. ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، اسسٹنٹ ڈائریکٹر اقبال اکادمی، ایوان اقبال، لاہور

۱۱. ڈاکٹر ظہور اللہ الازہری، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ یونیوسٹی آف لاہور

۱۲. ڈاکٹر عاطف اسلم راؤ، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، کراچی یونیورسٹی

تعارف شرکاء

ضیاءالمصطفی مکی	لیکچرار کالج آف شریعہ
محمد احمد رضا	لیکچرار کالج آف شریعہ
نادیہ عالم	پی۔ایچ۔ڈی اسکالر، یونیورسٹی آف لاہور
رابعہ نسرین	ایم۔فل اسلامک سٹڈیز
محمد شفیق	پی۔ایچ۔ڈی ا سکالر ،شعبہ علوم اسلامیہ ،لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور
سید کاظم محمود کاظمی	ایم۔فل اسلامک سٹڈیز، امپیرئل کالج آف بزنس سٹڈیز، لاہور
حافظ محمد عمران	پی ایچ ڈی سکالر ،شعبہ علوم اسلامیہ ،لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور
حافظ عمیر گلزار	ایم۔فل اسکالر، جی سی یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر غلام حسین	پی۔ایچ۔ڈی
محمد اقبال	پی۔ایچ۔ڈی اسکالر،منہاج یونیورسٹی،لاہور
شگفتہ سید	ایم۔فل اسکالر،اسلامک سٹڈیز
شفاقت علی شیخ	پی ایچ ڈی اسکالر ،شعبہ علوم اسلامیہ ،لاہور یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر فیض اللہ بغدادی	اسسٹنٹ پروفیسر، منہاج یونیورسٹی، لاہور
محمد ابو بکر	لائبریرین،فریدِملت ریسرچ انسٹی ٹیوٹ،لاہور
حنا مرزا	ایم۔ایس کلینیکل سائیکالوجی/لیکچرار منہاج یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر محمد ارشد	صدر شعبہ علوم اسلامیہ گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، منڈی بہاؤالدین
حافظ احسن جاوید	ایم۔فل اسکالر،شعبہ علوم اسلامیہ دی یونیورسٹی آف ،لاہور
شیخ محمد عطاءالمصطفی	ایم۔فل اسکالر،اسلامک بینکنگ،منہاج یونیورسٹی،لاہور
فائزہ حسن	ایم۔فل اسکالر،اسلامک بینکنگ،منہاج یونیورسٹی،لاہور
مظہر ساجد	ایم۔فل اسلامک سٹڈیز۔یو۔ایم۔ٹی۔لاہور
عمر فاروق شاہ	لیکچرار(SIEBF)منہاج یونیورسٹی لاہور
سید ریحان الحسن گیلانی	پی ایچ ڈی اسکالر ،شعبہ علوم اسلامیہ ،لاہور یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر مسعود احمد مجاہد	اسسٹنٹ پروفیسر،منہاج یونیورسٹی،لاہور
محمد انوار الحسنین	ایم۔فل منہاج یونیورسٹی،لاہور
Dr. Muhammad Kairm Khan	Assistant Professor, Department of Islamic Studies, Imperial College of Business studies, Lahore
Ahmad Raza	M.Phil Islamic Studies

فہرست مقالہ جات

صفحہ نمبر	مقالہ نگار	عنوانات
	مدیر اعلی	اداریہ
۱	ضیاء المصطفی مکی / محمد احمد رضا	عصرِ حاضر میں اولاد کی پرورش کا چیلنج
۱۵	نادیہ عالم / رابعہ نسرین	خواجہ باقی باللہ اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے باہمی تعلقات
۳۸	محمد شفیق / سید کاظم محمود کاظمی	اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سونے کا استعمال
۷۲	حافظ محمد عمران / حافظ عمیر گلزار / ڈاکٹر غلام حسین	مولانا وحید الدین خان کا تصورِ تصوف
۸۷	محمد اقبال / شگفتہ سید	بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ میں اسلام کا تصورِ رواداری
۱۰۴	شفاقت علی شیخ / ڈاکٹر فیض اللہ بغدادی	عصرِ حاضر کا اخلاقی انحطاط اور تدارک کا لائحہ عمل
۱۴۸-۱۷۱	محمد ابو بکر / حنا مرزا	مدارس دینیہ میں جدید علوم کا آغاز وارتقاء (ایک تاریخی و تحقیقی جائزہ)
۱۷۲-۱۸۷	ڈاکٹر محمد ارشد / حافظ احسن جاوید	تحفظِ جان۔مقاصد شریعہ کے اطلاقی مطالعہ کے تناظر میں
۱۸۸-۲۰۵	شیخ محمد عطاء المصطفی / فائزہ حسن	اندلس میں مسلمانوں کے تاریخی کتب خانے (ایک تاریخی اور تحقیقی جائزہ)
۲۰۶-۲۲۴	مظہر ساجد / عمر فاروق شاہ / سید ریحان الحسن گیلانی	نکاح مسیار کا تحقیقی و شرعی جائزہ
۲۲۵-۲۵۱	ڈاکٹر مسعود احمد مجاہد / محمد انوار الحسنین	الوصف في شعر محسن النقوي
1	Dr. Muhammad Kairm Khan / Ahmad Raza	Education and Learning: Analytical Study of Quran and Sunnah

نوٹ: ادارہ مقالہ نگار کے پیش کئے ہوئے حقائق کی ذمہ داری قبول کرنے کا پابند نہیں ہو گا۔

العرفان مجلہ: اندرون ملک **قیمت**: 300 روپے فی شمارہ / 500 روپے سالانہ

بیرون ملک **قیمت**: 30 ڈالر فی شمارہ / 50 ڈالر سالانہ

Author Guidelines

مقالہ نگاران سے ضروری گزارشات

۱. "العرفان" میں قرآن و حدیث، سیرت النبی، تصوف، فقہ، تقابل اَدیان، اسلامی فلسفہ اور اسلامی تہذیب وتمدن سے متعلقہ موضوعات پر اردو، عربی، اور انگریزی زبان میں علمی و تحقیقی غیر مطبوعہ مقالات شائع کئے جاتے ہیں۔ تاہم جدید طرز کے موضوعات قابلِ ترجیح ہوں گے۔

۲. علمی مقالہ پہلے کسی مجلّے میں شائع نہ ہوا ہو اور نہ ہی اشاعت کیلئے کہیں اور جمع کرایا گیا ہو۔

۳. تمام مقالات A-4 سائز کے کاغذ پر (M.S Word) میں ایک جانب بغیر اَغلاط کے کمپوز کروا کر بھیجے جائیں۔

۴. تحقیقی مقالہ مآخذ و مصادر سمیت 6000 سے 7000 الفاظ پر مشتمل ہو۔

۵. تحقیقی مقالہ Microsoft word میں کمپوز کیا گیا ہو، جس میں اُردو عبارت کے لئے Jameel Noori Nastaleeq استعمال کیا گیا ہو، جبکہ عربی عبارت کے لئے Traditional Arabic استعمال کیا گیا ہو اور انگریزی کے لئے Times New Roman استعمال کیا جائے۔

۶. عنوان کا فاؤنٹ سائز 25، سب ہیڈنگز (Sub Headings) کا سائز 18، متن کا فاؤنٹ سائز 14 ہو، جبکہ فٹ نوٹ (Foot Note) کا سائز 12 ہو گا۔

۷. مقالہ میں درج شدہ تمام حواشی و حوالہ جات (Auto Arrange) ہوں اور مقالہ کے فٹ نوٹ (Foot note) میں ہی درج کیے جائیں۔

۸. مقالے کے آغاز میں انگریزی میں خلاصہ (Abstract) لازماً لکھا جائے جو 150 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔ علاوہ ازیں Abstract کے ساتھ Keyword بھی لکھے جائیں۔

۹. مقالہ نگار اپنے نام کے انگریزی ہجے، موجودہ عہدہ، نیز مکمل پتا اور رابطہ نمبر بھی اِرسال کرے۔

۱۰. حوالہ جات میں APA 6th Edition Format سٹائل کو مدِ نظر رکھا جائے۔ نیز حوالہ جات اور مآخذ و مصادر مقالے کے آخر میں فراہم کئے جائیں۔

۱۱. مقالہ نگار زبان کی صحت اور اسلوب نگارش کے حسن کو پیش نظر رکھے۔

۱۲. انگریزی مقالے میں شامل غیر انگریزی الفاظ کو لکھتے وقت (Transliteration) کے لیے "العرفان" مجلہ کے جدول کو مد نظر رکھا جائے۔ اسی طرح اردو مقالے کے انگریزی خلاصے میں شامل غیر انگریزی الفاظ کی نقل حرفی کے لیے بھی مذکورہ جدول کو کو مد نظر رکھا جائے۔

۱۳. مقالہ کی Soft copy بذریعہ e-mail یا CD میں اور Hard copy میں بھی مہیا کیا جائے۔

۱۴. مقالے کا عنوان جدید نوعیت کا ہو جس کے نتائج سے معاشرہ مستفید ہو سکے۔

۱۵. مقالہ ریسرچ کے جملہ اہداف کو پورا کرتا ہوا نظر آئے۔

۱۶. دوسری زبانوں (عربی اور انگلش) کی غیر مروجہ اصطلاحات بریکٹ کی صورت میں دی جائیں۔

۱۷. صفحہ کا مارجن دائیں "0.75" بائیں "0.75" اُوپر "1" نیچے "0.75" ہو۔

۱۸. ادارہ ہر مقالہ نگار کو شائع شدہ مجلہ کی ایک اعزازی کاپی فراہم کرے گا۔

۱۹. العرفان میں چھپنے کے لئے بھیجے گئے مقالہ کی Evaluation اور Plagiarism Report کے مراحل میں اگر کوئی تبدیلی ضروری ہوئی تو مقالہ نگار مذکورہ بالا دونوں رپورٹس کے مطابق مقالے میں اصلاح کے لئے زحمت دی جائے گی۔

کتابتِ مقالہ کے دوران آیاتِ قرآنیہ کو پھول دار بریکٹس ﴿﴾ اور اَحادیث و اَقوال کو (Inverted Commas) میں اندراج کیا جائے گا، نیز مقالہ کے دوران حوالہ جات کے اندراج کے لیے درج ذیل اسالیب کو اپنایا جائے گا:

قرآن کا حوالہ: سورۃ البقرۃ، ۲/۵۶

حدیث کا حوالہ: بخاری، محمد بن اسماعیل، (۱۴۰۸ھ)، الصحیح، دار الفکر العربی، بیروت، لبنان۔ ج۱، ص۳۴، رقم:۱۰۹

کتاب کا حوالہ: یزدانی، ڈاکٹر خواجہ حمید، (۲۰۰۴ء)، شرح اسرار و رموز، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان۔ ص ۴۵

مجلہ کا حوالہ: اوج، ڈاکٹر محمد شکیل، "نکاح و طلاق میں زوجین کے حقوق کا تعین"، ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، (انڈیا)، دسمبر، ۲۰۱۰ء، ص:۴۳۲

آن لائن دستاویز کا حوالہ: https://dorar.net/article/1716

عصرِ حاضر میں اولاد کی پرورش کا چیلنج

سیرت الرسول کی روشنی میں ایک جائزہ

☆ ضیاء المصطفی مکی الازہری

☆☆ محمد احمد رضا

ABSTRACT

Allah Almighty created man and sent him into the world and united him in various relationships. And made the love of these relationships a part of human nature that man is happy with another. The best relation is made by Allah is the relation of blood line. From these relations there is one relation between parents and children. Children are Gift from God therefore we must take care of them in there every aspect of life. We are living in an era where we do not find any moral values, children are interrupted by social media and electronic media where they come across many things such as atheism and other temptations. So parents face many challenges regarding bringing up their children .in this scenario it is compulsory for parents to read the life of the Holy prophet PBUH so they can inform there kids about the social, economic and practical aspects of Prophet's life thus they can be saved from the temptations and evils of the time. Because we find all solutions of our lives in the life of Holy Prophet PBUH. when we study the life of holy prophet PBUH we come across that he set many rights for children such as we find in his teachings to give children respect, good names and do justice between children's as we discussed comprehensively in this in this paper. By the deep analysis of holy prophet's life we conclude that there is deep relationship between the children growth and holy prophets life. In this article we will present the rights of children in the light of Holy prophet's life so that we can overcome the challenges of modern era.

Keywords: Rights of children, Life of Holy Prophet, challenges

---

☆ لیکچرار کالج آف شریعہ اینڈ ماڈرن سائنسز، منہاج یونیورسٹی لاہور

☆☆ لیکچرار کالج آف شریعہ اینڈ ماڈرن سائنسز، منہاج یونیورسٹی لاہور

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تخلیق فرمایا، اور اسے دنیا میں بھیج کر مختلف رشتوں میں جوڑ دیا۔ اور ان رشتوں کی محبت کو فطرت انسانیہ کا حصہ بنا دیا کہ انسان انسان سے خوش ہوتا ہے، اور اسی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرنا پسند کرتا ہے۔ انھیں رشتوں میں ایک عظیم رشتہ والدین اور اولاد کا ہے۔ اس رشتے کو نبھانے کیلیئے اللہ تعالیٰ نے حقوق و فرائض بھی رکھے ہیں۔ جس طرح اولاد پر والدین کے حقوق ہیں اسی طرح والد پر بھی کچھ حقوق ہیں جو اس نے اولاد کے لیے ادا کرنے ہیں، حدیث مبارکہ میں ہے۔

''كلكم راع وكلكم مسؤول عن رعيته.''(۱)

''تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر نگہبان سے اس کے تحت آنے والوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔''

اولاد اللہ رب العزت کی ایسی نعمت ہے جس کی تمنا خود انبیاء کرام کرتے رہے اور دعا فرماتے رہے کہ: اللہ مجھے صالح اولاد عطا فرما جو میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو تاکہ وہ ان کے لئے آزمائش و فتنہ نہ بنے۔

قرآن مجید فرقان حمید میں آتا ہے کہ جس جگہ حضرت مریمؑ کو اللہ رب العزت نے بغیر موسم کے پھل عطا کئے وہاں پر حضرت زکریاؑ نے اپنے لیے نیک اولاد کی دعا کی۔ اللہ رب العزت نے دعا کو قبول فرماتے ہوئے حضرت یحیٰ کی بشارت دی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

''هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِنَ الصَّالِحِينَ.''(۲)

ترجمہ: اسی جگہ زکریا (علیہ السلام) نے اپنے رب سے دعا کی، عرض کیا: میرے مولا! مجھے اپنی جناب سے پاکیزہ اولاد عطا فرما، بے شک تو ہی دعا کا سننے والا ہے۔ ابھی وہ حجرے میں کھڑے نماز ہی پڑھ رہے تھے (یا دعا ہی کر رہے تھے) کہ انہیں فرشتوں نے آواز دی: بے شک اللہ آپ کو (فرزند) یحیٰی (علیہ السلام) کی بشارت دیتا ہے جو کلمۃ اللہ (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) کی تصدیق کرنے والا ہو گا اور سردار ہو گا اور عورتوں (کی رغبت) سے بہت محفوظ ہو گا اور (ہمارے) خاص نیکوکار بندوں میں سے نبی ہو گا۔

حضور ﷺ نے نیک اولاد کو صدقہ جاریہ فرمایا، حدیث پاک میں ہے:

---

۱. احمد بن حنبل، (۱۹۹۵ء)۔ مسند احمد بن حنبل، ج:۴، ص:۵۳۳، رقم الحدیث:۵۱۶۷، دار الحدیث، القاہرہ۔

۲. آل عمران، 3: 39-38

''عن أبي هريرة أن رسول الله قال إذا مات الإنسان انقطع عنه عمله إلا من ثلاثة أشياء من صدقة جارية أو علم ينتفع به أو ولد صالح يدعو له.''(۳)

''جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے مگر اس کے تین عمل جاری رہتے ہیں، صدقہ جاریہ، وہ علم جو نافع ہو اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی ہو۔''

سیرت نبوی ﷺ سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے اولاد کے فراق پر رحمت دو عالم ﷺ اشک بار ہوئے وہاں یہ بھی ملتا ہے کہ آپ نے اولاد کی اچھی تعلیم و تربیت کے لئے والدین پر حقوق مرتب فرمائے۔ جیسا کہ ارشاد گرامی ہے:

''مروا أولادكم بالصلاة وهم أبناء سبع سنين واضربوهم عليها وهم أبناء عشر وفرقوا بينهم في المضاجع.''(۴)

ترجمہ: اپنے بچوں کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دو، اور جب وہ دس سال کی عمر کو پہنچیں تو نماز کے لیے مارو اور اس عمر میں ان کے بستر الگ کر دو۔

اولاد کی تربیت کے بارے میں یہ بھی فرمایا کہ ان پر رحم کرنا، شفقت سے پیش آنا والدین کے فرائض میں سے ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''ليس منا من لم يرحم صغيرنا ويوقر كبيرنا.''(۵)

ترجمۃ: وہ ہم سے نہیں جو چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور بڑوں کی توقیر نہیں کرتا۔

اولاد کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے ایک اور ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''عن أبي هريرة قال قال رسول الله أعينوا أولادكم على البر.''(۶)

حضرت ابو ہریرہ رضي الله عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: اپنی اولاد کی نیک کام کرنے میں مدد کرو۔

''أكرمو أولادكم وأحسنوا أدبهم.''

اپنی اولاد کا اکرام کرو اور انہیں اچھا ادب سکھاؤ۔

---

۳ . ابو یعلی الموصلی، احمد بن علی بن المثنی، (۱۹۸۴ء)۔ مسند ابی یعلی، ج:۱۱، ص:۳۴۳، رقم الحدیث:۶۴۵۷، دار المامون للتراث، دمشق

۴ . ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، (۲۰۰۵ء)۔ السنن، ص:۱۰۴، رقم الحدیث:۴۹۴، دار الفکر، بیروت

۵ . البخاری، محمد بن اسماعیل، (۱۹۸۹ء)۔ الادب المفرد، ص:۱۸۹، رقم الحدیث:۳۶۳، دار البشائر الاسلامیہ، بیروت

۶ . الطبرانی، ابو القاسم سلیمان بن احمد، (س ن)۔ المعجم الاوسط، ج:۴، ص:۲۳۷، رقم الحدیث:۴۰۷۶، دار الحرمین، القاہرہ

اولاد کی اچھی تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھ عدل وانصاف کرنا اور ان سے محبت وشفقت سے پیش آنا بھی سیرت طیبہ سے ثابت ہے۔

چنانچہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے حضرت سیدنا حسنؓ کو بوسہ دیا تو ایک صحابی حضرت اقرع بن حابس نے عرض کی کہ میرے تو دس بچے ہیں میں نے تو کبھی بوسہ نہیں دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا۔

"من لایرحم لایرحم."(۷)

ترجمہ: جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا"

ایک اور حدیث مبارکہ میں ہے:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کی ایک مسکین عورت اپنی دو بچیوں کے ساتھ میرے پاس آئی۔ میں نے اس کو تین کھجوریں دیں جس کو اس نے دو بیٹیوں کو دیں اور ایک خود کھانے ہی لگی تھی کہ بیٹیوں نے وہ کھجور بھی مانگ لی، اس نے اس کھجور کے دو حصے کیے اور آدھی آدھی دونوں میں بانٹ دی اور خود نہ کھائی۔

سیدنا عائشہؓ کو یہ بات پسند آئی اور آپؓ نے رحمت دوعالم ﷺ کو بات بتائی۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

"إن الله قد أوجب لها الجنة وأعتقها بها من النار."(۸)

اس ایک کھجور کی بدولت اللہ نے اس عورت کے لیے جنت لازم کردی یا اس کو دوزخ سے رہائی دے دی۔

اس مقدمے سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سیرت طیبہ ﷺ کی روشنی میں بچوں کے حقوق پر کافی زور دیا گیا ہے اور اس پر رحمت دوعالم ﷺ نے خود عمل کر کے تا قیامِ قیامت تمام اُمت کے لیے سنت مبارکہ بنا دیا ہے۔ مگر افسوس کہ عصر حاضر میں سیرت طیبہ سے نابلدی اور جہالت کی وجہ سے اولاد کی تربیت میں کافی چیلنجز درپیش ہیں جس کی وجہ سے اولاد کی تربیت ایک اہم مسئلہ بن چکی ہے اور والدین کو کافی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑ گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سیرت طیبہ میں بیان کئے گئے اولاد کے حقوق لوگوں تک عام کئے جائیں تاکہ ہر کس ان کو جان کر عملی صورت میں تطبیق کر سکے، جس سے یہ درپیش چیلنجز سے نمٹا جا سکے۔

۷۔ ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، (۱۹۹۳ء)۔ الزهد، ص:۹۸، رقم الحدیث:۸۲، دار المشکاۃ، حلوان

۸۔ ابن حبان، محمد بن حبان بن احمد، (۱۹۹۳ء)۔ صحیح ابن حبان، ج:۲، ص:۱۹۲، رقم الحدیث:۴۴۸، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت

اب ہم آنے والی سطور میں سیرت طیبہ کی روشنی میں عصر حاضر میں بچوں کے حقوق تفصیلا بیان کریں گے۔

اولاد کیلئے اچھی ماں کا انتخاب، ان کی تعلیم و تربیت، نان و نفقہ اور ان کو حلال کھلانا وغیرہ یہ تمام حقوق وہ ہیں جو والد کے لیے سیرت نبوی ﷺ سے ملتے ہیں تو اس سلسلے میں کچھ حقوق ایسے ہیں جو اولاد کی ولادت سے پہلے کے ہیں اور کچھ حقوق ایسے ہیں جو اولاد کی ولادت بعد کے ہیں۔ ابتداء میں ہم ولادت سے قبل کے حقوق بیان کرتے ہیں۔

ولادت سے قبل کے حقوق

ولادت سے قبل حقوق میں بچے کیلئے ایک اچھی ماں کا انتخاب کرنا ہے، کیونکہ والدہ بچے کی پہلی درسگاہ ہوتی ہے۔ والد کسب حلال کیلئے سارا دن گھر سے باہر بسر کرتا ہے۔ مگر ماں ہر وقت بچے کے پاس ہوتی ہے جو اس کی ہمہ قسم تعلیم و تربیت کی ذمہ داری نبھاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ بیوی کے چناؤ میں سیرت الرسول ﷺ سے استفادہ کیا جائے، اور سیرت الرسول ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں ایک اچھی صالحہ بیوی کا انتخاب کیا جائے تاکہ وہ اچھی ماں بن کر اچھی اولاد امت کو دے سکے۔ اور اسی طرح کفوء میں شادی کی جائے، حدیث پاک میں آتا ہے:

''تنكح المرأة لأربع لمالها ولحسبها وجمالها ولدينها فاظفر بذات الدين تربت يداك.''(۹)

عورت سے چار چیزوں کے باعث نکاح کیا جاتا ہے اس کے مال، اس کے حسب و نسب، اس کے حسن و جمال اور اس کے دین کی وجہ سے تیرے ہاتھ گرد آلودہ ہوں، تو دیندار کو حاصل کر۔

کیونکہ حسن و جمال کی کمی کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح باقی کمیاں پوری کی جاسکتی ہیں مگر دین کی کمی ہمیشہ رہتی ہے جس کا اثر اولاد تک ہوتا ہے۔ اس لیے سیرت طیبہ سے یہ ملتا ہے کہ ایک صالحہ عورت کا شادی کے لیے انتخاب کیا جائے تاکہ اولاد کی تعلیم و تربیت اچھی ہو۔ کسی فاسقہ سے شادی نہ کی جائے تاکہ وہ اولاد کے مستقبل میں وبال نہ بنے، اور نہ ہی اولاد کیلئے عار بنے۔

اسی طرح ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''عن عائشة قالت قال رسول الله تخيروا لنطفكم وانكحوا الأكفاء وأنكحوا إليهم.''(۱۰)

۹۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، (س ن)۔ صحیح البخاری، ص:۱۳۰۸، رقم الحدیث:۵۰۹۰، دار الفکر، بیروت

۱۰۔ ابن ماجہ، محمد بن یزید، (۲۰۰۳ء)۔ السنن، ص:۴۵۸، رقم الحدیث:۱۹۶۸، دار الفکر، بیروت

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنے نطفوں کے لیے عورتیں پسند کرو، کفو میں نکاح اور بیواؤں کے نکاح کرو۔

ایک اور حدیث پاک میں ہے:

''الدنيا متاع وخير متاع الدنيا المرأة الصالحة.''(۱۱)

حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: دنیا متاع ہے اور دنیا کی بہترین متاع نیک عورت ہے۔

ولادت کے بعد کے حقوق

جس طرح بچے کی ولادت سے قبل کے حقوق ہیں۔ اسی طرح اس کی ولادت کے بعد کے حقوق بھی ہیں۔ ان حقوق کا جائزہ ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔

(۱) گھٹی دلوانا

جب بچہ اس دنیا میں آجاتا ہے تو ولادت کے دن اسے کسی صالح اور اچھے انسان سے گھٹی دلوانا سیرت الرسول ﷺ سے ثابت ہے۔ اور یہ صحابہ کرام کا معمول تھا کہ جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تو اسے رحمت دوعالم ﷺ کی بارگاہ اقدس میں لے جاتے اور آپ ﷺ تحنیک فرماتے۔ کیونکہ بچے کے جسم میں جو پہلی غذاء جاتی ہے اس کا بچے کی سیرت پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ اگر وہ گھٹی کسی نیک وصالح کی ہوگی تو بچے میں اس کی مثبت تاثیر ہوگی جو ہمیں عصر حاضر میں موجود چیلنجز کا سامنا کرنے اور اچھی تربیت میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔

(۲) اچھا نام رکھنا

سیرت طیبہ سے ثابت ہے کہ اگر کوئی نام آپ ﷺ کو ناپسند ہوتا تو آپ تبدیل فرما دیتے، اور اچھے اچھے اسماء کا انتخاب فرماتے۔ حدیث پاک میں ہے۔

''تَسَمَّوْا بِأَسْمَاءِ الْأَنْبِيَاءِ وَأَحَبُّ الْأَسْمَاءِ إِلَى اللهِ عَبْدُ اللهِ وَعَبْدُ الرَّحْمَنِ وَأَصْدَقُهَا حَارِثٌ وَهَمَّامٌ وَأَقْبَحُهَا حَرْبٌ وَمُرَّةُ.''(۱۲)

۱۱۔ مسلم، مسلم بن الحجاج القشیری، (۲۰۰۳ء)۔ الصحیح، ص: ۶۹۵، رقم الحدیث: ۳۵۳۳، دار الفکر، بیروت

۱۲۔ النسائی، ابو عبدالرحمان احمد بن شعیب، (۲۰۰۵ء)۔ السنن للنسائی، ص: ۸۶۴، رقم الحدیث: ۳۵۶۴، دار الفکر، بیروت

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انبیائے کرام کے ناموں پر نام رکھا کرو اور اللہ تعالیٰ کو تمام ناموں سے عبد اللہ اور عبد الرحمن زیادہ پسند ہیں۔ سب ناموں سے سچے حارث اور ہمام ہیں جب کہ سب سے برے نام حرب اور مرہ ہیں۔

سیرت طیبہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ انبیاء کرام کے نام پسند فرماتے۔ جیسا کہ اپنے صاحبزادہ گرامی قدر کا نام ابراھیم رکھا۔ حدیث پاک میں آتا ہے:

''عن أنس بن مالك قال قال رسول الله ولد لي الليلة غلام فسميته باسم أبي إبراهيم.''[۱۳]

ترجمہ: رات مجھے بیٹا پیدا ہوا اس کا نام میں نے ابراھیم رکھا۔

عصر حاضر میں ہر کس نئے ناموں کی تلاش میں ہوتا ہے۔ سیرت طیبہ کی روشنی میں ہمیں یہ ملتا ہے کہ جو نام رکھیں ذو معنی ہوں اور منفرد ہوں، اور مستحب یہ ہے کہ انبیاء کرام کے ناموں سے اپنے بچوں کے نام رکھے جائیں۔ کیونکہ نام کی تاثیر ہوتی ہے ذات میں، مثلاً کسی کو اگر ہم عمر دراز کے نام سے پکاریں گے تو ہمہ وقت اس کیلئے یہ اچھا نام دعاء بن کر سایہ فگن رہے گا۔ اور اگر نام اچھا نا ہو تو وہ اس کیلئے منفی اثرات کا سبب بن سکتا ہے۔

(۳) عقیقہ کرنا

سیرت رسول ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے کہ بچے کا عقیقہ کرنا بھی والد کے حقوق میں شامل ہے حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ قَالَ كُلُّ غُلَامٍ رَهِينَةٌ بِعَقِيقَتِهِ تُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ سَابِعِهِ وَيُحْلَقُ وَيُسَمَّى.''[۱۴]

حضرت سمرہ بن جندب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر لڑکا اپنے عقیقے کی وجہ سے مرہون ہوتا ہے۔ اس کے ساتویں روز جانور ذبح کیا جائے، سر منڈایا جائے اور اس کا نام رکھا جائے۔

اور اس طرح ساتویں دن حلق راس اور بالوں کے برابر چاندی کا صدقہ کرنا بھی سیرت طیبہ سے ثابت ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ:

''عن علي بن أبي طالب قال عق رسول الله عن الحسن بشاة وقال يا فاطمة احلقي رأسه وتصدقي بزنة شعره فضة قال فوزنته فكان وزنه درهما أو بعض درهم.''[۱۵]

۱۳۔ ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، (۲۰۰۵ء)۔ السنن، ص:۵۹۹، رقم الحدیث:۳۱۲۶، دار الفکر، بیروت

۱۴۔ الدارمی، عبد اللہ بن عبد الرحمان، (۱۹۸۶ء)۔ سنن الدارمی، ج:۲، ص:۱۱۱، رقم الحدیث:۱۹۶۹، دار الکتاب العربی، بیروت

حضرت علی بن ابی طالب رضي الله عنه سے روایت ہے حضور نبی اکرم ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف سے ایک بکری عقیقہ (میں ذبح) کی اور فرمایا: اے فاطمہ! ان کا سر مونڈھ کر بالوں کے برابر چاندی صدقہ کرو تو ان کا وزن ایک درہم یا درہم سے کچھ کم تھا۔

(۴) ختنہ کرنا

سیرت طیبہ میں اولاد کے جو حقوق والدین پر ہیں ان میں بچے کا ختنہ کرنا بھی ہے۔ چنانچہ حدیث مبارکہ میں ہے کہ

''عن أبي هريرة رواية الفطرة خمس أو خمس من الفطرة الختان والاستحداد ونتف الإبط وتقليم الأظفار وقص الشارب.''(۱۶)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ فطرت پانچ چیزیں ہیں۔ یا پانچ چیزیں فطرت کے تقاضوں سے ہیں۔ یعنی ختنہ کروانا، موئے زیر ناف صاف کرنا، بغل کے بال اکھاڑنا، ناخن تراشنا اور مونچھیں پست کرنا۔

(۵) بچے کے دودھ کیلئے اچھی ماں کا انتخاب کرنا

اسی طرح اگر ماں کا دودھ نہیں ہے یا کسی بھی شرعی عذر کی وجہ سے ماں دودھ پلانے کے قابل نہیں تو والد کو چاہیئے کہ بچے کے دودھ کیلئے ایک اچھے حسب ونسب واخلاق حسنہ والی ماں کا اہتمام کرے، کیونکہ ماں کے دودھ کا بچے پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ دودھ ہی بچے کی غذاء بن کر اس کے جسم کا حصہ بنتا ہے۔

(6) اولاد کی شادی کے امور

عصر حاضر میں اولاد کی شادی کے امور میں والدین کو مختلف چیلنجز کا سامنا ہے، بڑھتے ہوئے فحاشی وعریانی کے رجحانات، سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کی سہولت نے والدین پر کافی ذمہ داریاں عائد کر دی ہیں، اور جو والدین اس امر کو سنجیدہ نہیں لے رہے ان کی اولاد ان کے ہاتھ سے نکل کر بے راہ روی کا شکار ہوتی جارہی ہے۔ اور یہ سب دین اور سرکار دوعالم ﷺ کی تعلیمات سے دوری کا نتیجہ ہے۔ اولاد کی شادی کے امور میں بروقت شادی کا نا کرنا اور بعض والدین کا رشتے کے انتخاب میں اولاد کی رضا کو ملحوظ خاطر نا رکھنا اور بعض بچوں کا والدین کی رضا کا خیال نا رکھنا وغیرہ شامل ہیں، جن سے موجودہ زمانے میں

۱۵۔ ابن ابی شیبہ، عبد اللہ بن محمد، (۱۹۸۸ء)۔ المصنف فی الاحادیث والاثار، ج:۵، ص:۱۱۳، رقم الحدیث: ۲۴۲۳۴، مکتبہ الرشد، الریاض

۱۶۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، (س ن)۔ صحیح البخاری، ص:۱۵۰۱، رقم الحدیث:۵۸۸۹، دار الفکر، بیروت

بہت زیادہ مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ امت افراط و تفریط کا شکار ہو گئی ہے۔ جہاں رشتے کے انتخاب میں شریعت نے شادی کرنے والے کو حق دیا ہے وہاں والدین کی رضا کو بھی شریعت مطہرہ نے زندگی کے تمام امور میں مقدم کیا ہے جب تک شریعت کے مطابق ہوں۔ والدین کو بچوں کی رضا دیکھنی چاہیئے اور بچوں کو والدین کی، یعنی ایسے رشتے کا انتخاب کیا جائے جس میں دونوں راضی ہوں۔ مصر جامعہ ازھر شریف میں دوران تعلیم محدث مصر علامہ شیخ یسری رشدی جبر سے دوران درس یہ سننے کا اتفاق ہوا کہ جو شخص والدین کو ناراض کر کے کہیں شادی کرتا ہے جس رشتے پر وہ راضی نا ہوں تو میں نے ایسی کوئی بھی شادی کامیاب نہیں دیکھی، بلکہ ناکام ہو جاتی ہے۔ تو والدین کے حقوق میں ہے کہ اولاد کی بر وقت شادی کریں اور اچھا دین دار رشتہ منتخب کریں جیسا کہ سیرت طیبہ ﷺ سے واضح ہے اور انتخاب رشتہ میں ان کی رضا کو بھی ملحوظ خاطر رکھیں۔ اس کے علاوہ شادی میں فضول خرچی و ناجائز امور سے دور رہنا بھی والدین کے حقوق میں سے ہے، جیسے اسلحہ کا استعمال، ناچ گانا وغیرہ۔

تربیتی حقوق

سیرت طیبہ کا بغور مطالعہ کریں تو بچوں کی تربیت پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ والدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی اولاد کی اچھی تربیت کریں تا کہ وہ اپنی دنیا و آخرت اچھی کر کے والدین کے لیے بھی صدقہ جاریہ بنیں۔ ان کے عقیدے کی اصلاح، اعمال کی اصلاح اور اخلاق وغیرہ کی اصلاح کرنا والدین پر فرض ہے۔ تا کہ وہ فرائض کو جان سکے اور حلال و حرام میں فرق کر سکے۔ حدیث پاک میں ہے:

"علموا الصبي الصلاة بن سبع سنين واضربوه عليها بن عشر."[۱۷]

بچے کو سات سال کی عمر میں نماز سکھاؤ اور دس سال کی عمر میں نماز نہ پڑھنے پر مارو۔

عصر حاضر میں بچوں کی تربیت میں ذرا بھر بھی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔ اگر بچپن سے وہ دین کے مطابق اپنی نشو و نما کریں گے تو یہ ان کی عادت کا حصہ بن جائے گا کہ وہ اپنی زندگی اسلام کے مطابق گزاریں۔ والدین کو چاہیے کہ اولاد کو اچھا اخلاق سکھائیں اور آداب سکھائیں۔ اور اپنے نبی کریم ﷺ اور ان کے اہل بیت و صحابہ سے محبت سکھائیں اور ان کی تربیت کریں کہ قرآن سے ان کی لو لگائیں، حدیث پاک میں ہے:

"أدبوا أولا دكم على ثلا ث خصال حب نبيكم و أهل بيته وتلاوة القرآن."[۱۸]

۱۷۔ الدارمی، عبد اللہ بن عبد الرحمان، (۱۹۸۶ء)۔ سنن الدارمی، ج:۱، ص:۳۹۳، رقم الحدیث:۱۴۳۱، دار الکتاب العربی، بیروت

۱۸۔ سیوطی، جلال الدین، (س ن)۔ الجامع الصغیر، ج:۱، ص:۲۵، رقم الحدیث:۳۱۱، دار الکتب العلمیہ، بیروت لبنان

اپنی اولاد کو تین خصلتوں کا ادب سکھائیں: اپنے نبی کی محبت، اور ان کے اہل بیت کی محبت اور تلاوت قرآن کی محبت۔

والدین کے حقوق میں یہ بھی ہے کہ اولاد کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آئیں۔ انھیں احترام دیں اور بے جا سختی اور شدت سے پرہیز کریں۔ اور یہ بات سیرت الرسول ﷺ سے ملتی ہے کہ اپنی اولاد خواہ وہ بیٹی ہو یا بیٹا، اسے محبت واحترام دیں۔ رحمت دوعالم ﷺ سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا وأرضاھا کی تشریف آواری پر کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ اور ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے تھے۔ اسی طرح آپ اپنے نواسوں سیدنا حسن مجتبیٰ اور سیدنا حسین سید الشہداء کو شفقت و محبت سے بوسہ دیا کرتے تھے۔

تربیتی حقوق میں گھر کی فضاء کو خوشگوار رکھنا ایک اہم امر ہے، اگر والدین آپس میں ہر وقت بحث ومباحثہ، نوک جھونک اور اختلافات ونزاع کا شکار رہین گے تو اس کا اثر لامحالہ بچوں پر پڑے گا۔ سیرت طیبہ سے ثابت ہے کہ رحمت دوعالم ﷺ گھر میں ایک مثالی شوہر کی حثیت سے زندگی بسر فرماتے، آپ نے ایک مثالی معاشرہ قائم فرمایا۔ آج کل بچوں کے مزاج میں تلخی، سخت رویہ، غیر اخلاقی گفتگو وغیرہ جیسے مسائل اسی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

رحمت دوعالم ﷺ کی سیرت طیبہ قرآن کریم کی ایک چلتی پھرتی تفسیر تھی، آپ ﷺ پہلے خود عمل کرکے پھر امت کو اس کی ترغیب دیتے، والد کو چاہیئے کہ وہ اولاد کیلئے خود ایک عملی نمونہ بنے، اور اولاد کو اپنی محبت دے کر زیادہ قرب دے جیسا کہ سیرت طیبہ سے ثابت ہے۔ مثلا اگر وہ اولاد کو نماز کا حکم دے اور خود نا پڑھتا ہو تو اس کا کوئی مثبت اثر نہیں ہوگا بلکہ اس کے منفی اثرات مرتب ہونگے۔ اس دور میں والدین کے حقوق میں یہ ایک اہم امر ہے، تاکہ اولاد کی پرورش میں موجودہ چیلنجز کا سامنا کیا جاسکے۔

نفقہ

سیرت پاک سے والد پر اولاد کا نفقہ فرض ہونا ثابت ہے، جیسا کہ ایک حدیث پاک گزر چکی ہے۔

''عائشة رضي الله عنها قالت هند يا رسول الله إن أبا سفيان رجل شحيح فهل علي جناح أن آخذ من ماله ما يكفيني وبني قال خذي بالمعروف.''(۱۹)

۱۹۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، (س ن)۔ صحیح البخاری، ص:۵۲۱، رقم الحدیث:۲۲۱۱، دار الفکر، بیروت

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ہند عرض گزار ہوئیں: یارسول اللہ! بے شک (میرا خاوند) ابو سفیان ایک بخیل آدمی ہے پس کیا میرے اوپر گناہ ہوگا کہ میں اُن کے مال سے اتنا لے لیا کروں جو میرے اور میری اولاد کے لئے کافی ہو؟ فرمایا کہ دستور کے مطابق لے سکتی ہو۔

اور اسی طرح اولاد کو کنگال چھوڑنے کی بجائے ان کے لئے مال کا چھوڑ جانا زیادہ بہتر ہے۔

''عَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ عَنْ أَبِيهِ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللهِ يَعُودُنِي عَامَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ مِنْ وَجَعٍ اشْتَدَّ بِي فَقُلْتُ إِنِّي قَدْ بَلَغَ بِي مِنَ الْوَجَعِ وَأَنَا ذُو مَالٍ وَلَا يَرِثُنِي إِلَّا ابْنَةٌ أَفَأَتَصَدَّقُ بِثُلُثَيْ مَالِي قَالَ لَا فَقُلْتُ بِالشَّطْرِ فَقَالَ لَا ثُمَّ قَالَ الثُّلُثُ وَالثُّلُثُ كَبِيرٌ أَوْ كَثِيرٌ إِنَّكَ أَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ أَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِنْ أَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُونَ النَّاسَ وَإِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِي بِهَا وَجْهَ اللهِ إِلَّا أُجِرْتَ بِهَا حَتَّى مَا تَجْعَلُ فِي فِي امْرَأَتِكَ.''(۲۰)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ میری عیادت کے لیے تشریف لائے جب کہ میری بیماری نے شدت اختیار کر لی تھی۔ میں عرض گزار ہوا کہ میں سخت بیمار ہوں، میرے پاس کافی مال ہے اور ایک لڑکی کے سوا میرا کوئی وارث نہیں۔ کیا میں اپنا دو تہائی مال خیرات کر دوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ میں عرض گزار ہوا: نصف؟ فرمایا کہ نہیں۔ عرض کی کہ تہائی؟ فرمایا کہ تہائی بھی زیادہ ہے۔ تم اگر اپنے وارثوں کو غنی چھوڑو تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ محتاج رہیں اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ تم رضائے الٰہی کے لیے جو بھی خرچ کروگے اس کا اجر ملے گا یہاں تک کہ جو کچھ اپنی بیوی کے منہ میں ڈالوگے۔

نفقہ میں ایک نہائیت ہی اہم بات یہ ہے کہ والد پر فرض ہے کہ اولاد کو رزق حلال کھلائے اور تمام امور میں حلال کمائی ان پر صرف کرے، کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ حرام پر پلنے والی اولاد نافرمان، بے نمازی و بے دین ہوتی ہے، اس لئے کہ رزق حلال ذوق عبادت اور بھلائی کی طرف راغب کرتا ہے جبکہ حرام اس کے برعکس ہوتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ مسلمان حلال کھاتا ہے اور حرام مسلمان کو کھاتا ہے۔ انسان اولاد کیلئے کماتا ہے اور اگر حرام کمائے اور اس حرام پر اولاد کی تربیت کرے تو وہ اولاد اس کے کسی کام نہیں آتی، نا دنیا میں اور نا ہی آخرت میں، بلکہ اس کیلئے آزمائش بن جاتی ہے۔ عصر حاضر کا یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے جس کا سامنا کافی لوگوں کو

۲۰۔ مسلم، مسلم بن الحجاج القشیری، (۲۰۰۳ء)۔ الصحیح، ص:۸۰۵، رقم الحدیث:۴۱۰۰، دارالفکر، بیروت

ہے۔ اگر ہم حلال کمائی کا خلوص دل سے اہتمام کریں اور تھوڑے پر راضی ہو جائیں تو برکتیں بھی بے شمار ہوں گی اور ان مسائل سے بچ بھی سکیں گے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ محرمات سے بچا جائے، مثلاً سود، جوا، رشوت اور تمام منہی عنہا بیوع جن کا قرآن کریم اور سیرت طیبہ میں تفصیلاً ذکر آیا ہے۔

اولاد کے مابین عدل کرنا

اولاد کے درمیان عدل و انصاف بھی والدین کے حقوق میں شامل ہے۔ سیرت طیبہ سے ہمیں اولاد میں عدل و انصاف بھی ملتا ہے۔ چنانچہ حدیث پاک میں ہے:

''اعدلوا بين أولادكم.''(۲۱)

اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو۔

والد کو چاہیے کہ وہ زندگی کے تمام امور میں اپنی اولاد کے مابین عدل و انصاف کرے اور بیٹا و بیٹی میں بھی فرق روا نہ رکھے۔ تاکہ ہر ایک اپنا حق حاصل کر سکے اور ایک اچھا معاشرہ قائم ہو سکے۔

موجودہ دور میں دیکھا گیا ہے کہ اولاد نافرمان ہو جاتی ہے، یہ ایک بڑا مسئلہ ہے، اس کے اسباب میں ایک یہ بھی ہے کہ والدین اولاد کے مابین عدل و انصاف نہیں کرتے، جس سے بعض اوقات وہ بغاوت پر اتر آتی ہے، اور بسا اوقات نفسیاتی مریض بن جاتی ہے۔ اولاد کی محبت فطرت کا حصہ ہے اور یہ بھی عموماً دیکھا جاتا ہے کہ بندہ کسی ایک کے ساتھ زیادہ محبت کرتا ہے جیسے چھوٹی اولاد یا کسی کی طرف میلان کا زیادہ ہونا۔ مگر سیرت طیبہ کی روشنی میں اولاد کے مابین حقوق میں عدل و انصاف کرنے پہ ترغیب دی گئی ہے تاکہ کسی کی حق تلفی نا ہو اور معاشرتی زندگی میں مسائل پیدا نا ہوں۔

نتائج بحث

اس تحقیق مقالہ میں جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱. رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ اور تعلیمات زندگی گزارنے اور بچوں کی تربیت کرنے کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

۲۱۔ ابو عوانہ، یعقوب بن اسحاق، (۱۹۹۸ء)۔ مستخرج ابی عوانۃ، ج:۳، ص:۴۶۰، رقم الحدیث:۵۶۸۸، دار المعرفہ، بیروت

۲. عرب کا کلچر جو جہالت کا آئینہ تھا، ایسے ماحول میں آپ ﷺ نے اولاد کی تعلیم و تربیت، پرورش پر جو اعلی ترین مثال قائم کی اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔

۳. سیرت النبی ﷺ کی تعلیمات آج بھی ایک بہترین فلاحی معاشرہ قائم کرنے کے لئے اسی قدر اہم ہیں جیسے چودہ سو سال قبل تھیں۔

۴. رسول اللہ ﷺ کا اخلاق مبارکہ اتنا اعلی ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں آپ ﷺ کی سیرت طیبہ سے راہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

۵. رسول اللہ ﷺ کی اتباع و اطاعت میں ہی دنیا و آخرت کی کامیابی پوشیدہ ہے۔

عصر حاضر میں بچوں کے حقوق پورے کرتے ہوئے ان کی بہترین تربیت کے لئے اسوہ رسول ﷺ کی روشنی میں تجاویز

۱. نیشنل سطح پر بچوں کے حقوق پر کانفرنسز کروائی جائیں۔ عوامی سیمینارز منعقد ہوں جن میں سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں بچوں کی بہترین تربیت کے لئے بچوں کے حقوق کو اجاگر کیا جائے۔

۲. سوشل میڈیا و الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے بچوں کے حقوق پر عوامی مہم چلائی جائی۔ بچوں کے حقوق پر تصاویر اور ویڈیوز بنائی جائیں۔ شارٹ موویز، تربیتی ڈرامے وغیرہ بنائے جائیں۔

۳. گورنمنٹ پارلیمنٹ کے ذریعے باقاعدہ چائیلڈ ایکٹ منظور کرے جس میں بچوں کے تمام تر حقوق کو ذکر کیا جائے۔

۴. سکول، کالج اور یونیورسٹیز کے تعلیمی نصاب میں بچوں کے حقوق شامل کئے جائیں تاکہ جب یہ طلباء پریکٹیکل لائف کا حصہ بنیں تو آنے والی نسلوں کے حقوق سے مکمل آگہی رکھتے ہوں۔ اس طرح آنے والی نسلوں کی بہترین تربیت ہو سکے گی۔

۵. بچوں کے حقوق پر ایک مختصر قانونی مسودہ تیار کیا جائے، جس میں چند سطور میں بچوں کے حقوق واضح کئے جائیں۔ یہ مسودہ چارٹس کی صورت میں ہسپتال خصوصاً زچہ بچہ وارڈز میں لگایا جائے۔ اسی طرح جب بچے کی پیدائش ہو تو اسی وقت ہسپتال کا عملہ بچے کے والدین کو یہ مسودہ پمفلٹ کی صورت میں مہیا کرے اور بچے کے والدین کو بچے کے تمام حقوق سے آگاہی دے۔ یہ کام بچے کی نشو نما سے لے کر مکمل تربیت تک کارآمد ثابت ہو گا۔

☆☆☆☆☆

مصادر و مراجع

احمد بن حنبل، (۱۹۹۵ء)۔ مسند احمد بن حنبل، دار الحدیث، القاھرہ

ابو یعلی الموصلی، احمد بن علی بن المثنی، (۱۹۸۴ء)۔ مسند ابی یعلی، دار المامون للتراث، دمشق

ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، (۲۰۰۵ء)۔ السنن، دار الفکر، بیروت

البخاری، محمد بن اسماعیل، (۱۹۸۹ء)۔ الادب المفرد، دار البشائر الاسلامیہ، بیروت

الطبرانی، ابو القاسم سلیمان بن احمد، (س ن)۔ المعجم الاوسط، دار الحرمین، القاھرہ

ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، (۱۹۹۳ء)۔ الزھد، دار المشکاۃ، حلوان

ابن حبان، محمد بن حبان بن احمد، (۱۹۹۳ء)۔ صحیح ابن حبان، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت

البخاری، محمد بن اسماعیل، (س ن)۔ صحیح البخاری، دار الفکر، بیروت

ابن ماجہ، محمد بن یزید، (۲۰۰۳ء)۔ السنن، دار الفکر، بیروت

مسلم، مسلم بن الحجاج القشیری، (۲۰۰۳ء)۔ الصحیح، دار الفکر، بیروت

النسائي، ابو عبد الرحمان احمد بن شعیب، (۲۰۰۵ء)۔ السنن للنسائی، دار الفکر، بیروت

ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، (۲۰۰۵ء)۔ السنن، دار الفکر، بیروت الدارمی

عبد اللہ بن عبد الرحمان، (۱۹۸۶ء)۔ سنن الدارمی، دار الکتاب العربی، بیروت

ابن ابی شیبہ، عبد اللہ بن محمد، (۱۹۸۸ء)۔ المصنف فی الاحادیث والاثار، مکتبہ الرشد، الریاض

البخاری، محمد بن اسماعیل، (س ن)۔ صحیح البخاری، دار الفکر، بیروت

الدارمی، عبد اللہ بن عبد الرحمان، (۱۹۸۶ء)۔ سنن الدارمی، دار الکتاب العربی، بیروت

سیوطی، جلال الدین، (س ن)۔ الجامع الصغیر، دار الکتب العلمیۃ، بیروت لبنان

البخاری، محمد بن اسماعیل، (س ن)۔ صحیح البخاری، دار الفکر، بیروت

مسلم، مسلم بن الحجاج القشیری، (۲۰۰۳ء)۔ الصحیح، دار الفکر، بیروت

ابو عوانہ، یعقوب بن اسحاق، (۱۹۹۸ء)۔ مستخرج ابی عوانۃ، دار المعرفہ، بیروت

خواجہ باقی باللہ اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے باہمی تعلقات

(ایک تاریخی جائزہ)

Relationship between Khawaja Baqi Billah and Sheikh Abdul Haq Muhaddith Dehlavi (An Historical Study)

☆ نادیہ عالم

☆☆ رابعہ نسرین

ABSTRACT

Khawaja Muhammad Baqi and Sheikh Abdul Haq Muhaddith Dehlavi are among the prominent Muslim scholars of New Dehli who worked for the intellectual and spiritual reforms of the Muslims in the beginning of 10th century AD. The former one, Khawaja Muhammad Baqi introduced the Naqshbandi order in Indian subcontinent and successfully reformed the society through his simplicity and sincerity. The other scholar, Sheikh Abdul Haq Muhaddith Dehlavi holds an important place in the intellectual history of the subcontinent due to his scholastic, pedagogic and compilatory achievements. These two scholars stayed together in Delhi for a few years. The proximity of their relationship, and the mutual love and respect that they enjoyed is evident through the letters of Sheikh Muhaddith and many other evidences. However, there is no explicit mention of their in-person meetings or the undertaking of Sheikh Muhaddith's bayʿah (oath of allegiance) with Khawaja Muhammad Baqi. This article gives a brief overview of the relationship between these two personalities in the light of the writings of Sheikh Muhaddith Dehlai.

Keywords: Sheikh Abdul Haq, Khawjа Baqi Billah, Relation, Islam

خواجہ باقی باللہ قدس سرہ(م۱۰۱۲ھ) گیارہویں صدی ہجری کے آغاز میں ہندوستان تشریف لائے اور یہاں طریقہ نقشبندیہ کو رواج دیا۔انہوں نے اپنی سادگی، خلوص اور پیہم کوشش سے ایک اصلاحی روحانی انقلاب کی بنیاد رکھی۔ ان کی پرکشش شخصیت سے متاثر ہو کر علماء، صلحاء اور عوام کے علاوہ طبقہ امراء کی بہت سی اہم شخصیات بھی ان کے حلقہ بگوش ہوئیں۔ انہوں نے بہت سے امراء کی تربیت فرمائی اور اکبری عہد کے اسلام مخالف اور منفی اثرات کا زور توڑا اور اس کے لیے ایک

☆ پی۔ایچ۔ڈی اسکالر، یونیورسٹی آف لاہور

☆☆ سکول ٹیچر، گورنمنٹ گرلز ہائی سکول، لیہ

مستحکم محاذ قائم فرمایا۔ ان ہی کے حلقۂ اثر سے تعلق رکھنے والے شیخ احمد فاروقی سرہندیؒ نے بالآخر تجدید واحیائے دین کی تاریخی ذمہ داری نبھاتے ہوئے مجدد الف ثانی کا عظیم الشان لقب پایا۔ اس اعتبار سے مجددی احیائی تحریک کے پیچھے بھی خواجہ باقی باللہؒ کا علمی، عملی اور روحانی فیض بہر حال موجود ہے۔

اسی زمانے کی ایک اور عہد ساز شخصیت شیخ عبد الحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) کی ہے۔ جنہیں اپنے علمی، تدریسی اور تالیفی کارناموں کی وجہ سے ہندوستان کی علمی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ شیخ محدثؒ نے ۱۰۰۰ھ ہجری میں حجاز مقدس سے واپسی پر دہلی میں سکونت اختیار کی اور ایک عظیم اسلامی درس گاہ کی بنیاد ڈالی۔ یہ دونوں بزرگ ہستیاں تقریباً پانچ، چھ سال تک دہلی میں مقیم رہیں۔ شیخ محدثؒ کے مکتوبات اور کئی دیگر شواہد سے دونوں کے قریبی تعلقات اور باہمی محبت و احترام کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ اکثر ذکر کیا جاتا ہے کہ شیخ محدثؒ حضرت خواجہ سے نقشبندی سلسلہ میں بیعت تھے۔ کہیں ان کے مرید ہونے کا ہی نہیں بلکہ خلافت ملنے کا ذکر بھی ملتا ہے اور کئی کتب میں نقشبندی علماء اور شیوخ کی خدمات میں شیخ محدثؒ کو حضرت امام ربانی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

اس بات کو اگر شیخ محدثؒ کی اپنی تحاریر کی روشنی میں دیکھا جائے تو شیخ محدثؒ نے اپنی کتب میں کئی جگہ اور خصوصاً اخبار الاخیار میں اپنے بارے میں تحریر فرمایا ہے۔ اپنے آبأو اجداد اور اپنے شیوخ کا تفصیلی اور تاریخ کے ساتھ تعارف کروایا ہے۔ ان تصانیف میں انہوں نے خود کو ہمیشہ قادری سلسلہ سے منسلک لکھا اور اپنی اس نسبت پر بہت خوشی اور فخر کا اظہار فرمایا ہے (جیسا کہ آئندہ تفصیل سے ذکر ہو گا)۔ انہوں نے ان تصانیف میں اور خواجہ باقی باللہؒ کے نام اپنے مکتوبات میں اپنی حضرت خواجہؒ سے ارادت کا ذکر نہیں فرمایا۔ شیخ محدث دہلویؒ کے خواجہ باقی باللہؒ کے نام چند مکتوبات بھی ملتے ہیں۔ جن سے ان دونوں محترم بزرگوں کے باہمی تعلقات اور ان کی نوعیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ زیر نظر مقالہ میں شیخ محدثؒ کے مکتوبات اور دیگر مشہور تصانیف کی روشنی میں ان کے باہمی تعلقات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ خصوصاً اس پہلو کا کہ کیا شیخ محدث نے قادریہ سلسلہ سے منسلک ہونے کے بعد بھی نقشبندیہ سلسلے کو اپنایا تھا؟ اور اگر بیعت کی بھی تھی تو اس کی نوعیت کیا تھی؟ ان سوالات کے جوابات سے قبل دونوں عظیم شخصیات کا بالترتیب مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

حضرت خواجہ باقی باللہؒ

عہدِ اکبر (۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ء-۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء) میں خواجہ ابو المؤید رضی الدین محمد باقیؒ (۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء-۱۰۱۲ھ / ۱۶۰۳ء) ہندوستان تشریف لائے اور یہاں کی تاریخ میں ہمہ جہتی اثرات مرتب فرمائے۔ حضرت خواجہؒ گیارہویں صدی

ہجری کے نامور عالم، صوفی، مصنف اور شاعر تھے۔ اسمِ گرامی رضی الدین محمد باقی تھا، انہیں خواجہ بیرنگ بھی کہا جاتا ہے مگر دنیائے تصوف میں خواجہ محمد باقی باللہؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔ والد قاضی عبد السلام، ایک متبحر عالم، با عمل بزرگ اور صاحب فضل وکمال تھے۔ معروف قول کے مطابق ان کی پیدائش ۵-ذوالحجہ ۹۷۱ھ /۱۵-جولائی ۱۵۶۳ء کو کابل میں ہوئی۔ آٹھ سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا۔ بچپن سے ہی بزرگی وہمت کے آثار نمایاں تھے۔ علومِ رسمیہ کے لیے مجمع فضائل مولانا محمد صادق حلوائیؒ (۱) کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔ سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت خواجہ محمد مقتدی امکنگیؒ (۲) سے بیعت کی۔ انھوں نے حضرت خواجہؒ کو ہندوستان جاکر سلسلہ کی اشاعت کا حکم دیا۔ چنانچہ ۱۰۰۴ھ کے اواخر یا ۱۰۰۵ھ کے اوائل میں ہندوستان آئے۔ (۳) ہندوستان آمد کے بعد حضرت خواجہؒ تقریباً ایک سال لاہور مقیم رہے (۴)۔ پھر دہلی تشریف لے گئے اور دریائے جمنا کے کنارے قلعہ فیروز آباد میں اپنی خانقاہ تعمیر کی۔

خواجہ باقی باللہ کی خانقاہ ۱۰۰۸ھ میں دہلی میں مقبول معروف ہوچکی تھی۔ کیونکہ اسی سال شیخ احمد سرہندیؒ (امام ربانیؒ) جب حج کرنے کے ارادے سے سرہند سے دہلی تشریف لائے تو خواجہ باقی باللہؒ کا ذکر سن کر ان سے ملاقات کرنے گئے اور پھر بیعت کرلی۔ ہندوستان میں سلسلہ نقشبندیہ کو فروغ دینے والے پہلے بزرگ حضرت خواجہ باقی باللہؒ ہی ہیں۔ حضرت خواجہؒ کی ہندوستان تشریف آوری کے پانچ چھ سال کے اندر ہی روحانی حلقوں میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا تھا۔ علماء، مشائخ اور عامۃ المسلمین کے علاوہ امرائے سلطنت بھی ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے لگے۔ چنانچہ حضرت خواجہؒ کے متعلق جو نامکمل

---

(۱) مولانا محمد صادق حلوائی سمرقندیؒ (م ۹۸۱ھ) بڑے عالم، فاضل اور خوش گو شاعر تھے۔ ۹۷۸ھ میں حج سے واپسی پر حاکمِ کابل مرزا حکیم بن ہمایوں کی درخواست پر کابل میں کچھ عرصہ رہائش پذیر ہوئے اور درس دیا۔ اسی زمانہ میں خواجہ باقی باللہ بھی ان سے متعارف ہوئے اور تعلیم حاصل کی۔

(۲) محمد مقتدیٰ المعروف خواجگی (منسوب بہ خواجہ) انہیں خواجہ امکنگی حضرت بھی کہا جاتا ہے۔ سلسلہ نقشبندیہ کے معتبر اکابرین میں سے ایک ہیں۔ بخارا کے گاؤں امکنہ میں خواجہ محمد درویشؒ کے ہاں ۹۱۸ھ / ۱۵۱۲ء کو پیدا ہوئے۔ والد سے ہی خرقہ خلافت ملا اور ان کے جانشین ہوئے۔ شریعت کے عامل اور طریقہ نقشبندیہ کے اصول ضوابط کے سخت پابند تھے۔ تقریباً نوے سال کی عمر میں ۲۲-شعبان ۱۰۰۸ھ / ۱۶۰۰ء وصال پایا۔ مزار شریف بخارا سے تین میل دور امکنہ میں ہے۔

(۳) خان، غلام مصطفی (ڈاکٹر)۔ باقیات باقی۔ کراچی: گابا ایجوکیشنل بکس۔ س۔ن۔ ص ۲۰۔

(۴) کشمی، محمد ہاشم۔ زبدۃ المقامات، ص ۴۱۔

تحریری مواد ملتا ہے، اس کے مطابق بخشی الملک شیخ فرید، سپہ سالار دکن اور امیر الامراء مرزا عبدالرحیم خان خاناں، حاکم پنجاب مرزا قلیج خان اندجانی، صدر الصدور صدر جہاں پہانی، اکبر کے دودھ شریک خان اعظم مرزا عزیز کوکہ اور ابوالفضل کے بہنوئی خواجہ حسام الدینؒ جیسے امراء حضرت خواجہؒ کے نیاز مندوں میں شامل تھے۔

انہوں نے طبقہ امراء کی اصلاح کی طرف توجہ فرمائی۔ پھر اکبری دور کے غیر اسلامی منفی اثرات کو زائل کرنے کے لیے ایک خاص حکمت عملی کے تحت ان راسخ العقیدہ امراء، علماء اور صوفیاء کرام کی ایک جماعت تیار کی اور دربار اکبری کے مذہبی رجحانات کے خلاف ایک مستحکم محاذ قائم کیا۔ ان کاوشوں کا براہ راست فائدہ شیخ احمد سرہندی حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحریک احیائے اسلام کو پہنچا اور عہد جہانگیری میں اس کارِ تجدید کا واضح نتیجہ سامنے آگیا۔ خواجہ باقی باللہؒ نے صرف چالیس سال عمر پائی اور ۲۵ -جمادی الثانی ۱۰۱۲ ھ /۲۹ -نومبر ۱۶۰۳ء کو بعد نماز عصر انتقال فرمایا۔ دو خورد سالہ صاحبزادے خواجہ عبید اللہ (م ۱۰۷۳ھ)[۱] اور خواجہ عبد اللہ (م ۱۰۷۵ھ) [۲] چھوڑے۔ مزار شریف دہلی میں واقع فیروز شاہ قبرستان میں صحن

---

(۱) خواجہ کلاں خواجہ عبید اللہ یکم ربیع الاول ۱۰۱۰ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ خواجہ عبید اللہ احرار (م ۸۹۶ھ) کے نام پر ان کا نام رکھا گیا۔ حضرت امام ربانیؒ اور خواجہ حسام الدین کی تعلیم و تربیت سے بہرہ افروز ہوئے۔ ۶۳ سال کی عمر میں آٹھ جمادی الثانی ۱۰۷۳ھ میں دہلی میں وفات پائی۔ والد کے مزار کے قریب دہلی کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ اولاد میں صرف ایک بیٹی تھیں ان کا نکاح حضرت امام ربانیؒ کے فرزند خواجہ محمد یحیٰ سے ہوا۔ (محمد ہاشم کشمی، زبدۃ المقامات، ص ۴۵۳) تحریر و تالیف کا عمدہ ذوق تھا۔ مکتوبات کے علاوہ " احوال صحابہ و تابعین و تبع تابعین و مشائخ دین، تذکرہ مشائخ اور مبلغ الرجال" کا ذکر ملتا ہے۔ رانجھا: محمد نذیر، تاریخ و تذکرہ خانقاہ سرہند شریف، لاہور: جمعیت پبلیکیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۱۶۵-۱۶۹۔

(۲) خواجہ عبد اللہ ۶-رجب ۱۰۱۰ھ کو پیدا ہوئے۔ والد سے مشابہ تھے۔ بھائی کے ساتھ تعلیم و تربیت سے بہرہ مند ہوئے۔ تقریباً ۶۵ سال عمر پائی۔ سنِ وصال ۲۵ جمادی الاول ۱۰۷۴ھ یا ۱۰۷۵ھ کہی جاتی ہے۔ والد گرامی کے مزار میں بالکل ساتھ مدفون ہوئے۔ شعر کہتے تھے، شیخ احمد سرہندی امام ربانی کی نسبت سے "احمدیؔ" تخلص کرتے تھے۔ (محمد ہاشم کشمی، زبدۃ المقامات، ص ۱۰۸) تصانیف میں "بیان و ملفوظات خواجہ خورد، پردہ بر انداخت و بردہ کہ شاخت، پرتو عشق، رباعیات و شرح رباعیات، رسالہ خواجہ خورد، رسالہ سماع رسالہ سید، رسالہ فوئح رسالہ تسویہ" ہیں۔ ایضاً، ص ۱۷۰-۱۷۷۔

مسجد سے متصل ہے۔حضرت خواجہؒ کی تصنیفات میں فارسی نثر میں چند رسائل،(۱)ملفوظات،مکتوبات(رقعات)،(۲)کچھ فارسی کلام،مثنویات، رباعیات اور قطعات ملتے ہیں۔(۳) تخلص باقیؔ ہے۔ انؒ کا سب کلام ''کلیات باقی باللہ''میں جمع ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ(م۱۰۵۲ھ)

دسویں صدی ہجری میں ہندوستان میں حضرت شیخ ابوالمجد عبدالحق بن سیف الدین محدث دہلویؒ بخاری ولد شیخ سیف الدین (۹۵۸ھ۔۱۰۵۲ھ / ۱۵۵۱ء-۱۶۴۲ء) کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ خصوصاً ہندوستان میں علم حدیث کی ترویج واشاعت میں انؒ کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔(۴) آباؤ اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ اجداد میں سے آغا محمد ترک عہدِ علاؤالدین خلجی (۶۹۵ھ-۷۱۵ھ) میں ہندوستان تشریف لائے۔ شیخ محدثؒ اسلام شاہ سوری (۹۵۲ھ-۹۶۰ھ) کے عہد میں محرم ۹۵۸ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ شیخ محدثؒ بے مثال حافظہ کے مالک تھے۔ پڑھنے پڑھانے سے بہت زیادہ شغف تھا ۔اٹھارہ سال کی عمر میں وطن سے تمام مروجہ علومِ عقلیہ ونقلیہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ماوراۓ النہر کے مشہور علماۓ سے اکتسابِ علم وفیض کیا۔

سلسلہ قادریہ سے شیخ محدثؒ کا قلبی تعلق تھا۔ہندوستان کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر شیخ محدث ۹۹۶ھ میں اڑتیس سال کی عمر میں حجاز تشریف لے گئے۔ وہاں کے جید علماۓ سے علمِ حدیث کی تکمیل کی اور خصوصاًحضرت عبدالوہاب متقی

---

(۱)حضرت خواجہ کے رسائل میں ۱-رسالہ در بیان حقیقت نماز،۲-رسالہ صورت نماز،۳-مختصر بیان توحید،۴-رسالہ در معنی أعوذ باللہ،۵-رسالہ رسالہ بسم اللہ و سورۂ فاتحہ،۶-بیان سورۂ والشمس،۷-بیان سورۂ اخلاص،۸-بیان سورۂ خلق،۹-بیان سورۂ الناس،۱۰-بیان آیۃ وھو معکم،۱۱-ترجمہ دعائے قنوت،۱۲-رسالہ ناتمام در علم سلوک،۱۳-رسالہ سلسلۃ الاحرار شامل ہیں۔

(۲)ان کے ستاسی مکتوبات کا مرتب مجموعہ دستیاب ہے۔یہ رقعات کے عنوان سے جمع کئے گئے اور ان کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

(۳)انؒ کے فارسی کلام میں ۱-مثنوی قبل از زمان درویشی (تعداد اشعار۱۳۸)۲-مثنوی گنج نقر(تعداد اشعار۷۲۵) ۳-ساقی نامہ(تعداد اشعار ۱۱۱)۴-سلسلہ نامہ پیران طریقت(تعداد اشعار ۲۲)۵-تاریخ تولد دو پسران خود(تعداد اشعار ۹۵) ۶-تاریخ تولد خواجہ محمد عبداللہ(تعداد اشعار ۸)اور چند دیگر رباعیات کے علاوہ آپؒ کی ۴۶-رباعیات کی فارسی شرح شامل ہیں۔

(۴)لاہوری،غلام سرور(قادری)،خزینۃ الاصفیاۓ،لاہور:مکتبہ نبویہ۔۱/۲۷۔؛مکتوبات عبدالحق محدث دہلوی۔کراچی:مدینہ پبلشنگ کمپنی۔

شاذلیؒ(۱) سے بیعت کا شرف حاصل کیا اوران سے اخذِ علم و فیض کیا۔ ۱۰۰۰ھ میں شیخ عبد الوہاب متقیؒ کے حکم پر ہندوستان واپس آئے اور باقی تمام عمر تصنیف و تالیف، درس و تدریس اور رفع زندقہ و الحاد میں بسر کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اکبر کے غیر متعین مذہبی افکار نے دین الٰہی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ملک کا مذہبی ماحول خراب ہو چکا تھا۔ شریعت و سنت سے بے اعتنائی عام تھی۔ خصوصاً شاہی دربار میں اسلامی شعائر کی کھلم کھلا تضحیک ہو رہی تھی۔

حجاز مقدس سے واپسی شیخ محدثؒ نے دہلی میں مدرسہ بنایا اور مسند درس و ارشاد بچھائی۔ شمالی ہندوستان میں اس عہد کا یہ پہلا مدرسہ تھا جہاں سے شریعت و سنت کی زور دار آواز بلند ہوئی۔ شیخ محدثؒ کا مدرسہ دہلی ہی میں نہیں سارے شمالی ہند میں امتیازی شان رکھتا تھا۔ اس مدرسہ کا نصاب تعلیم دوسری درسگاہوں سے بالکل مختلف تھا۔ یہاں قرآن و حدیث کو تمام علوم دینی کا مرکزی نقطہ قرار دے کر تعلیم دی جاتی تھی۔ شیخ محدثؒ نے اپنی طویل اور بابرکت زندگی میں بدلتے حالات کا بغور مطالعہ بھی کیا تھا۔ انہوں نے عہدِ اکبری سے لے کر اپنے عہد تک کے دینی و سیاسی حالات و واقعات کا جائزہ لے کر بڑے غور و فکر کے بعد دینی نصابِ تعلیم میں قرآن و حدیث کو مقدم قرار دیا۔

علمِ حدیث کو ہندوستان میں رواج دیا اور شریعت کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ ان کے نزدیک وہ علم علم کہلانے کے قابل ہی نہیں جو تقویتِ دین و ملت کا باعث نہ ہو۔ شیخ محدثؒ کی عمر کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف میں گزرا۔ بہت سے نامور مورخین انہیں برصغیر میں اسلامی ادب کا "سرخیل" مانتے ہیں۔ مکتوبات اور علاوہ تصانیف کی تعداد ساٹھ ہے۔ تقریباً ہر فن پر ان کی تصنیف موجود ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شیخ محدثؒ کی تصانیف کو فن و موضوع کے اعتبار سے سولہ (۱۶) علیحدہ حصوں "تفسیر، تصوف، سیر، تجوید، اخلاق، نحو، حدیث، اعمال، ذاتی حالات، عقائد، فلسفہ و منطق، خطبات، فقہ، تاریخ، مکاتیب اور

---

(۱) سید شیخ عبد الوہاب المتقی الشاذلیؒ (۹۰۲ھ-۱۰۰۱ھ) مندو (صدر مقام مالوہ) میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد شیخ ولی اللہ مندوی مندو کے اکابرین میں سے تھے۔ کم عمری میں ہی طلب حق میں حصول علم اور سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ بیس سال کی عمر میں گجرات، دکن اور سراندیپ سے ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچے۔ حضرت شیخ علی متقیؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور ان سے علوم ظاہری و باطنی حاصل کئے۔ ۱۲ سال حیاتِ مرشد میں اور ۲۸ سال ان کے بعد مکہ معظمہ میں رہے اور ان چالیس سالوں میں ایک بار بھی حج فوت نہیں ہوا۔ تمام عمر درس و تدریس، ارشاد و ہدایت، اور ریاضت و مجاہدہ میں گزاری۔ ان کے تبحر علمی کا اعتراف حجاز، یمن، مصر اور شام کے علماء کرتے تھے۔ پچاس سال کی عمر میں شادی کی۔ مزار شریف مکہ معظمہ میں ہے۔

اشعار“‘ میں تقسیم کیاہے۔ پھر ان تمام علوم کے ذیل میں ان کی ساٹھ کتب کا تفصیلی تعارف بھی کروایاہے۔(۱) اخبار الاخیار اور مدارج النبوت مشہور ترین کتب ہیں۔ شیخ محدثؒ نے کئی مکتوبات بھی تحریر فرمائے۔ ان میں سے ارسٹھ مکتوبات کا ایک مجموعہ ان کی زندگی میں ترتیب پا چکا تھا۔ اچھے شاعر بھی تھے اور حقی تخلص کرتے تھے۔ متعدد غزلوں، قصیدوں، قطعوں، رباعیوں اور مثنویوں یعنی تمام اصناف سخن پر مشتمل ان کا مجموعہ کلام ے ”حسن الاشعار“ بھی مرتب ہوا تھا۔(۲) شیخ محدثؒ کے تین صاحبزادے شیخ نور الحق مشرقی (م ۱۰۷۳ھ)(۳)

شیخ علی محمد (۴) اور شیخ محمد ہاشم (۵) تھے۔ تینوں ہی صاحب علم و فضل ہوئے۔ شیخ محدث نے ۲۱-ربیع الاول ۱۰۵۲ھ میں سال کی عمر میں بعہدِ شاہجہاں وفات پائی۔ مزار دہلی میں حوضِ شمسی کے شمالی جانب نئی آبادی اسلام پور مہرولی میں ہے۔

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیں نظامی، خلیق احمد، حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی، حصہ دوم (تالیفات)، ص ۱۵۴-۲۱۴۔

(۲) شیخ، محمد اکرام۔ رودِ کوثر۔ لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ ۲۰۱۵ء۔ ص ۳۸۷۔

(۳) شیخ نور الحق مشرقی (۹۸۳ھ-۱۰۷۳ھ) فقیہ، محدث، جامع کمالات صوری و معنوی اور فاضل متبحر عالم تھے۔ والد کے شاگرد و مرید تھے۔ محمد اقبال مجددی نے ان کو خواجہ باقی باللہ کے خلفاء میں بھی شمار کیا ہے (مجددی، محمد اقبال۔ تذکرہ علماء و مشائخ پاکستان و ہند۔ ۲/۷۰۸) شاہجہان نے انہیں اکبر آباد کا قاضی مقرر کیا تھا۔ مگر والد گرامی کی وفات کے بعد ان کی مسند ارشاد کو سنبھال لیا۔ بکثرت شروح وحاشیہ تحریر فرمائے۔ مثلاً فارسی میں ”تیسیر القاری فی شرح صحیح البخاری“ اور ”شرح صحیح مسلم، شرح شمائل ترمذی، شرح عضدی، شرح مطالع، شرح قران السعدین، حاشیہ شرح جامی اور شرح ھدایہ“۔ مشرقی تخلص کے ساتھ اچھے پر گو شاعر بھی تھے۔ دیوان پانچ ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ ایک مثنوی بنام ” مثنوی تحفۃ العراقین “ تھی۔ تاریخ پر ان کی کتاب ”زبدۃ التاریخ“ اہم ہے۔ شادی نواب مرتضیٰ خان شیخ فرید کے گھرانے میں ہوئی تھی۔ ایک ہی فرزند بنام شیخ نور اللہ تھے۔ نوے سال کی عمر میں ۹-شوال ۱۰۷۳ھ میں دہلی میں وفات پائی۔ والد کے احاطہ مزار میں مدفون ہیں۔: نظامی، خلیق احمد، حیات شیخ عبد الحق۔ ص ۲۵۱-۲۶۱۔

(۴) شیخ علی محمد جید عالم اور مرتاض بزرگ تھے۔ والد گرامی سے ہی تحصیل علم کیا۔ ابو المفاخر نامی ایک ہی فرزند تھے۔ تین کتب ۱-خزائن الدرر (عربی، فارسی اور ترکی لغت) ۲-رسالہ احوال پنج پیران چشت: حالات خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ قطب الدینؒ، بابا فریدؒ، محبوب الٰہیؒ، حضرت چراغ دہلیؒ ۳-نجات المریدین (احوال حضرت غوث اعظمؒ) تصنیف فرمائیں۔

(۵) شیخ محمد ہاشم نے بھی والد گرامی سے علم حاصل کیا۔ بہت ذہین، فطین اور عالم و فاضل تھے۔ خصوصاً علم حدیث میں ممتاز تھے۔ شیخ محدث قول (در رسالہ فہرس التوالیف) سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھی محدث تھے۔ ان کے ایک ہی فرزند محمد عاصم کا ذکر ملتا ہے۔

شیخ محدثؒ کی حضرت عبد القادر جیلانی علیہ الرحمہ سے بے پناہ عقیدت

حضرت غوث الاعظم شیخ محی الدین عبد القادر جیلانیؒ کی ذات شیخ محدثؒ کی عقیدت و ارادت کا مرکز تھی۔ اپنی تصانیف میں جس طرح وہ حضرت غوث الاعظمؒ کا ذکر کرتے ہیں وہ ان کے جذبات و عقیدت کا آئینہ دار ہے۔ شیخ عبد القادر جیلانیؒ کا ذکر آتے ہی شیخ محدثؒ پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ ان کی بے پناہ محبت میں وارفتہ ہو جاتے ہیں۔ ''اخبار الاخیار'' میں انہوں نے صرف ہندوستان کے علماء و مشائخ کا ذکر کیا ہے لیکن اپنی بے پناہ عقیدت کی بنا پر کتاب کا آغاز حضرت غوث الاعظمؒ کے تذکرہ سے کیا اور ان کے بہت سے اوصاف بیان فرمائے۔ آخر کتاب میں بھی ان کے متعلق لکھتے ہیں:

''اگر دیگران قطب اند او قطب الاقطاب ست و اگر ایشان سلاطین او سلطان السلاطین محی الدین کہ دین اسلام زندہ گردانید۔۔۔ مرا جز عنایت او کس نیست و بغیر لطف او فریادرس نے''(۱)

(اگر دوسرے قطب ہیں تو یہ قطب الاقطاب ہیں اگر دوسرے سلطان ہیں تو یہ سلطانوں کے بھی سلطان ہیں۔ دین کے زندہ فرمانے والے جنہوں نے اسلام کو دوبارہ زندہ کیا اوور طریقہ کفر کو جڑ سے اکھاڑ دیا۔۔۔ شیخ کے مقام کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جائے کہ اللہ تعالیٰ جو حی و قیوم ہے اس نے ہمیں اسلام عطا فرمایا اور حضرت غوث الثقلینؒ نے اس کو دوبارہ زندہ کیا۔ غوث الثقلین کا مطلب ہی یہ ہے کہ جنات اور انسان سب ان کی پناہ میں آتے ہیں۔ چنانچہ میں بے کس و محتاج بھی انہی کی پناہ کا طالب اور انہی کے دربار کا غلام ہوں۔ مجھ پر ان کی عنایت و کرم ہے اور ان کی مہربانیوں کے سوا اور کوئی فریادرس نہیں)

اپنے ایک مکتوب میں اپنے فرزند شیخ نور الحق مشرقیؒ کو لکھتے ہیں:

''مرجع و ماوائے ما فقیراں ہمہ جناب سید کائنات و خلاصۂ موجودات است علیہ افضل الصلوات و اکمل التحیات بوسیلہ حضرت پیر دستگیر غریب نواز شکستہ پرور غوث الثقلین شیخ محیی الدین عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ'' (۲)

---

(۱) دہلوی، عبد الحق محدث۔ اخبار الاخیار مع مکتوبات، لاہور: نوریہ رضویہ پبلشنگ کمپنی، ۱۴۳۶ھ، ص ۳۱۵

(۲) دہلوی، عبد الحق (محدث)۔ المکاتیب والرسائل، ص ۲۹۸۔

"(ہم بے کسوں کا ٹھکانہ اور پناہ گاہ پیر دستگیر، غریب نواز، شکستہ پرور، دونوں جہان کے فریادرس اور دین کو زندہ کرنے والے حضرت عبد القادر جیلانیؒ کے ذریعہ سے تمام جہانوں کے سردار اور مخلوقات کا خلاصہ حضور پرنور ﷺ ہیں (ان پر اللہ تعالیٰ کے بہترین درود اور مکمل ترین سلام ہوں)"

حجاز مقدس سے شیخ محدث بغداد شریف جانا چاہتے تھے۔ ہندوستان کے حالات سے اتنے دل برداشتہ تھے کہ ہندوستان واپسی کا ارادہ نہ تھا۔ مگر جب شیخ نے وطن واپسی کا ارشاد فرمایا۔ تو پہلے بغداد شریف جانے کی اجازت طلب فرمائی کہ ادھر سے ہو کر واپس جاؤں گا۔ مگر ان کی حضرت غوث اعظ سے وابستگی و محبت سے بخوبی آگاہ شیخ عبد الوہابؒ کو علم تھا کہ اگر یہ وہاں پہنچے تو پھر ہندوستان نہیں جا پائیں گے۔ اس لیے بغداد جانے کی اجازت نہ دی اور فرمایا کہ سیدھا ہندوستان جاؤ، فرمایا:

"شمارا بعد ازین گنجائش ندارد کہ اینجا۔۔۔ قصد اتباع ایشان بکنید و بر فرمودۂ ایشان روید" (۱)

(اس کے بعد آپ کو یہاں رہنے یا اصلی وطن جانے کے علاوہ دوسری جگہ (بغداد شریف) جانے کی اجازت نہیں۔۔۔ حضور غوث اعظمؓ آپ کے ساتھ ہیں جس جگہ بھی آپ رہیں۔ آپ ان سے محبت و اعتقاد اور ان کی جانب توجہ رکھیں، ان کی پیروی کی کوشش کریں اور ان کے حکم پر چلیں)

جب "فتوح الغیب" کی شرح لکھی تو اپنی حالت کے بارے میں اپنے بیٹے شیخ نور الحق دہلویؒ کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"ز نسیم جان فدایت دل مردہ زندہ گردد
زکدام باغے ای گل کہ چنین خوش است بویت حق جل وعلا
دماغ وقت و شامۂ حال ایشان را بہ نسائم عنایت و شمایم کرامت و
روائح کرم خود تازہ و معطر دارد بمطالعہ کتب فتوح الغیب کہ کلام
کرامت نظام حضرت غوث الثقلین است رضی اللہ عنہ و این
حقیر بسعادت شرح آن توفیق یافتہ است وقت خوشی
داشت"(۲)

---

(۱) نظامی، خلیق احمد۔ حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی، ص ۱۱۷ (بحوالہ: زاد المتقین قلمی)

(۲) دہلوی، عبد الحق محدث۔ اخبار الاخیار مع مکتوبات۔ ۶۷ / ۳۸۹۔

(اس ہوا پر قربان ہو جاؤں کہ جس سے میرا مردہ دل زندہ ہو گیا ہے۔اے پھول!وہ باغ کہاں ہے جس کی خوشبو سے تو مہک رہا ہے۔اللہ تعالیٰ نے دماغ وقت اور شامہ حال کو اپنی عنایت کی ہواؤں اور کرم کی خوشبوؤں سے کتاب فتوح الغیب کے مطالعہ سے معطر فرمادیا ہے۔جو شیخ عبد القادر جیلانی محبوب سبحانیؒ کا باکرامت کلام ہے اور اس فقیر کو اس کی شرح لکھنے کا موقع ملا ہے۔جس کی مجھے بے حد خوشی ہے)

مکتوب نمبر ۶۴ میں حضور غوث الاعظم کے بارے میں بزرگوں کی جانب سے خود شیخ محدثؒ کو جو کہا گیا تھا اسے وہ اپنے فرزند شیخ نور الحق کو لکھ کر بھیجتے ہیں اور انہیں اس بات کی تلقین فرماتے ہیں کہ:

"شما بجناب حضرت غوث اعظم مروجہ باشید ہمہ خیر خواہد شد" (۱) (آپ(ہمیشہ) حضرت غوث اعظمؒ کے حضور متوجہ رہیں،پھر سب خیر ہو جائے گی)

آپؒ اپنے نام کے ساتھ صرف قادریہ سلسلہ سے ہی اپنی نسبت کو ظاہر کرتے ہیں اور ہمیشہ اپنا تعارف یوں کرواتے ہیں:

"عبدالحق بن سیف الدین الدہلوی وطناً، البخاری اصلاً، الترکی نسباً، الحنفی مذہباً الصوفی مشرباً، القادری طریقہ" (۲)

شیخ محدث دہلویؒ کے شیوخ طریقت اور اہم موئثر روحانی شخصیات

والد گرامی شیخ سیف الدین سیفی بخاریؒ (۹۹۰ھ): شیخ محدثؒ کی ابتدائی روحانی تربیت ان کے والد گرامی نے خود کی تھی۔ (۳) شیخ سیف الدینؒ شیخ امان اللہ پانی پتی قادریؒ کے مرید تھے۔ (۴) شیخ محدثؒ نے اخبار الاخیار میں اپنے والد محترم کے کئی واقعات درج فرمائے ہیں۔اپنے ابتدائی حالات کے ذیل میں والد گرامی سے متعلق لکھتے ہیں:۔

---

(۱) دہلوی،عبد الحق (محدث)۔المکاتیب والرسائل،ص ۳۸۲۔

(۲) نظامی،خلیق احمد۔حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی۔ص ۱۴۰۔

(۳) برکت علی (منشی)،مرآۃ الحقائق حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی۔ریاست رام پور: مطبع عزیزی،۱۳۲۲ھ،ص ۱۰۔ دہلوی،عبد الحق (شیخ) مکتوبات شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ۔ص ۲۸۶۔

(۴) برکت علی (منشی)۔مرآۃ الحقائق۔ص ۹۔

ایشان تربیت میافتم وہم دراں ایام طفولیت سخنان این طائفہ رادر کام جان این حقیر ریختہ تربیت باطنی را۔۔۔(وہ میری تربیت کرتے، بچپن میں مجھے بزرگان دین صوفیہ کرام کی باتیں سناتے اور میری باطنی تربیت فرماتے)

اخبار الاخیار میں ہی لکھتے ہیں:

"لطفِ باطنی او بود کہ ظاہر و باطن مرا محظوظ و ملحوظ داشت و اول و آخر معصوم و محفوظ۔ پدر نیز خاک درِ او بود درین نسبت تقویت و تربیت میفرمود"(۱) (یہ آپ کا (غوث اعظم) ہی فیض باطن ہے کہ جس نے میرے ظاہر و باطن کو محفوظ رکھا ہوا ہے اور اول سے آخر تک بچائے رکھا ہے۔ والد ماجد بھی آپؒ ہی کے در کی خاک تھے اور اسی نسبت کے زیر اثر (مجھے) تربیت دیتے اور تقویت پہنچاتے تھے)

اپنے رسالہ وصیت نامہ میں لکھتے ہیں: "والد را بر من حق پدری و استادی و دوستی و پیری جمع است"(۲)

"(والد ماجد کے مجھ پر پدری، استادی دوستی اور پیری کے (تمام) حقوق جمع ہیں)"

سید جمال الدین ابو الحساب موسیٰ پاک شہیدؒ (م۱۰۱۰ھ) (۳) اخبار الاخیار میں ہی رقم طراز ہیں کہ بارہا اللہ تعالیٰ کی جناب میں بغیر کسی وسیلے کے بڑھنا چاہا۔ مگر ہر کوشش رائیگاں گئی۔ پھر کئی بار سلسلہ ارادت کے وسیلے اور ذریعے کے حصول کا

---

(۱) دہلوی، عبد الحق (محدث)، المکاتیب والرسائل، ص ۳۱۶۔

(۲) بحوالہ: نظامی، خلیق احمد، حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی، ص ۱۲۷۔

(۳) جمال الدین ابو الحسن موسیٰ پاک شہید (م ۱۰۰۱ھ) سلسلہ قادریہ کے اہم صوفی بزرگ ہیں۔ سید حامد بخش جیلانی اوچیؒ (م۹۷۸ھ / ۱۵۷۰ء) کے فرزند و خلیفہ تھے۔ اتباع شریعت و سنت میں مشہور تھے۔ والد گرامی کی وفات کے بعد سجادہ نشینی کے مسئلہ پر اُچ چھوڑ کر دربار اکبری سے وابستہ ہو گئے۔ پانچ سو کا منصب ملا۔ مذہبی معاملات میں وہ بادشاہ کی ذرا پروانہ کرتے تھے۔ دربار میں اگر نماز کا وقت ہو جاتا تو دیوان خانہ میں خود اذان دے کر نماز باجماعت شروع کر دیتے اور کسی کو بھی ان کو روکنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ۱۰۰۱ھ میں قوم لنگاہ کی خانہ جنگی میں شہادت پائی، مزار مبارک ملتان میں ہے۔ ان کی تصوف پر کتاب "تیسیر الشاغلین" کو سلسلہ قادریہ کے علمی و روحانی نصاب کی حیثیت حاصل ہے۔ شیخ محدث نے "تیسیر الشاغلین" کو اپنی کتب میں بطور حوالہ پیش کیا ہے۔ قادری، محمد یونس، ڈاکٹر، شیخ عبد الحق محدث دہلوی (موضوعاتی مطالعہ)، مکتبہ الحق، کراچی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۰-۱۴۱۔

اشارہ ہوا۔ جس کے بعد آپؒ نے حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ(۱) سے بیعت فرمائی اور ان سے خلافت پائی۔ شیخ مدث نے اپنی اس کتاب میں ان کے لیے عجیب طریقے و نادر الفاظ میں تعریفی کلمات تحریر فرمائے ہیں۔انہیں عیسٰی نفس، موسیٰ مقام، مصطفیٰ جمال، مرتضیٰ کمال محبوب حبیب خدا قرار دیا۔ پھر ان کے القاب اور نام یوں لکھتے ہیں" زین العابدین و امام الصادقین السید التقی النقی والعلوی العلی المہدی سمی کلیم اللہ " (۲) شیخ محدث نے یہ بیعت شوال ۹۸۵ھ میں کی تھی۔ (۳)

شیخ عبدالوہاب متقی شاذلیؒ(م ۱۰۰۱ھ):۹۹۶ھ میں ہندستان کے ماحول سے مایوس ہو کر شیخ محدث حجاز مقدس تشریف لے گئے۔ وہاں علمِ حدیث کی تکمیل کیا اور حضرت عبدالوہاب متقی شاذلیؒ سے بیعت کا شرف بھی حاصل کیا۔اخبار الاخیار میں شیخ محدثؒ نے ان کا پچیس سے زائد صفحات پر طویل تذکرہ فرمایا ہے۔ (۴)شاہ ابو المعالیؒ کے نام اپنے ایک مکتوب میں حضرت عبدالوہاب متقی شاذلیؒ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے"شیخ اجل اعز اکرم اوحد اعدل عبدالوہاب متقی و قادری شاذلی روح اللہ روحہ و اوصل الینا برکاتہ و فتوحہ این مسکین را۔۔" (۵)اس مکتوب میں آگے جہاں بھی شیخ عبدالوہاب کا ذکر کیا ہے شیخ اور سیدی کے نام سے ہی کیا ہے۔شاہ ابو المعالیؒ ہی کے نام ایک دوسرے مکتوب میں شیخ عبدالوہابؒ کا ذکر نہایت ادب اور محبت سے" حضرت قطب الوقت شیخ عبدالوہاب متقی قدس اللہ روحہ" (۶)لکھ کر کیا ہے۔

---

(۱)حضرت موسیٰ پاک شہید(م ۱۰۰۱ھ) سلسلہ قادریہ کے اہم صوفی بزرگ ہیں۔ حضرت موسیٰ سید حامد بخش جیلانی اوچیؒ(م ۹۷۸ھ / ۱۵۷۰ء) کے فرزند و خلیفہ تھے۔ والد گرامی کی وفات کے بعد سجادہ نشینی کے مسئلہ پر اُچ چھوڑ کر دربار اکبری سے وابستہ ہوگئے۔ اکبر سے پانچ سو کا منصب ملا۔ مذہبی معاملات میں بادشاہ کی ذرا پروانہ کرتے۔ دربار میں اگر نماز کا وقت ہو جاتا تو دیوان خانہ میں خود اذان دے کر نماز باجماعت شروع کر دیتے اور کسی کو بھی ان کو روکنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ۱۰۰۱ھ میں قوم لنگاہ کی خانہ جنگی میں شہادت پائی، مزار مبارک ملتان میں ہے۔ تصوف پر ان کی کتاب " تیسیر الشاغلین" کو سلسلہ قادریہ کے علمی وروحانی نصاب کی حیثیت حاصل ہے۔ قادری، محمد یونس (ڈاکٹر)۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، موضوعاتی مطالعہ۔ کراچی: مکتبہ الحق۔ ۲۰۰۷ء۔ ص ۱۴۰-۱۴۱۔

(۲)ایضاً۔

(۳)ایضاً۔ ص ۳۱۷۔

(۴)دیکھیں: دہلوی، عبدالحق محدث۔ اخبار الاخیار مع مکتوبات۔ لاہور: نوریہ رضویہ پبلشنگ کمپنی۔ ۲۰۱۵ء۔ ص ۲۵۳- ۲۷۹۔

(۵)ایضاً، مکتوب نمبر ۵۰، ص ۳۵۰۔

(۶) ایضاً، مکتوب ۶۳، ص ۳۷۹۔

سید خیر الدین محمد المعروف شاہ ابو العالی(م ۱۰۲۴ھ): ان کے القاب میں اسد دین اور زبدۃ العارفین بھی شامل ہیں۔ (۱) بدایونی نے منتخب التواریخ میں ذکر کیا کہ شاہ ابو المعالیؒ شیخ محدث کے شیخ حضرت موسیٰ پاک شہید کے سگے چچازاد اور ان کے والد شیخ داؤد کرمانی شیر گڑھی کے بھتیجے، داماد اور خلیفہ ہیں۔ (۲) شیخ محدث دہلوی شاہ ابو المعالیؒ سے بہت متاثر تھے۔ لاہور آکر ان سے ملاقات کرتے، اپنی مشکلات کا ذکر کرتے اور مدد کے خواہاں ہوتے اور ان کی رہنمائی لیتے۔ شاہ ابو المعالی کے نام شیخ محدث کے آٹھ مکتوبات ملتے ہیں جن سے ان کے تعلقات کی نوعیت اور باہمی قربت و مودّت کا علم ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مکتوب میں اس بارے میں لکھتے ہیں "یہ فقیر تو آپؒ کی خدمت میں صرف اصلاح احوال کے لیے حاضر ہوا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ میرا کوئی دیگر مقصد ہی نہیں ہوتا اور غرض آپؒ سے محبت کرنے کی رضائے مولیٰ ہے اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے"(۳) شاہ ابو المعالیؒ نے جو مشورے شیخ محدثؒ کو دیئے وہ تاحیات ان پر عامل رہے۔ شیخ محدث کے تالیفی و تصنیفی کاموں بھی شاہ ابو المعالیؒ کی راہنمائی شامل تھی۔ مثلاً شرح فتوح الغیب انہی کے اصرار پر لکھی، نہ صرف شرح مشکوٰۃ کے جلد لکھنے کا فرمایا بلکہ اس کو دلچسپ اور پر اثر بنانے کے لیے اہم اور مفید مشورے بھی دیئے۔

حضرت غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانیؒ (م ۵۶۱ھ): سلسلہ قادریہ سے شیخ محدثؒ کا گہرا قلبی تعلق تھا اور ان کی عقیدت و ارادت کا تمام تر مرکز حضرت غوث الاعظم شیخ محی الدین عبد القادر جیلانیؒ تھے۔ "زبدۃ الآثار منتخب بہجۃ الاسرار" میں لکھتے ہیں کہ مجھے خواب میں حضرت غوث الاعظم نے رسول اللہ ﷺ کے اشارہ پر مرید کیا تھا اور بیعت ہونے کے بعد حضور سرور کائنات ﷺ نے بزبان فارسی مجھے بشارت دی تھی کہ:"بزرگ خواہی شد" (۴)(یعنی تم بلند مرتبہ ہو گے)

(۱) شارب، ظہور الحسن (ڈاکٹر)۔ تذکرۃ اولیائے پاک وہند (خم خانۂ تصوف)۔ لاہور: پروگریسو بکس، ۱۹۹۹ء۔ ص ۲۵۱۔

(۲) بدایونی، عبد القادر بن ملوک شاہ۔ منتخب التواریخ۔ تہران: انجمن آثار و مفاخر فرہنگی، ۱۳۷۹ھ۔ ص ۵۷۰۔

(۳) دہلوی، عبد الحق محدث۔ اخبار الاخیار مع مکتوبات۔ مکتوب ۶۳، ص ۳۷۹۔

(۴) بحوالہ: نظامی، خلیق احمد۔ حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی۔ لاہور: مکتبہ رحمانیہ۔ س ن۔ ص ۱۳۹۔

مختلف تصانیف شیخ محدث دہلویؒ میں خواجہ محمد باقی باللہؒ اور نقشبندی سلسلہ کا ذکر

یہ عجیب بات ہے کہ اخبار الاخیار میں شیخ محدثؒ نے حضرت خواجہ محمد باقیؒ کا ذکر ہی نہیں کیا۔ حالانکہ وہ خواجہ کے تقریباً چالیس سال بعد تک حیات رہے ہیں اور دوسری طرف انہوں نے اخبارالاخیار میں اپنے شیخ کا ذکر بہت ہی عقیدت اور محبت سے کیا ہے۔ آپؒ کے رسالہ "وصیت" میں آپؒ نے یہ ذکر کیا کہ انھیں ہندوستان واپسی پر خواجہ محمد باقی نقشبندیؒ خدمت میں حاضری کا موقع ملا ہے۔ کچھ عرصہ طریقہ خواجگان کی مشق کی مگر یہاں حضرت خواجہؒ سے بیعت کرنے کا صراحتاً ذکر موجود نہیں، لکھتے ہیں:

"چوں بہ ہندوستان آمدم صحبت افتاد مرا باخواجہ محمد باقی نقشبندی مدتے مشق نسبت خواجگان طریقہ ذکر، مراقبہ، رابطہ و حضور یادداشت حاصل نمودہ" (۱)

"(جب میں ہندوستان واپس آیا تو خواجہ محمد باقی نقشبندیؒ کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا، (وہاں) کچھ عرصہ خواجگان کے طریقہ سے ذکر و مراقبہ رابطہ و حضور کی تعلیم حاصل کی)"

حضرت شاہ غلام علی دہلوی نے اپنے مکتوبات میں "توصیل المرید الی المراد" کے حوالے سے یہ ذکر فرمایا ہے کہ شیخ محدث دہلویؒ نے حضرت باقی باللہ سے بیعت کی ہے۔ ان کے مجموعہ مکتوبات کے مکتوب نمبر ننانوے (۹۹) میں تحریر ہے:

"شیخ عبدالحقؒ بعد استفادہ از طریقہ عالیہ قادریہ رحمۃ اللہ علیہم بخدمت بعد حضرت خواجگان حضرت خواجہ محمد باقیؒ رسیدہ حضور و آگاہی از ایشان کسب کردہ در رسالہ موصل مرید الی المراد (توصیل المرید الی المراد) نوشتہ اند کہ نزد انصاف بجہت کسب حالات فنا و بقا بہتر از طریقہ نقشبندیہ طریقہ نیست" (۲)

---

(۱) بحوالہ: نظامی، خلیق احمد۔ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ ص ۱۳۳-۱۳۴

(۲) دہلوی، غلام علی (شاہ)۔ مکاتیب شریفہ حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ۔ استنبول: مکتبۃ الحقیقۃ۔ ۱۴۱۲ھ / ۱۹۹۲ء۔ ۹۹ / ۱۲۵۔

"(شیخ عبدالحقؒ (حضرات) قادریہ رحمۃ اللہ علیہم سے استفادہ کے بعد حضرت خواجہ خواجگان حضرت خواجہ محمد باقیؒ کی خدمت میں پہنچے ان سے حضور و آگاہی کی نسبت حاصل کی۔ (پھر) رسالہ توصیل المرید الی المراد میں لکھا کہ ازروئے انصاف فناوبقاکے حالات کسب کرنے کے لیے طریقہ نقشبندیہ سے بہتر کوئی طریقہ نہیں)"

یہ فارسی رسالہ دستیاب ہے۔ اس میں شیخ محدثؒ نے طریقہ سلسلہ نقشبندیہ کی عبادات و ارارود کے اختصار کی تعریف فرمائی ہے۔ صفحہ نمبر چھ (٦) پر لکھتے ہیں:

"طریقہ سلسلہ شریفہ نقشبندیہ قدس اللہ تعالیٰ اسراہم کہ اقتصار ست بر ملازمت ذکر خفیہ و تصفیہ قلب از نقوش اغیار باعدم استقصاواستیفای اقسام عبادات ظاہر از صلوات و صیام و اعمال و اوراد طریقی مقرر ست۔ ونزد انصاف طریقی در تحصیل قرب و وصول و فنا اولیٰ و اقرب ازان نتوان یافت" (١) (سلسلہ عالیہ نقشبندیہ میں ظاہری عبادات مثلاً (نفلی نمازوں) اور (نفلی) روزوں، مختلف اقسام کے اعمال اور وظائف کی بجائے صرف ذکر خفی پر مداومت کرنے اور دل کو غیر کے خیال سے پاک کرنے پر اکتفا کرنے کی ہی تعلیم دی جاتی ہے۔ اہل انصاف کے نزدیک قرب ووصولِ حق اور فنافی اللہ کی منزل کے حصول میں اس سے بہتر اور قریبی طریقہ اور کوئی نہیں)

یہاں بھی شیخ نے نقشبندی سلسلے کی اہم خصوصیات کا ذکر تو فرمایا ہے مگر خواجہ باقی باللہؒ سے اپنی بیعت کرنے کا ذکر نہیں فرمایا۔ حالانکہ ان کا کئی کتب میں اپنے شیوخ کا تعارف دیکھیں تو انہوں نے بہت صراحت ووضاحت اور محبت سے اپنے شیوخ کا ذکر فرمایا ہے اور ان کا تفصیل سے تعارف کروایا ہے اور یہ وضاحت بھی فرمائی ہے کہ انہوں نے ان سے کس سن میں بیعت کی۔ اگر رسالہ توصیل المرید الی المراد کی پہلے صفحے پر عبارت ہی کو دیکھیں تو شیخ محدث اپنی قادری سلسلہ سے قلبی وروحانی عقیدت اور حقیقت کو بیان کیا ہے اور خود کو اسی سلسلے کے ساتھ جوڑا ہے، لکھتے ہیں:

"این مجموعہ ایست جامع ادعیہ واذکار واحزاب مسمی تَوْصِیْلِ الْمُرِیْدُ اِلَی الْمُرَادُ بہ بیان اَحْکَامَ الْاَحْزَابْ وَ الْاَوْرَادُ بالتماس بعضی از طالبان نوشتہ شدہ و مخصوص ست بانچہ در عملِ کاتب حروف درآمدہ بعضی از سلسلۂ شریفۂ قادریہ کہ این فقیر سگِ آن آستانہ ست و بعضی از جاہائے دیگر" (٢)

---

(١) دہلوی، عبدالحق، شیخ، توصیل الرید الی المراد، آگرہ: مطبع مفید عام، س ن، ص٦۔

(٢) دیکھیں: دہلوی، عبدالحق محدث۔ توصیل المرید الی المراد۔ آگرہ: مطبع مفید عام۔ س ن۔ ص ٢۔

"(یہ رسالہ جامع دعاؤں، اذکار اور احزاب کا مجموعہ ہے جس کا نام میں نے "تَوْصِيْلِ الْمُرِيْدُ اِلَى الْمُرَادُ بِه بَيَان اَحْكَامَ الْاَحْزَابْ وَ الْاَوْرَادْ" رکھا ہے۔ یہ کچھ طالبان حق کی درخواست پر لکھا گیا ہے اور ایسے مخصوص اوراد و اذکار پر مشتمل ہے جو راقم الحروف کے عمل میں شامل ہیں۔ ان میں کچھ (وظائف) سلسلہ عالیہ قادریہ کے ہیں جن کا یہ فقیر خوشہ چین ہے، اور کچھ دوسری جگہوں سے لیے ہیں)"

مکتوبات شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ بنام خواجہ محمد باقی باللہؒ

شیخ محدثؒ کے مجموعہ مکاتیب میں پہلے سات طویل مکتوبات حضرت خواجہ کے نام ہیں اور ان میں انہوں نے بہت عالمانہ گفتگو کی ہے۔ کئی بزرگانِ دین کے رسائل کا مختصر فارسی ترجمہ کر کے ارسال فرمایا ہے یا ان کا تعارف کروایا ہے اور ان کے بیش قیمت اقوال سے استدلال فرمایا ہے۔ ان مکتوبات سے دونوں کے باہمی محبانہ تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ **پہلا مکتوب** (سلوك الطريق الفلاح عند فقد تربية بالاصطلاح) جوابی مکتوب ہے۔ جس میں شیخ محدثؒ نے اس بات پر بڑی حیرت کا اظہار کیا ہے کہ خواجہ باقی باللہؒ کیونکر ان کی طرف متوجہ ہوئے؟ اور یہ کہ خواجہ نے انہیں اس اعتبار کے قابل کیسے سمجھا کہ ان باتوں کو تحریر کریں جو صرف اہل کے سامنے ظاہر کی جاسکتی ہیں۔ مکتوب کے آغاز میں شیخ محدثؒ لکھتے ہیں:

"و مرا ازان تعجب روئے نمود از دو وجہ، یکی آنکہ باوجود آن مشغولے و حالت سکوت و حضور کہ عنایت حق جل و علی نصیب ایشان گردانیدہ است چگونہ التفات باین عالم آوردہ اند و عجب تر آنکہ ۔۔۔ این فقیر را کجا اہلیت آن و مناسبت بدان کہ باچون۔۔۔"(۱)

(آپ کا مکتوب ملنے سے) مجھے دو طرح سے تعجب ہوا، اول اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو شغل، حضور و سکوت کی حالت عطا فرمائی ہے اس سے کس طرح میری طرف توجہ ہوئی، دوسری بات اس سے بھی زیادہ حیران کرنے والی ہے کہ آپ نے اس حقیر کو ان کلمات سے مخاطب فرمایا کہ جو صرف اہل کے سامنے ظاہر کیے جاسکتے ہیں۔ یوں آپ نے اس فقیر کو قابل اعتبار سمجھا ہے۔ حالانکہ یہ ناچیز اس قابل کہاں۔۔۔)

اسی مکتوب میں آگے لکھتے ہیں:

"بارے درین زمانہ کہ مائیم سخن نیز غنیمت ست تابعد ازان توفیق کار کرا بخشند وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا

---

(۱) دہلوی، عبد الحق محدث۔ اخبار الاخیار مع مکتوبات۔ ۱/ ۴۔

بِالصَّبْرِ)" (۱)

"(کہ ہمارے زمانہ میں باہمی مذاکرہ غنیمت ہے تاکہ عمل کی توفیق حاصل ہو سکے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کریں اور صبر کا حکم دیتے رہیں) (۲)

اسی مکتوب میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

"**علم شریف محیط خواہد بود بآنکہ** این درد را در ین زمانہ علاجی پیدا نیست" (۳)

"(یعنی آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس زمانہ میں اس درد کا کوئی علاج نہیں ہے)"

پھر آگے لکھتے ہیں کہ:

"اکنون معلوم شد کہ دریافت اولیا وشناخت مردان و استفادہ و اقتباس نور ولایت بسعی پاے طلب عادی و بزور بازوے قوتِ ممیزہ نیست مگروی سبحانہ وتعالیٰ مددی فرماید۔۔۔ بہمہ حال براہ ناامیدی نباید رفت واز دعاو سوال این مطلب والحاح واضطرار درآن نباید نشست۔۔۔" (۴)

"(اب واضح ہو گیا ہو گا کہ اولیائے کرام کا حصول، مردان خدا کی معرفت اور ان کے نورِ ولایت سے استفادہ اپنی کسی ممتاز طاقت کے بل یا اس کی خواہش کرنے سے نہیں ہو سکتا۔ مگر جب اللہ تعالیٰ ہی مدد فرمائے اور اس کارِ بستہ کی راہ کھولے، پھر بھی ناامید نہیں ہونا چاہیے اور اس مقصد کے لیے عاجزی وزاری کے ساتھ دعا کرنے اور دل میں اس کی تڑپ و طلب پیدا کرنے سے بیٹھ نہ رہنا چاہیے کہ وہ دعاؤں کا بڑا قبول کرنے والا اور فقرا کو اپنی عطاؤں سے نوازنے والا ہے)"

پھر یوں رقم طراز ہیں:

---

(۱) العصر ۱۰۳: ۳۔

(۲) دہلوی، عبد الحق محدث۔ اخبار الاخیار مع مکتوبات۔ ۱/ ۵۔

(۳) ایضاً، ص ۵۔

(۴) ایضاً، ص ۶۔

نقلے چند مناسب مقصودہ جامع مطالب از حضرات مشائخ حاضر وقت است نوشتہ می شود مطالعہ آن و تکرار و تردد او نظر دران بغایت موثر و منور می نماید۔۔۔ (۱)

"(مشائخ کی وہ چند باتیں جو اس وقت یاد ہیں اور مقصود کے مناسب احوال اور جو تمام مطالب و مقاصد کے لیے جامع ہیں آپ کی خدمت میں لکھ رہا ہوں۔ ان کا بار بار مطالعہ اور ان میں غور و فکر بہت موثر اور مفید ہوگا)"

دوسرے مکتوب (اصول الطریقة للکشف الحقیقة) میں شیخ شہاب الدین احمد رزوقؒ کے رسالے کے حوالے سے پانچ پانچ اصول طریقت، اصول معاملات، امراض نفس کے اصول، شیخ کامل کی خصوصیات اور مرید کے اپنے شیخ اور پیر بھائی کے ساتھ آداب بیان فرمائے ہیں۔ آخر میں لکھتے ہیں کہ:

"این چند کلمہ از رسالہ اصول الطریقہ نقل کردہ شد و درحقیقت اگر قائد توفیق حال گردد و باین راہ برد و عمل ۔۔۔" (رسالہ " اصول الطریقہ " سے یہ چند باتیں نقل کر دی ہیں۔ اگر توفیق الٰہی رفیق حال ہو اور اس راہ پر لے چلے اور مذکورہ بالا باتوں پر عمل کی توفیق مل جائے تو بلاشبہ پھر جوہرِ ایمان، نورِ معرفت، صفائی قلب اور کمال حاصل ہو جائے گا) (۲)

اسی دوسرے مکتوب میں بزرگان دین کی کئی مختلف کتب کے مطالعہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ان سے بزرگوں نے مطالعے سے روکا ہے پھر لکھتے ہیں:

" فلزم الحذر من موارد الغلط لاتجنب الجملة و معادات العلم ولایتم ذلك الا بثلاث۔۔۔۔" (۳)

"(لہٰذا غلط مواقع سے بچنا چاہیے یہ مطلب نہیں کہ تمام (کتب کے مطالعے) کو ہی ترک کر دیں اور یہ بات ذکاوتِ صادقہ، فطرتِ سلیمہ اور حق کو اختیار کر کے ماسوا کو چھوڑ دینے، تین چیزوں سے حاصل ہو سکتی ہے)"

اس مکتوب کے آخر میں لکھتے ہیں:

" بمطالعہ این کلمات نوری و حضوری پیدا شود کاتب حروف راز دعای خیر محروم نگذارند " (۱)

---

(۱) دہلوی، عبدالحق محدث۔ اخبار الاخیار مع مکتوبات۔ ۱/ ۶۔

(۲) ایضاً ۲/ ۲۰۔

(۳) ایضاً ۲/ ۲۲۔

"(اگر ان کلمات کے پڑھنے سے نور وحضور پیدا ہو تو راقم حروف کو بھی دعائے خیر سے محروم نہ فرمائیں)"

تیسرا مکتوب (تبیین الطریق لاھل الادارۃ بالتزام وظائف خیر العبادۃ) شیخ علی متقی شاذلیؒ کے رسالہ" تبیین الطریق" کے حوالے سے ہے اس میں عبادت کی اقسام اور ان کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔

مکتوب نمبر چار (تنبیہ اھل النھیٰ بتفاوت وحال الابتدأ و الانتھأ) میں حضرت شیخ شہاب الدین سہر وردیؒ کی کتاب "عوارف المعارف" کے حوالے سے لکھا ہے۔ اس میں فرائض کے بعد نوافل کی کثرت کے بارے میں تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔

مکتوب پانچ (تحصیل الکمال الابدی باختیار فقر المحمدی) میں کہ خواجہ باقی باللہ کے رسالہ" فقر محمدی" کے بارے میں دریافت فرمانے پر کہ یہ رسالہ کیا ہے اور کس کی تحریر ہے؟ شیخ محدثؒ نے اس کے جواب میں شیخ احمد بن ابراہیم واسطی حضرمیؒ کے رسالہ "فقر محمدی" کا جامع تعارف اور اس کا ترجمہ لکھ کر بھیجا ہے۔

مکتوب نمبر چھ (قرع الاسماع باختلافِ احوال المشایخ و اقوالھم فی السماع) کافی طویل مکتوب ہے۔ اس میں سماع سے متعلق لکھا ہے اور مشائخ کے اختلافی اقوال کا تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس میں ایک جگہ پر اپنی رائے یوں لکھتے ہیں:

"وازینجا معلوم می شود کہ اختلاف در سماع نہ ہمین در سہر وردیہ وچشتیہ است حالی ست کہ بعضے را باشد وبعضے را نہ و اگرچہ بعضے را آن حال باشد باوجود آن توقف نمایند وبراہ اتباع روند غنا مذہب نیست ورکنی از ارکان طریقت کہ بران بایستند ولازم گیرند"(۲)

"(اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سماع کے باب میں جو اختلاف ہے وہ سلسلہ سہر وردیہ اور چشتیہ کا نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو ایک حال اور کیفیت ہے کہ بعض کو پیش آجاتا ہے اور بعض کو نہیں اور بعض کو اگرچہ وہ حال موجود ہوتا ہے مگر پھر بھی توقف کرتے ہیں اور راہ اتباع اختیار کرتے ہیں۔ دراصل سماع غنانہ تو کوئی مذہب ہے اور نہ ارکان طریقت میں سے کوئی رکن کہ اسے اختیار کرلیں)"

---

(۱) ایضاً ۲/ ۲۳۔

(۲) ایضاً ۶/ ۵۹۔

مکتوب نمبر سات (ورود الامداد باستقامۃ علی الاوراد) میں اوراد و وظائف پر دوام و ہمیشگی اختیار کرنے کی ترغیب کے بارے میں لکھا ہے۔ اس کے آخر میں حضرت خواجہؒ کو شیخ ابن عطا اللہؒ کے حوالے سے یہ لکھتے ہیں کہ:

" ہر فضیلتے کہ از عمل در نظر آید و بصحت پیوند و کم ازان نباشد کہ یکباردر عملش در آرید تا باری از

عاملان آن باشید این قدر بس است" (۱)

"(ہر افضل عمل جو سامنے آئے اور درجۂ صحت تک پہنچ چکا ہو اس پر کم از کم ایک مرتبہ عمل کر لو تاکہ تم بھی اس پر عمل کرنے والوں میں شمار ہو جاؤ۔ بس اتنا (کہنا) ہی کافی ہے)"

ان مکتوبات میں شیخ محدثؒ کا لہجہ ایک مرید کا نظر نہیں آتا بلکہ ایک عالم کا سا محسوس ہوتا ہے۔ ایک ایسے ہم عصر عالم کا جو مکتوب الیہ کو بہت نیک، بزرگ اور قابل اعتماد خیال کرتا ہے۔ مگر ان کے دریافت کرنے پر بلا کم و کاست بزرگوں کے حوالے سے علمی باتیں لکھ دیتا ہے۔ ان کے کسی مکتوب سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ کوئی مرید اپنے شیخ کو مکتوب لکھ رہا ہے۔ خصوصاً پہلے مکتوب میں طرز تخاطب اور انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ سے ان کا تعلق ابھی ذاتی اور بے تکلف نوعیت کا نہیں بنا تھا بلکہ علمی تھا، ہاں دونوں جلیل القدر شخصیات مابین احترام و محبت کا گہرا تعلق ہے۔ مکتوبات میں خصوصاً یہ جملے قابل غور ہیں۔

" مشائخ کی وہ چند باتیں لکھ رہا ہوں ان کا مطالعہ اور بار بار کی تکرار بہت موئثر اور مفید ہو گی، ہمارے زمانہ میں باہمی مذاکرہ غنیمت ہے تاکہ عمل کی توفیق حاصل ہو سکے، آپ کو معلوم ہونا چاہیے، رسالہ " اصول الطریقہ " سے یہ چند باتیں نقل کر دی ہیں۔ اگر توفیق الٰہی رفیق حال ہو اور اس راہ پر لے چلے اور مذکورہ بالا باتوں پر عمل کی توفیق مل جائے تو بلاشبہ جوہر ایمان، نور معرفت، صفائی قلب اور کمال حاصل ہو جائے، ان کلمات کے پڑھنے سے نور و حضور پیدا ہو تو راقم حروف کو بھی دعائے خیر سے محروم نہ فرمائیں، لہذا غلط مواقع سے بچنا چاہیے یہ مطلب نہیں کہ تمام (کتب کے مطالعہ) کو ہی ترک کر دیں"

غرض یہ باتیں ایک عالم دوسرے عالم کو تو لکھ سکتا ہے۔ خصوصاً جب اس سے دریافت بھی کیا گیا ہو۔ مگر ایک مقتدی اپنے شیخ کو اس لہجے میں نہیں لکھ سکتا۔ یہ روایت بھی ملتی ہے کہ شیخ محدثؒ کے ان مکاتیب کو خواجہ باقی باللہؒ کی خانقاہ میں حاضرین کے سامنے پڑھ کر بھی سنایا جاتا تھا۔ خلیق نظامی نے بھی یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت خواجہؒ کو شیخ محدثؒ سے بہت لگاؤ

(۱) ایضاً / ۸۲۔

تھا۔ وہ ان کے مکتوبات کو بڑے شوق سے پڑھتے تھے اور ان مکتوبات کا ان پر بہت اثر ہوتا تھا۔ اس بارے میں ایک مثال ملفوظات باقیہ میں یوں ملتی ہے:

"روزے عنایت نامہ بندگان حضرت مخدومی حاجی شیخ عبدالحق ---۔ حضرت ایشان بنظر تعطش اثر درآمد و حالتے بخشید کہ از حوصلۂ کاغذ و قلم بیرون است۔ مجملے از ذوق آن درین مصرعہ یافتہ می شودے

نہادم روئے بر روئے وے واز خویشتن رفتم" (۱)

(ایک دن حضرت مخدومی حاجی شیخ عبد الحق کا عنایت نامہ جو کہ حقیقت میں حقائق آمیز مضامین اور فصائح آمیز کلمات کا نسخہ بلکہ ان کا عنوان تھا، پہنچا۔ خط کی پشت پر آپ حضرت کے قلم سے لکھے ہوئے چند کلمے نظر پڑے ایک ایسی حالت کیفیت اور حالت وارد ہوئی کہ جو زبان و بیان سے باہر ہے۔ اس ذوق کا مجملاً نمونہ اس مصرعہ میں پایا جاتا ہے کہ

میں نے اپنا منہ اس کے منہ پر رکھا اور اپنے آپ سے بے خبر ہو گیا)

شیخ محدثؒ کی حضرت خواجہؒ سے بیعت

غرض اس بارے میں شیخ محدثؒ کی تصانیف میں صراحت سے نہیں ملتا کہ انہوں نے حضرت خواجہؒ سے بیعت کی تھی۔ نہ ہی ان کے حضرت خواجہؒ کے نام مکتوبات سے اس بات کی شہادت ملتی ہے۔ لیکن اگر ہم ان کے اپنے فرزند شیخ نور الحق دہلویؒ کے نام مکتوبات کو دیکھیں تو ان کے نام ایک مکتوب (مکتوب نمبر ۵۷) میں یہ بات تفصیل سے مل جاتی ہے کہ انہوں نے حضرت خواجہؒ سے بیعت کی تھی۔ اسی مکتوب میں انہوں نے اپنے بیعت کرنے کی وجہ اور اس کا سبب بیان فرمادیا۔ اس مکتوب میں مختلف اذکار، اوراد اور احزاب کا ذکر کرنے کے بعد انہوں نے اس بات کی تصریح فرمائی کہ انہیں ان سب کی اجازت کہاں سے حاصل ہوئی اور پھر اسی کے ساتھ انہوں نے سلسلہ نقشبندیہ سے حضرت خواجہ کے ذریعے فیض حاصل کرنے کی بابت بیان فرمایا۔ مگر یہاں پر خلاف عادت یہ تصریح نہیں فرمائی کہ یہ بیعت کس سن میں کی۔ لکھتے ہیں:

"قد اجازنی سیدی الشیخ عبد الوہاب بکتب القوم و طرقہم سلاسلہم و اجازنی من اربع سلاسل القادریۃ و الشاذلیۃ المدینۃ والچشتیۃ وہذا الاجازات حصلت بحضرت علی المتقی من الشیخ محمد بن محمد بن محمد السخاوی کان فی المدینۃ المطہرۃ

---

(۱) کلمات طیبات ص ۵۴-۵۵۔

رجل من الافراد صاحب مقام التجرید والتفرید والتوحید لکن المملوک مقتصر علی النسبۃ القادریۃ وحدہا وواقف علی باب فضلہا وکرمہا۔ ولقد کان للعبد الفقیر تعصب فی الشیخ کان لایری ولایذکر احد المشائخ علی وجہ الفقر والالتجاء عند ذکرہ وکان حاضراً توجہہ۔ فقال سید عبدالوہاب انتم من فقرائہ ومریدیہ ولکن شان طالب الحق ان یستفید من کل مفید ویفید لکل مستفید۔ ولا یغلق باب الطلب ولایسد طریق الاستفادۃ علی نفسہ فمن این یحصل لہ الفائدہ یریٰ۔ انہ من شیخہ ومن ہناکان توجہی والتجائی الی صحبۃ خواجہ محمد باقی قدس سرہ واستفادتی منہ النسبۃ النقشبندیۃ بعد وقایع و معاملات۔۔۔" (۱)

"(مجھے ان برگزیدہ لوگوں کی کتب اور سلاسلِ طرق کی اجازت سیدی شیخ عبدالوہابؒ نے عطا فرمائی۔ نیز قادریہ، شاذلیہ مدنیہ اور چشتیہ چاروں سلاسل کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ انہیں یہ اجازات حضرت شیخ علی المتقیؒ سے اور ان کو حضرت شیخ محمد بن محمد بن محمد السخاویؒ سے حاصل ہوئیں جو مدینہ منورہ میں بلند روحانی مقامات پر فائز تھے۔ تاہم یہ بندۂ ناچیز صرف ایک قادریہ نسبت تک ہی محدود اور اسی کے فضل وکمال سے آگاہ تھا۔ ناچیز نے اپنے شیخ سے نہایت محبت وعقیدت کی بناپر ان مشائخ میں سے کسی کی طرف اکتساب فیض کے لئے توجہ نہیں کی اور اپنے شیخ پر ہی اکتفاکیے رکھا۔ پھر سیدی شیخ عبدالوہابؒ نے مجھے فرمایا کہ تم (قادریہ سلسلہ) کے فقراً اور مریدین سے ہی ہو۔ مگر ایک طالبِ حق کی شان یہ ہے کہ وہ ہر فائدہ مند شئے سے فائدہ حاصل کرتا ہے اور ہر فائدہ چاہنے والے کو فائدہ پہنچاتا ہے، طلب کا دروازہ بند نہیں کرتا اور نہ ہی خود پر فائدہ کی راہ روکتا ہے، خواہ وہ کہیں سے حاصل ہو۔ ان بزرگوں میں جن کی جانب ہماری گفتگو، آرزو اور توجہ ہے، (یعنی) خواجہ محمد باقی باللہؒ، جن سے میں حقائق ومعاملات کے جاننے کے بعد میں نے نقشبندی نسبت حاصل کی)"

اسی مکتوب میں اس بیعت کا ذکر کرنے سے قبل شیخ محدثؒ نقشبندی نسبت، اکے خصائص اور حضرت خواجہؒ کا ذکر ان الفاظ میں کرواتے ہیں:

"ہذہ النسبت التی اشرنا الیہاہی النسبۃ النقشبندیۃ ولہا بیان شاف فی کلامہم وعیان کاف فی قلوبہم وحاصلہا محو النقوش الاغیار عن لوح الادراک وتصفیہ القلب عماسوی المشہود طریقہم طریق التصفیۃ وطریق السلوک المتعارف طریق التزکیۃ وفی طریق التزکیہ معاملۃ مع النفس ونزاع وجدال معہاوفی التصفیہ ذہول عن النفس وصفاتہاوعن کل ماسوی

---

(۱) دہلوی، عبدالحق محدث۔ اخبار الاخیار مع مکتوبات، لاہور: نوریہ رضویہ پبلشنگ کمپنی، ۱۴۳۶ھ، مکتوب ۵۷، ص ۳۷۱۔

المذکور۔ وکان الداعی الیہا والمرشد للطالبین فی بلدناھذا الشیخ العارف الکامل سرّ اللہ الاعظم ونورہ الاتم سیدنا ومولانا خواجہ محمد الباقی قدس سرہ الاصفی۔ وکان من رجال اللہ المتنور بنور ذات اللہ صورۃ و معنی والمتصف بصفات اہل الخصوص ظاہراً وباطناً وہو من مشایخنا فی ھذا الطریق جزاہ اللہ منا خیراً.' (۱)

"(یہ نسبت جس کی جانب ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ نقشبندی نسبت ہے۔ اس کے لیے ان کی باتوں میں شافی بیان اور دلوں میں کفایت کرنے والی نظر ہے اور اس کا حاصل حسِ ادراک سے غیر کے نقوش کو مٹانا اور موجود کے علاوہ (ہر کسی) سے دل کو پاک کرنا ہے۔ ان کا روحانی طریقہ باطنی تصفیہ و تزکیہ حاصل کرنے کے لئے جانا پہچانا طریقہ ہے اور (حصول) تزکیہ کے اس طریقہ میں نفس کی مخالفت ومقابلہ، نفس اور اس کی صفات کو (مغلوب کرنا) اور نفس کو مذکور کے علاوہ ہر غفلت سے پاک کرنا مقصود ہے۔ ہمارے شہر (دہلی) میں طالبوں کے راہنما، اس عظیم روحانی سلسلۂ طریقت کی طرف دعوت دینے والے، عارف باللہ شیخ المشائخ، اللہ تعالیٰ کے عظیم راز، اس کے نور سے مستنیر اور پاکیزہ تر سردار خواجہ محمد الباقی قدس سرہ ہیں، یہ ایسے لوگوں میں سے ہیں جو صورتاً اور سیرتاً ذات الٰہی کے نور سے منور اور ظاہراً وباطناً خواص کی صفات سے متصف ہیں وہ اس طریقۂ نقشبندیہ میں ہمارے مشائخ میں سے ہیں، اللہ تعالی انہیں بہتر جزا عطا فرمائے)"

اقسام بیعت

بیعت کی بہت کی اقسام ہوتی ہیں یعنی بیعت طریقت، بیعت توبہ اور بیعت برکت وغیرہ۔ اس بات کا ذکر خود شیخ محدثؒ نے حضرت خواجہؒ کے نام پہلے مکتوب میں کیا ہے اور مشائخ وراہنما کی تین اقسام بیان فرمائی ہیں ۱- شیخ تعلیم، ۲- شیخ تربیت، ۳- شیخ ترقیۃ اور پھر لکھا ہے کہ شیخ ترقیۃ سے ملاقات اور اس کی برکت ہی کافی ہے۔ (۲) اس کے مطابق شیخ محدثؒ نے حضرت خواجہ سے بیعتِ برکت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ شیخ محدثؒ نے اپنی روحانی اور قلبی نسبت کو ہمیشہ قادری سلسلہ کے ساتھ بڑے فخر اور خوشی سے ظاہر فرمایا ہے۔ انہوں نے صرف ایک مکتوب میں اپنے فرزند سے یہ ذکر ہے کہ انہوں نے اپنے شیخ کے فرمان کے مطابق حصولِ برکت وفیض کے لیے یہ بیعت فرمائی۔ ورنہ جہاں کہیں انہوں نے اپنی سوانح حیات تحریر فرمائی۔ ان کے

---

(۱) دہلوی، عبدالحق محدث۔ اخبار الاخیار مع مکتوبات، مکتوب ۵۷، ص ۳۶۹۔

(۲) دہلوی، عبدالحق محدث۔ اخبار الاخیار مع مکتوبات۔ ۱/ ۱۲۔

شیوخ اور بیعت میں حضرت خواجہؒ کا ذکر نہیں فرمایا۔ حالانکہ شیخ محدث حضرت خواجہ کے تقریباً چار دہائیاں بعد تک حیات رہے۔

خلاصہ بحث

ہمارے یہ دونوں عظیم اور محترم بزرگ ایک ہی شہر میں رہائش پذیر تھے جن میں باہمی خط و مکاتبت رہی۔ ان مکتوبات سے آپ کے باہمی پر خلوص اور مشفقانہ و برادرانہ تعلقات کے بارے میں بخوبی علم ہوتا ہے۔ ان دونوں بزرگوں نے احیائے سنت، ترویج شریعت اور دین پر عمل کرنے کی تحاریک میں بنیادی کردار ادا فرمایا۔ دونوں کی اتباع حقیقت میں شریعت مطہرہ کی اتباع ہے۔ دونوں اپنے متبعین اور متعلقین کو علم و عمل کی طرف لے کر آئے اور نبی کریم ﷺ کی سنت کی طرف راہنمائی کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی تعلیمات کو سمجھنے، ان پر عمل کرنے اور انکے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین! بجاہ سید المرسلین ﷺ۔

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سونے کا استعمال

(بطور زیور، زینت اور ضرورت)

Usage of Gold in Islamic perspective

(As jewelry, ornament and necessity)

☆ محمد شفیق

☆☆ سید کاظم محمود کاظمی

ABSTRACT

Gold is a well-known, gold-colored, precious, shiny, soft and smooth metal. It is called "Al-Zhahab" in Arabic, "Gold" in English and "Oram" in Latin. Gold is as old as history because it is mentioned in all the heavenly books. Archaeological and historical evidence from various countries confirms that the Egyptians started using gold around 1200 BC, and some historical facts indicate that man discovered gold around 2600 BC. In ancient times, gold was used in jewelry, costumes, utensils, decorative items, crowns, designs on the weapons, carving sculptures, idols, and medicines, while in modern times, it is used in the medicines of Allopathic and Homeopathic ways of treatment and also used in the manufacture of electronic parts such as watches, mobile phones and computers. In the recent and distant past, gold was used as a coin and currency and only gold was used in transactions with different countries. As being the world's most precious metal, banks, countries and governments still ensure the presence of gold in their assets. Islam has not left the permission of adornment and decoration free but has set separate rules, conditions and limits for men and women in this regard so that real beauty is created in human life and Islamic society becomes a manifestation of beauty and goodness. Therefore, it is absolutely haram for a man to wear all kinds of ornaments such as rings, necklaces, bracelets, rings, earrings, anklets, curls, tops, badges and stars etc. Because the Prophet (peace and blessings of Allah be upon him) forbade men to wear gold ornaments. However, it is absolutely permissible for a woman to wear all kinds of gold ornaments such as rings, necklaces, bracelets, rings, earrings, anklets, curls, earrings, badges and stars.

Keywords: Gold, Jewelry, necessity, bracelet, anklet.

☆ پی۔ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور

☆☆ ایم۔فل اسلامک سٹڈیز، امپیریل کالج آف بزنس سٹڈیز، لاہور

تعارفِ موضوع:

سونا، مشہور و معروف، سنہری رنگ کی قیمتی، چمک دار، نرم وملائم دھات ہے۔[۱] جسے عربی میں "الذھب"، انگریزی میں "Gold" اور لاطینی زبان میں "اورم" کہا جاتا ہے۔ سونا زمین میں دیگر تقریباً بیس دھاتوں کے ساتھ ملا ہوا ذرات کی صورت میں پایا جاتا ہے جسے بعد ازاں ریفائنری کے عمل کے ذریعے دیگر دھاتوں سے جدا کیا جاتا ہے۔[۲]

سونا ایک ایسی نفیس اور عمدہ دھات ہے جس پر موسمی اثرات اور عام تیزابات اثر انداز نہیں ہوتے۔ اسے پگھلا کر پانی کی صورت میں تبدیل کرنے کے لیے ایکوا ریجیا (Aqua regia) کو استعمال کیا جاتا ہے جو دو مختلف نائٹرک ایسڈ (Nitric acid) اور ہائیڈروکلورک ایسڈ (Hydrochloric acid) کا مرکب ہوتا ہے۔[۳]

سونا تمام دھاتوں کے ساتھ مکس ہو جاتا ہے اور بعد ازاں ان سے جدا بھی کیا جا سکتا ہے۔ سونا اور دیگر دھاتوں کے مرکب کو تیز آگ میں پگھلایا جائے تو آہستہ، آہستہ سونے کے علاوہ دیگر تمام دھاتیں جل جاتی ہیں۔[۴] سونے کا ایٹمی وزن ۱۹۶.۹۶۶۵۷ ہے۔[۵] سونے کا ایٹمی نمبر ۷۹ ہے[۶]۔ اور اس کی کثافت ۱۹.۳۲ پر گرام کیوبک سینٹی میٹر / cubic centimeter ہے یعنی سونا پانی سے ۱۹.۳۲ گنا بھاری ہوتا ہے اور اس کی سپیسیفک (Specific) گریوٹی (Gravity) 19.32 ہے۔ سونا ۱۰۶۵ سینٹی گریڈ درجہ حرارت پر پگھلنے لگتا ہے یعنی اس کا میلٹنگ پوائنٹ (Melting Point) ۱۰۶۵ سینٹی گریڈ ہے اور اس کا بوائلنگ پوائنٹ (Boiling point) 2700 سینٹی گریڈ ہے۔[۷]

---

(۱) محمد رواس قلعجي، حامد صادق قنيبي، لغة الفقهاء، دار النفائس للطباعة والنشر والتوزيع: ص ۱۶۲

(2) Anderson, Dale (11 August 2009). Murder, Drugs, and Engineering. Lulu.com. ISBN 978-0-557-07786-

(۳) ایضاً۔

(۴) ایضاً۔

(5)Meija, J.; et al. (2016). "Atomic weights of the elements 2013 (IUPAC Technical Report)". Pure Appl. Chem. 88: 265–91. doi:10.1515/pac-2015-0305. Standard Atomic Weights 2013". Commission on Isotopic Abundances and Atomic Weights.

(6)Meija, J.; et al. (2016). "Atomic weights of the elements 2013 (IUPAC Technical Report)". Pure Appl. Chem. 88: 265–91. doi:10.1515/pac-2015-0305. Standard Atomic Weights 2013". Commission on Isotopic Abundances and Atomic Weights.

(7)Arblaster, J. W. (1995). "Osmium, the Densest Metal Known" . Platinum Metals Review. 39 : 164.

سونا اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ علم تاریخ کیونکہ تمام سماوی کتب میں اس کا ذکر موجود ہے۔ مختلف ممالک کے آثار قدیمہ اور تاریخی شواہد سے یہ بات ثابت ہے ۱۲۰۰ ق،م مصریوں نے سونے کا استعمال شروع کر دیا تھا اور بعض تاریخی حقائق اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ انسان نے تقریباً ۲۶۰۰ قبل مسیح سونا دریافت کر لیا تھا۔[۸]

اسی طرح مؤطا امام مالک کی ایک حدیث سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سب سے پہلے مصریوں نے سونے کا استعمال شروع کیا۔[۹]

سونا دنیا کے بہت سے ممالک میں پایا جاتا ہے جن میں اکثریت مسلم ممالک کی ہے اور ان میں پاکستان بھی شامل ہے۔ پاکستان کے صوبہ بلوچستان میں سونے کے وسیع ذخائر موجود ہیں تاھم ابھی تک ان کو نکالنے کا آغاز نہیں ہوا۔

سونا زمانہ قدیم میں زیورات، ملبوسات کی آرائش، برتن، آرائشی سامان، تاج و تخت، اسلحہ پر نقش و نگار کرنے، مورتیوں کو بنانے، بت بنانے اور ادویات بنانے کے کام آتا تھا، جبکہ دور جدید میں طب ایلو پیتھک اور ہومیو پیتھک طریقہ علاج میں دواؤں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور الیکٹرونکس پرزہ جات مثلاً گھڑیوں، موبائل فونز اور کمپیوٹر وغیرہ کی تیاری میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

ماضی قریب و بعید میں سونا بطور سکہ اور کرنسی استعمال کیا جاتا تھا اور مختلف ملکوں سے لین دین میں سونا ہی استعمال ہوتا تھا۔ دنیا کی قیمتی ترین دھات ہونے کی وجہ سے آج بھی بنک، ممالک اور حکومتیں اپنے اثاثہ جات میں سونے کی موجودگی کو یقینی بناتی ہیں۔

سونے کے استعمال کی ضرورت و اہمیت:

سونے کو بطور زیور، بطور زینت اور بطور ضرورت استعمال کرنے کی ضرورت و اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ زمین سے نکلنے والے انواع و اقسام کے خزانوں اور معدنیات و جواہرات میں سے سونے کو تمام پر فضیلت حاصل ہے۔ اللہ تعالی نے اس میں ایسی عمدگی اور پسندیدگی رکھی ہے کہ ہر خاص و عام کو محبوب ہے اور روز اول سے انسانی زندگی کے لیے جزو لاینفک کی حیثیت میں مستعمل ہے اور اس کا استعمال اقتصادیات کے استحکام کے ساتھ، ساتھ زیورات، زیبائش وآرائش کی مصنوعات، مخطوطات کی آرائش اور ادویات وغیرہ جیسی متعدد اشیاء میں کیا جاتا ہے۔ زیورات میں اس کے استعمال کا یہ عالم ہے

(8)Walter L. Pohl, Economic Geology Principles and Practice 2011, p208/Montserrat, Dominic (21 February 2003). Akhenaten: History, Fantasy and Ancient Egypt. ISBN 978-0-415-30186-2.

(۹)مالک بن أنس، المؤطا، الامارات، أبوظبی، مؤسسة زید بن سلطان آل نھیان. رقم حدیث:۳۱۴۱۔

کہ ہر درجہ اور ہر علاقے کا مرد و عورت سونے کے زیورات کو دیگر دھاتوں کے زیورات کے مقابلے میں زیادہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ قرآن کریم میں اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد باری تعالی ہے:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَآبِ﴾[۱۰]

"لوگوں کے لئے ان کی خواہشات کی محبت (خوب) آراستہ کر دی گئی ہے (جن میں) عورتیں، اولاد، سونے اور چاندی کے جمع کئے ہوئے خزانے اور نشان کئے ہوئے خوبصورت گھوڑے اور مویشی اور کھیتی (شامل ہیں)، یہ (سب) دنیوی زندگی کا سامان ہے، اور اللہ کے پاس بہتر ٹھکانا ہے۔"

سونے سے محبت اور پسندیدگی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ اس کو جمع کرنا، سنبھال کر رکھنا اور اسے خرچ نہ کرنا لوگوں کی عادت ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں اللہ تعالی نے لوگوں کی اس عادت پر سرزنش کرتے ہوئے کیا ہے:

﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾[۱۱]

"اور جو لوگ سونا اور چاندی کا ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انہیں دردناک عذاب کی خبر سنا دیں۔"

جنت نیکوکاروں کے رہنے کی ایسی جگہ ہے جس میں حسب مرتبہ و مقام لوگوں کو رکھا جائے گا اور لوگوں کو ان کے مقام و مرتبہ کے مطابق نعمتوں اور انعام و اکرام سے نوازا جائے گا، اس جنت میں اھل جنت کی شان و شوکت اور ان کے مقام و مرتبہ کو جہنمیوں پر ظاہر فرمانے کے لیے اھل جنت کو سونے کے زیورات پہنائے جائیں گے۔

قرآن پاک میں ارشاد باری تعالی ہے:

يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ[۱۲]

"انہیں ان جنتوں میں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔"

دوسرے مقام پر مزید ارشاد باری تعالی ہے:

---

(۱۰) آل عمران: ۱۴

(۱۱) التوبۃ: ۳۴۔

(۱۲) الکھف: ۳۱۔

يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا [13]

"انہیں ان جنتوں میں سونے اور موتیوں کے بنے کنگن پہنائے جائیں گے۔"

روز اول سے یہ دستور چلا آرہا ہے کہ لوگ جس کے پاس مال و دولت، ہیرے، جواہرات اور سونے، چاندی کے زیورات کا ڈھیر دیکھتے ہیں اسے معاشرہ کا وڈیرہ اور معزز سمجھتے ہیں اور اسی کے سر پر سرداری کا تاج سجاتے ہیں اور اسی کو اس کا لائق اور حق دار سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم مشرکین مکہ کے اسی نظریہ کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمارہا ہے:

﴿فَلَوْلَا أُلْقِيَ عَلَيْهِ أَسْوِرَةٌ مِنْ ذَهَبٍ﴾ [14]

"پھر (اگر یہ سچا رسول ہے تو) اس پر (پہننے کے لیے) سونے کے کنگن کیوں نہیں اتارے جاتے۔"

مرد کے لیے سونے کا بطور زیور استعمال:

ہمارے معاشرہ کے لوگ سونے کا زیور پہننے کو تزئین وآرائش کے ساتھ، ساتھ، امارت و بڑائی کے اظہار کا ذریعہ سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمارے ماحول و معاشرہ میں بہت سے مال دار زیور پہن کر اپنے مال دار ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ اسلام نے زیب وزینت اور تزئین وآرائش کی اجازت کو آزاد نہیں چھوڑا بلکہ اس حوالہ سے مرد وعورت کے لیے الگ، الگ احکام وشرائط اور حدود وقیود قائم کی ہیں تاکہ انسانی زندگی میں حقیقی حسن پیدا ہو اور اسلامی معاشرہ حسن وخوبی کا مظہر بن جائے۔

چنانچہ مرد کے لیے ہر قسم کا زیور مثلاً انگوٹھی، گلے کا لاکٹ، کنگن، کڑا، چھلا، گانی، پازیب، گھنگرو، ٹاپس، بریسلٹ، ہار، وری پر لگنے والے بیج اور سٹارز وغیرہ پہننا مطلقاً ناجائز وحرام ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے مردوں کو سونے کا زیور پہننے سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

عن عبد الله بن زرير قال سمعت على بن أبى طالب، يقول خرج علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم وفى احدى يديه ذهب وفى الأخرى حرير فقال هذان حرام على ذكور أمتى وحل لإناثها- [15]

---

(۱۳) الحج: ۲۳۔

(۱۴) الزخرف: ۵۳۔

حضرت عبد اللہ بن زریر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہوئے سنا کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہمارے پاس اس حال میں تشریف لائے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ایک ہاتھ میں سونا اور دوسرے ہاتھ میں ریشم تھا، آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا میری امت کے مردوں پر یہ دونوں حرام ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے:

نهى عن خاتم الذهب.[١٦]

رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے سونے کی انگوٹھی پہننے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا :

من مَاتَ من أمتِي هو يشرب الْخمر حرم الله عَلَيه شرابها، فِي الْجنَّة وَمن مَاتَ من أمتِي وَ هو يتحلى الذَّهب حرم الله عَلَيْه لِبَاسه فِي الْجنَّة[١٧]

میری امت میں سے جو شخص شراب پینے کی حالت میں فوت ہوا اللہ اس پر جنت کی شراب حرام کردے گا اور جو سونا پہنے ہوئے فوت ہوا اللہ اس پر جنت میں سونا پہننے کو حرام فرمادے گا۔

مذکورہ بالا احادیث کے عموم واطلاق کے پیش نظر جمہور متقدمین ومتاخرین علماء وفقہاء کا اس بات پر اتفاق و اجماع ہے کہ مرد کے لیے سونے کا ہر قسم کا زیور پہننا حرام ہے۔

چناچہ عبد اللہ بن مسعود، عبد اللہ بن الزبیر، انس بن مالک، علی بن ابی طالب، عبد اللہ بن عباس، عبد اللہ بن عمر، عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہم اور سعید بن جبیر، ابراھیم النخعی، سفیان الثوری، امام الاوزاعی، علقمۃ، مکحول، امام اعظم ابو حنیفۃ اور آپ کے اصحاب، امام مالک، امام الشافعی، امام احمد بن حنبل، امام اسحاق، ابن تیمیۃ، ابوداؤد الظاہری، ابن

(١٥) النسائی(م ٣٠٣ھ) احمد بن شعیب بن علي، ابوعبد الرحمن، الخراسانی، السنن، حلب، مکتب المطبوعات الاسلامیہ / حدیث: ٥١٤١۔ سنن ابن ماجہ / حدیث: ٣٥٩٥۔

(١٦) بخاری (م ٢٥٦ھ) محمد بن اسماعیل، الجامع المسند الصحیح، دار طوق النجاۃ / حدیث: ٥٨٦٤۔ القشیری (م ٢٦١ھ) مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشيري النيسابوري، المسند الصحیح مسلم، دار إحياء التراث العربي، بیروت / حدیث: ٢٠٨٩۔

(١٧) الشیبانی (م ٢٤١ھ) احمد بن محمد بن حنبل بن ھلال، ابوعبد اللہ، مسند، القاھرۃ، دار الحدیث / حدیث: ٦٩٤٨۔

حزم،[۱۸] وغیرھم کے نزدیک مرد کے لیے ہر قسم کا سونے کا زیور پہننا حرام ہے۔فقہائے احناف میں سے امام محمد نے "الجامع الصغیر" میں[۱۹]،امام السرخسی نے "المبسوط" میں[۲۰]،علامہ کاسانی نے "بدائع الصنائع" میں[۲۱]،علامہ مرغیانی نے "الھدایۃ" میں[۲۲]،علامہ الحدادی نے "الجوھرۃ النیرۃ" میں[۲۳]،ابن ھمام نے "فتح القدیر" میں[۲۴]،ابن نجیم نے "بحر الرائق" میں[۲۵]، شیخ زادہ نے "مجمع الانھر" میں[۲۶]،علامہ شامی نے "ردالمحتار" میں[۲۷]، اس پر نص فرمائی ہے کہ مرد کے لیے سونے کا زیور پہننا حرام ہے۔

اسی طرح فقہائے مالکیۃ میں سے،علامہ الدسوقی المالکی[۲۸]، شیخ الدردیر المالکی[۲۹]،علامہ الرعینی المالکی[۳۰]،علامہ الخرشی المالکی[۳۱]،علامہ الزرقانی المالکی[۳۲]،علامہ المواق المالکی[۳۳] نے لکھا کہ مرد کے لیے سونے کا زیور پہننا حرام ہے۔

---

(۱۸)العینی(م۸۵۵ھ)، محمود بن احمد بن موسی، بدر الدین، الحنفی، نخب الافکار فی تنقیح مبانی الاخبار فی شرح معانی الآثار، قطر، وزارۃ الاوقاف والشون السلامیہ/۱۳:۳۴۲۔

(۱۹)الشیبانی(م۱۸۹ھ)، محمد بن الحسن، امام، ابوعبد اللہ، الجامع الصغیر، بیروت، عالم الکتب/۱:۴۷۷۔

(۲۰)السرخسی(م۴۸۳ھ)، محمد بن احمد بن ابی سھل، شمس الائمۃ، المبسوط، بیروت، دار المعرفۃ/۹:۲۹۔

(۲۱)الکاسانی(م۵۸۷ھ)، اَبو بکر بن مسعود بن احمد، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، دار الکتب العلمیۃ/۵:۱۳۲۔

(۲۲)المرغینانی(م۵۹۳ھ)، علی بن ابی بکر، الھدایۃ فی شرح بدایۃ المبتدی، پاکستان، کراچی، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ/۷:۱۸۳۔

(۲۳)الحدادی(م۸۰۰ھ)، ابو بکر بن علی بن محمد، الحنفی، الیمنی، الجوھرۃ النیرۃ، المطبعۃ الخیریۃ/۲:۲۸۱۔

(۲۴)ابن ھمام(م۸۶۱ھ)، محمد بن عبد الواحد، فتح القدیر، بالمطبعۃ الکبری الامیریۃ/۸:۹۵۔

(۲۵)ابن نجیم(م۹۷۰ھ)، زین الدین بن اِبراھیم بن محمد، بحر الرائق شرح کنزالدقائق، لبنان، بیروت، دار الکتب العلمیۃ/۸:۳۵۰۔

(۲۶)شیخ زادہ(م۱۰۷۸ھ)، عبد الرحمن بن محمد بن سلیمان، مجمع الانھر فی شرح ملتقی الابحر، لبنان، بیروت، دار الکتب العلمیۃ/۴:۱۹۶۔

(۲۷)ابن عابدین(م۱۲۵۲)، محمد اَمین بن عمر، ردالمحتار علی الدرالمختار، دار الفکر، بیروت/۹:۵۱۷۔

(۲۸)الدسوقی(م۱۲۳۰ھ)، المالکی، محمد بن اَحمد بن عرفۃ، حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر، دار الفکر/۱:۶۳۔

(۲۹)الدردیر، الشیخ، احمد، العدوی، الشرح الکبیر، بداراحیاء الکتب العربیۃ/۱:۱۹۰۔

(۳۰)الرعینی(م۹۵۴ھ)، محمد بن محمد بن عبد الرحمن، مواھب الجلیل فی شرح مختصر خلیل، دارالرضوان/۱:۱۹۰۔

(۳۱)الخرشی(م۱۱۰۱ھ)، المالکی، محمد بن عبد اللہ، شرح مختصر خلیل، بالمطبعۃ الکبری الامیریۃ/۱:۹۸۔

(۳۲)الزرقانی(م۱۰۹۹ھ)، عبد الباقی بن یوسف بن احمد، شرح الزّرقانی علی مختصر خلیل، لبنان، بیروت، دار الکتب العلمیۃ/۶۴:

(۳۳)المواق(م۸۹۷ھ)، المالکی، محمد بن یوسف بن اَبی القاسم بن یوسف، التاج والاکلیل لمختصر خلیل، دار الکتب العلمیۃ/۱:۱۸۱۔

اسی طرح علامہ الحاجۃ کوکب عبید[۳۴]، علامہ محمد العربی القروی[۳۵]، شیخ ابن العربیالمالکی[۳۶] وغیرھم نے بھی یہی لکھا ہے کہ مرد کے لیے سونے کا زیور پہننا حرام ہے۔

فقہائے شوافع میں سے، ابو اسحاق الشیرازی نے "المھذب فی فقہ الامام الشافعی" میں[۳۷]، امام نووی نے "المجموع شرح المھذب" میں[۳۸]، علامہ الرملی نے "نھایۃ المحتاج الی شرح المنھاج" میں[۳۹]، الماوردی نے "فی فقہ مذھب الامام الشافعی" میں[۴۰] اور فقہائے حنابلہ میں سے ابن قدامہ حنبلی نے "المغنی" میں[۴۱]، ابن تیمیۃ نے "شرح العمدۃ فی الفقہ" میں[۴۲] اس بات پر تصریح فرمائی ہے کہ مرد کے لیے سونے کے زیور کا استعمال مطلقا جائز نہیں ہے چاہے اس کی مقدار تھوڑی ہو یا زیادہ۔

الغرض فقہائے امت کی مذکورہ بالا تصریحات کے پیش نظر امام نووی نے مرد کے لیے سونے کے زیور کے استعمال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

أجمع العلماء على تحريم استعمال حلى الذهب على الرجال۔[۴۳]

مرد پر سونے کے زیور کے حرام ہونے پر علماء کا اجماع ہے۔

امام ابن تیمیہ نے لکھا کہ:

فيحرم على الرجل ان يتحلى بالذهب المفرد كالخاتم والسوار۔[۴۴]

---

(۳۴)الحاجّۃ، کوکب عبید، فقہ العبادات علی المذھب المالکی، مطبعۃ الانشاء/۱:۴۵۔

(۳۵)محمد العربی، القروی، الخلاصۃ الفقھیۃ علی مذھب السادۃ المالکیۃ، لبنان، بیروت، دار الکتب العلمیۃ/۱:۲۹۳۔

(۳۶)ابن العربی(م ۵۴۳ھ)، محمد بن عبد اللہ ابو بکر بن العربی، احکام القرآن، لبنان، بیروت، دار الکتب العلمیۃ/۴:۱۱۵۔

(۳۷)الشیرازی(م ۴۷۶ھ)، ابراھیم بن علی بن یوسف، ابو اسحاق، المھذب فی فقہ الامام الشافعی، دمشق، دار القلم/۱:۳۵۵۔

(۳۸)النووی(م ۶۷۶ھ)، محی الدین یحیی بن شرف، ابو زکریا، المجموع شرح المھذب، السعودیۃ، جدہ، مکتبۃ الارشاد/۵:۵۲۱۔

(۳۹)الرملی(م ۱۰۰۴ھ)، محمد بن ابی العباس احمد بن حمزۃ، شمس الدین، نھایۃ المحتاج الی شرح المنھاج، بیروت، دار الکتب العلمیۃ/۳:۹۱۔

(۴۰)الماوردی(م ۴۵۰ھ)، علی بن محمد، بن محمد، الحاوی الکبیر، فی فقہ مذھب الامام الشافعی، دار الکتب العلمیۃ/۲:۴۷۹۔

(۴۱)ابن قدامۃ(م ۶۲۰ھ)، عبد اللہ بن احمد بن محمد بن قدامۃ، الحنبلی، الدمشقی، المغنی، مکتبۃ القاھرۃ/۱:۵۷۔

(۴۲)ابن تیمیۃ(م ۷۲۷ھ)، احمد بن عبد الحلیم بن تیمیۃ، شرح العمدۃ فی الفقہ، الریاض، دار عالم الفوائد/۲:۲۸۷۔

(۴۳)المجموع شرح المھذب/۴:۴۱۴۔

مرد پر خالص سونے کی انگوٹھی اور کنگن وغیرہ کا زیور پہننا حرام ہے۔

شیخ عبد اللہ بن باز لکھتے ہیں:

الذهب كله حرام على الرجال-[45]

مردوں پر سونے کا ہر قسم کا استعمال حرام ہے۔

الموسوعة الفقهية الكويتية حاصل ہے:

يحرم على الرجل اتخاذ حلى الذهب بجميع أشكالها-[46]

مرد پر سونے کا ہر قسم و شکل کا زیور پہننا حرام ہے۔

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

يحرم على الرجال لبس الحرير والتختم بالذهب-[47]

مردوں پر ریشم اور سونے کی انگوٹھی پہننا حرام ہے۔

الغرض اس بات پر جمہور علمائے امت وفقہائے امت کا اجماع واتفاق ہے کہ مرد پر ہر قسم کا سونے کا زیور پہننا حرام ہے۔ البتہ بعض صحابہ مثلا "برا ابن عازب، حذیفۃ بن یمان، سعد، جابر بن سمرۃ، انس ابن مالک"، رضی اللہ عنہم وغیر ھم سے مرد کے لیے سونے کا زیور پہنے کا جواز بھی ثابت ہے لیکن جمہور ائمہ و مجتہدین اس بات پر متفق ہیں کہ ایسی تمام احادیث منسوخ ہیں۔ مرد کے لیے سونے کا زیور پہننے کے جواز پر دلالت کرنے والی احادیث پر تبصرہ کرتے ہوئے امام ابو جعفر الطحاوی نے لکھا:

فثبت أن ما فيه تحريم لبسها والناسخ لما فيه إباحة لبسها.[48]

---

(۴۴) شرح العمدۃ فی الفقہ / ۳۰۹:۴۔

(۴۵) ابن باز (م ۱۴۲۰ھ)، عبد العزیز بن عبد اللہ، مسائل الامام ابن باز، السعودیۃ، الریاض، دار التدمریہ / ۲۲۲:۱۔

(۴۶) الموسوعۃ الفقھیۃ الکویتیۃ، الکویت / ۱۰۹:۱۸۔

(۴۷) الزحیلی، وھبہ بن مصطفی، الفقہ الاسلامی وادلتہ، دار الفکر، دمشق / ۵۴۷:۳۔

(۴۸) الطحاوی (م ۳۲۱ھ)، احمد بن محمد بن سلامۃ بن عبد الملک، ابو جعفر، شرح معانی الآثار، عالم الکتب / ۲۶۲:۴۔

پس ثابت ہوا کہ ایسی تمام احادیث جن میں مرد کے لیے سونے کا زیور پہننے کی حرمت آئی ہے ناسخ ہیں ان تمام احادیث کی جن میں پہننے کی اباحت کا ذکر ہے۔

علامہ بدرالدین، العینی لکھتے ہیں :

احتج به من يذهب إلى إباحة خاتم الذهب منسوخ؛ لأن الأصل فى الأشياء الإباحة، والحظر بعدها۔[۴۹]

مرد کے لیے سونے کی انگوٹھی کے جواز پر دلالت کرنے والی تمام احادیث منسوخ ہیں اس لیے کہ چیزوں میں اصلا اباحت ہوتی ہے اور چیز کے استعمال سے روکنا بعد میں ہوتا ہے۔

الغرض یہ کہ مرد کے لیے سونے کا زیور پہننے کی حرمت پر تمام فقہائے امت کا اجماع ہے لھذا کسی بھی مرد کے لیے چاہے وہ بالغ ہو یا نابالغ کسی بھی قسم کا سونے کا زیور پہننا جائز نہیں ہے۔

عورت کے لیے سونے کا بطور زیور استعمال:

علمائے امت و فقہائے امت کا اس بات پر اجماع واتفاق ہے کہ عورت کے لیے سونے کا ہر قسم کا زیور ر مثلاً انگوٹھی، گلے کا لاکٹ، کنگن، کڑا، چھلا، گانی، پازیب، گھنگرو، بالی، بریسلٹ، ہار، وردی پر لگائے جانے والے بیج اور سٹارز پہننا مطلقا جائز ہے کیونکہ قرآن کریم اور رسول کریم ﷺ نے اس پر نص فرمائی ہے۔ آثار صحابہ اور اقوال ائمہ و مجتہدین سے یہی ثابت ہے اور امت مسلمہ کا تواتر و توارث بھی یہی ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے:

هُوَ الَّذِى خَلَقَ لَكُمْ مَا فِى الْأَرْضِ جَمِيعًا۔[۵۰]

وہ ذات جس نے تمہارے لیے وہ سب پیدا فرمایا جو کچھ زمین میں ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالی ہے:

أَوَ مَنْ يُنَشَّأُ فِى الْحِلْيَةِ۔[۵۱]

---

(۴۹) نخب الافکار شرح معانی الآثار / ۱۳: ۳۴۹۔

(۵۰) البقرة: ۲۹۔

(۵۱) الزخرف: ۱۸۔

یاوہ جو زیور میں پرورش پائے۔

حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

أحل الذهب والحرير لأناث أمتي وحرم على ذكورها۔[52]

میری امت کی عورتوں کے لیے سونااور ریشم حلال کیا گیا ہے اور میری امت کے مردوں پر سونااور ریشم حرام کر دیا گیا ہے۔

ام المؤمنین حضرت عائشۃ صدیقۃ رضی اللہ عنہا کہا کہ: نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں نجاشی کی طرف سے سونے کی انگوٹھی ہدیہ کی گئی جس میں حبشی نگینہ لگا ہوا تھا نبی کریم ﷺ نے اسے کسی لکڑی یا انگلی کے بعض حصہ سے پکڑا اور امامہ بنت ابی العاص کو بلوا کر فرمایا:

تحلى بهذا يا بنية۔[53]

اے بیٹی اس سے زینت اختیار کر۔

ام المؤمنین حضرت عائشۃ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے عمل سے بھی عورتوں کے لیے سونے کا زیور پہننے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔امام ابویسف نے کتاب الآثار میں ام المؤمنین حضرت عائشۃ رضی اللہ عنہا سے مندرجہ ذیل الفاظ میں روایت بیان کی ہے:

إنها كانت تحلى بنات أخيهاالذهب۔[54]

ام المؤمنین حضرت عائشۃ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنے بھائیوں کی بیٹیوں کو سونے کا زیور پہنایا کرتی تھیں۔

اسی طرح امام ابو یوسف نے کتاب الآثار میں ہے:

كان يحلى بناته الذهب۔[55]

---

(۵۲)مسند احمد / حدیث:۱۹۵۰۳۔ سنن النسائی / حدیث:۵۱۴۸۔ السنن للبیقی / حدیث:۴۲۲۰۔
البغوی(م۵۱۶ھ)، الحسین بن مسعود بن محمد بن الفراء، شرح السنۃ، بیروت، المکتب الاسلامی / حدیث:۳۱۰۸۔

(۵۳)سنن ابی داؤد / حدیث:۴۲۳۵۔

(۵۴)ابویوسف(م۱۸۲ھ)، یعقوب بن ابراھیم، امام، کتاب الآثار، بیروت، دار الکتب العلمیۃ / حدیث:۱۰۱۹۔

(۵۵)ایضا/ حدیث:۱۰۲۱۔

حضرت ابن عمر اپنی بیٹیوں کو سونے کا زیور پہنایا کرتے تھے۔

امام، الزیلعی نے نصب الرایۃ لاحادیث الھدایۃ میں حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے کہا کہ:

إنها كانت تحلى بناتها الذهب۔[٥٦]

حضرت اسماء بنت بکر اپنی بیٹیوں کو سونے کا زیور پہنایا کرتی تھیں۔

ابن حجر عسقلانی نے حضرت زینب بنت نبیط بن جابر سے روایت بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

أوصى أبو أمامة أسعد بن زرارة ﷺ إلى رسول الله ﷺ بامي وخالتي فأتاه حلي فيه ذهب ولؤلؤ يقال له الرعاث فحلاهن رسول الله ﷺ من تلک الرعاث فأدركت ذالك الحلي عند أهلي۔[٥٧]

حضرت ابو امامۃ اسعد بن زرارۃ رضی اللہ نے میری ماں اور میری خالہ کو سونے اور موتیوں سے بنا ایسا زیور دے کر رسول کریم ﷺ کی بارگاہ میں بھیجا جسے "الرعاث" (یعنی بالیاں) کہا جاتا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے ان بالیوں کا پہننا ان کے لیے حلال قرار دیا تو میں نے اس زیور کو اپنے گھر والوں سے لے لیا۔

تابعین میں سے حضرات ابو عالیۃ اور مجاہد کا موقف بھی یہی ہے کہ عورت کو ہر قسم کا سونے کا زیور پہننے کی اجازت ہے۔[٥٨]

رہا یہ کہ وہ تمام احادیث جن سے عورتوں کے سونے کا زیور پہننے کی کراہیت وناپسندیگی ظاہر ہوتی ہے وہ تمام کی تمام منسوخ ہیں اور ان میں سے کوئی حدیث بھی قابل عمل نہیں ہے اور ان احادیث کے منسوخ اور ناقابل عمل ہونے پر کئی ایک دلائل موجود ہیں۔ علامہ الصنعانی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

قد ذكر جماعة من أهل العلم أنَّ أحاديث تحريم الذهب على النساء منسوخة۔[٥٩]

---

(٥٦) الزیلعی (م ٧٦٢ھ)، عبد اللہ بن یوسف بن محمد، نصب الرایۃ تخ / حدیث: ٣٤٦٥۔

(٥٧) العسقلانی (م ٨٥٢ھ)، ابن حجر، احمد بن علی بن محمد، المطالب العالیۃ بزوائد المسانید الثمانیۃ / حدیث: ٢٥٥٤۔

(٥٨) احکام القرآن للجصاص / ٥: ٢٦٤۔

(٥٩) الصنعانی (م ١٢٧٦ھ)، الحسن بن احمد بن محمد، فتح الغفار الجامع لاحکام سنۃ نبینا المختار / حدیث: ٨٦٩۔

علماء کی ایک جماعت نے بیان کیا ہے کہ ایسی تمام احادیث جن میں عورتوں کے لیے سونے کا زیور پہننے کی حرمت آئی ہے منسوخ ہیں۔

امام ابو بکر الرازی، الجصاص، الحنفی نے عورتوں کے سونے کا زیور پہننے کے جواز پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ: عورتوں کے سونے کا زیور پہننے کے جواز پر دلالت کرنے والی احادیث وآثار منع کرنے والی احادیث سے زیادہ مشہور اور زیادہ ظاہر ہیں اور آیت مبارکہ "اَوَ مَنۡ یُنَشَّأُ فِی الۡحِلۡیَةِ "کا ظاہر بھی عورتوں کے لیے سونے کا زیور پہننے کے جواز پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی اس پر دلالت کرتی ہے کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانہ مبارک سے لیکر آج تک کوئی بھی اس کا انکاری نہیں ہے اور مزید یہ کہ اس قسم کی اخبار احاد کے ذریعہ قرآن کے ظاہر پر عمل کرنے پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔[٦٠]

الموسوعة الفقهية الكويتية میں ہے:

أجمع الفقهاء على جواز اتخاذ المرأة أنواع حلى الذهب والفضة جميعا۔[٦١]

"عورت کے ہر قسم کا سونے وچاندی کا زیور پہننے کے جواز پر فقہاء کا اجماع ہے۔"

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

يحل للنساء اللبس والتختم مطلقاً والتحلى بالحلى من الذهب والفضة۔[٦٢]

"عورتوں کے لیے سونے وچاندی کا زیور اور انگوٹھی وغیرہ پہننا مطلقا جائز ہے۔"

علامہ محمد بن ابراہیم بن عبد اللہ التویجری لکھتے ہیں:

فيباح للمرأة أن تلبس من الحلى ما شاءت بلا إسراف ولا مباهاة سواء كان من الذهب أو الفضة أو اللؤلؤ أو الألماس ونحو ذلك۔[٦٣]

---

(٦٠) احکام القرآن للجصاص / ٥:٢٦٤۔

(٦١) الموسوعة الفقهية الكويتية / ١٨:١١١۔

(٦٢) الفقہ الاسلامی وادلتہ / ٣:٥٤٨۔

(٦٣) موسوعہ الفقہ الاسلامی / ٤:٨٩۔

عورت کے لیے اسراف ومباہات کے بغیر ہر قسم کا زیور پہننا جائز ہے عام ازیں کہ وہ سونے کا ہو یا چاندی کا یا موتیوں یا الماس کا ہو۔

الفقہ علی المذہب الاربعۃ میں ہے:

فلها أن تتحلى بما شاءت من الذهب والفضة۔[٦٤]

"عورت کے لیے سونے وچاندی کے ہر قسم کے زیور سے آراستہ ہونا جائز ہے۔"

سونے کا بطور زینت استعمال:

سونے کا بطورزینت استعمال متعدد اور کثیر چیزوں، مثلا سونے کے برتن،(مثلاپلیٹ، چمچ، گلاس وغیرہ)، ڈیکوریشن پیس، بٹن ، تلوار کا دستہ، کپڑے کا باڈر، سرمہ دانی، سرمہ دانی کی سلائی، تیل دانی، خوشبو دانی، چشمہ ، قلم ، دوات، عینک، سواری کی زین، تخت، چارپائی، بیڈ، کرسی، میز، تلوار کا حلقہ، آئینہ کا حلقہ، سونے کا قرآن، لگام، رکاب، غلاف کعبہ، مسجد کے نقش ونگار، چھری، چاقو، آلات جنگ مثلا نیزہ، تیر، کمان، گھڑی، وردی پر لگنے والے بیج، گولڈ میڈل وغیرہ میں کیا جاتا ہے۔

سونے سے بنی اشیاء کے بطور زینت استعمال کا شرعی حکم:

سونے سے بنی اشیاء مثلاً سونے کے برتن ، سرمہ دانی، سرمہ دانی کی سلائی، تیل دانی ،خوشبو دانی ،لوٹا ،چشمہ ،عینک، قلم، دوات، تخت، چارپائی، بیڈ، کرسی، میز، تلوار، آئینہ کا حلقہ ،لگام ، چھری ، چاقو ، آلات جنگ ،مثلا نیزہ، تیر، تیر کمان، تلوار کا دستہ، کمربند، زین، رکاب، خالص سونے کی بنی گھڑی، وردی پر لگنے والے سونے کے بیج، گولڈ میڈل، سونے کا تاج وغیرہ کا استعمال مرد وعورت، بالغ ونابالغ سب کے لیے ناجائز وحرام ہے۔

ہاں اگر مذکورہ بالا چیزیں محض گھر کی سجاوٹ اور ڈیکوریشن کے لیے ہوں تو احناف اور مالکیہ کے نزدیک گھر کی سجاوٹ اور تزئین و آرائش کے لیے ان کا گھر میں رکھنا جائز ہے بشرطیکہ استعمال میں نہ لائی جائیں جبکہ شوافع وحنابلہ کے نزدیک سونے سے بنی اشیاء سے گھر کی تزئین و آرائش جائز نہیں ہے بلکہ ان کے ہاں یہ اسراف ہے اور اسراف حرام ہے۔ ایسے ہی عورتوں کے لیے مکمل طور پر سونے سے مزین ہر قسم کے ملبوسات پہننا جائز ہے جبکہ مردوں کے لیے

---

(٦٤) الجزیری (م ١٣٦٠ھ)، عبد الرحمن بن محمد عوض، الفقہ علی المذاہب الاربعہ، لبنان، بیروت، دار الکتب العلمیۃ/ ١٨:٢۔

قمیص، شلوار، کرتہ، تہبند، جبہ، عمامہ، ٹوپی وغیرہ پر صرف چار انگل کی مقدار تک سونے سے مزین لباس پہننا اور قمیص پر سونے کے بٹن لگانا جائز ہے اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لا تلبسوا الحرير ولا الديباج، ولا تشربوا فى آنية الذهب والفضة، ولا تأكلوا في صحافها۔[٦٥]

ریشم اور دیباج نہ پہنو اور نہ سونے، چاندی کے برتنوں میں پیو اور نہ ان کی پلیٹوں میں کھاؤ۔

مذکورہ بالا حدیث کے پیش نظر ائمہ اربعہ کا اس پر اجماع واتفاق ہے کہ سونے کو بطور زینت استعمال کرنے سے شارع علیہ السلام نے منع فرمایا ہے۔

عمدۃ القاری میں ہے:

قال أصحابنا لايجوز استعماله آنية الذهب والفضة للرجال والنساء لما فى حديث حذيفة عند الجماعة: ولاتشربوا في آنية الذهب والفضة ولا تاكلوا فى صحافها قالوا وعلى هذا المجمرة والملعقة والمدهن والميل والميل والمكحلة والمرآة ونحو ذلك فيستوى في ذلک الرجال والنساء لعموم النهي وعليه الإجماع۔[٦٦]

ہمارے اصحاب نے کہا کہ مرد وعورت کے لیے سونے وچاندی کے برتنوں کا استعمال جائز نہیں ہے کیونکہ جماعت صحابہ سے مروی حدیث حذیفہ میں ہے سونے وچاندی کے برتنوں میں نہ پیو اور سونے وچاندی کے پیالوں میں مت کھاؤ۔ علماء نے اسی حدیث پر قیاس کرتے ہوئے کہا کہ انگیٹھی، چمچہ، تیل کی بوتل، سلائی، سرمہ دانی، شیشہ وغیرہ کا استعمال جائز نہیں ہے۔ پس نہی کے عموم کی وجہ سے اس حکم میں مرد وعورت سب شامل ہیں اور اس پر اجماع ہے۔

ملا علی القاری لکھتے ہیں:

قال النووي: أجمعوا على تحريم الأكل والشرب فى إناء الذهب والفضة على الرجل والمرأة----- فيحرم استعماله ما فى الأكل والشرب والطهارة والأكل بالملعقة من أحدها و لتجمر بمجمرته والبول فى الاناء وسائر استعماله ما سواء كان صغيرا أو كبيرا۔[٦٧]

---

(٦٥) صحیح مسلم / حدیث: ٢٠٦٧۔

(٦٦) العینی (م ٨٥٥ھ)، محمود بن احمد، بدر الدین، ابی محمود، عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، دار الفکر / ١١:٨۔

(٦٧) القاری (م ١٠١٤ھ)، علی بن سلطان محمد، مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح، لبنان، بیروت، دار الکتب العلمیۃ / ١٦٨:٨۔

امام نووی نے کہا کہ؛مرد وعورت کے لیے سونے وچاندی کے برتنوں میں کھانے،پینے کے حرام ہونے پر اجماع ہے۔۔۔سونے و چاندی کے برتن میں کھانے،پینے،طہارت حاصل کرنے،سونے وچاندی کا چمچ استعمال کرنے،سونے وچاندی کی انگیٹھی کے استعمال کرنے،سونے وچاندی کے برتن میں پیشاب کرنااور دیگر ہر قسم کا استعمال چھوٹے،بڑے سب کے لیے حرام ہے۔

سونے کی بنی اشیاء سے درودیوار کی تزئین وآرائش:

سونے سے بنی اشیاء کے ذریعہ گھر کے درودیوار کی سجاوٹ اور تزئین و آرائش کرنے میں علمائے کرام وفقہائے اسلام کے مابین اختلاف ہے۔

احناف میں سے امام قاضی خان نے کہا کہ سونے کی بنی اشیاء سے گھروں کی تزیین و آرائش جائز ہے اورابن عابدین شامی نے کہا کہ اگر تفاخر کا ارادہ نہ ہو تو سونے وچاندی کی بنی اشیاء سے گھروں کی تزیین و آرائش جائز ہے اور مالکیہ میں سے علامہ الدسوقی نے کہا کہ سونے و چاندی کی بنی اشیاء سے گھروں کی تزیین و آرائش مطلقا جائز ہے جبکہ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک سونے کی بنی اشیاء سے گھروں کی تزیین و آرائش کرنا جائز نہیں ہے۔

ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

ووضع أواني الذهب والفضة بلا استعمال جائز إذا لم يقصد به التفاخر۔[٦٨]

سونے اور چاندی کے برتنوں کو استعمال کیے بغیر (محض گھر کی سجاوٹ کے طور پر) گھر میں رکھنا جائز ہے بشرطیکہ تفاخر کا ارادہ نہ ہو۔

علامہ الدسوقی مالکی لکھتے ہیں:

تزويق الحيطان والسقف والخشب والساتر بالذهب والفضة جائز في البيوت۔[٦٩]

دیواروں اور چھت کو سونے وچاندی اور پردوں اور لکڑی کے ذریعہ تزیین و آرائش کرنا جائز ہے۔

علامہ الرملی الشافعی لکھتے ہیں:

---

(٦٨)ردالمحتار/١٩:٥١١۔

(٦٩)حاشیۃ الدسوقی/١:٦٥۔

يكره تزيين البيوت للرجال وغيرهم حتى مشاهد الصلحاء و العلماء بالثياب ويحرم تزيينها بالحرير والصور لعموم الاخبار۔[۷۰]

مردوں کے لیے گھروں کی تزیین و آرائش کرنا مکروہ ہے حتی کہ کپڑوں کے ذریعہ علماء اور صلحاء کے مزارات کا ڈھاپنا بھی مکروہ ہے۔ریشم اور تصویروں سے گھروں کی تزیین و آرائش کرنا احادیث کے عموم کی وجہ سے مکروہ ہے۔

الموسوعة الفقهية الكويتية میں ہے:

يكره تزويق البيوت عند الحنابلة بالستور ما لم يكن لحاجة ويحرم عندهم تزيينها بالديباج والحرير وآنية الذهب والفضة والمموه بها قليلا كان أو كثيرا وبصور الحيوانات۔[۷۱]

حنابلہ کے نزدیک ضرورت نہ ہو تو پردوں کے ساتھ گھروں کو سجانا مکروہ ہے اور ان کے نزدیک دیباج، ریشم، سونے وچاندی کے برتنوں اور سونے و چاندی کا پانی چڑھی ہوئی چیزوں اور حیوانات کی تصویروں سے گھروں کی تزیین و آرائش کرنا حرام ہے چاہے قلیل ہو یا کثیر۔

سونے سے بنی اشیاء تزیین و آرائش میں مقالہ نگار کا موقف:

ابن عابدین شامی حنفی اور علامہ الدسوقی مالکی نے سونے کی بنی اشیاء سے گھروں کی تزیین و آرائش کو جائز قرار دیا جبکہ شوافع و حنابلہ نے اسے ناجائز و حرام قرار دیا۔رہا یہ کہ ائمہ و مجتہدین کے اس اختلاف میں صائب اور درست رائے کس کی ہے تو مجھے اس مقام پر ائمہ شوافع و حنابلہ کی رائے زیادہ صائب اور درست دکھائی دیتی ہے کیونکہ احناف و مالکیہ نے بھی سونے سے بنی اشیاء سے گھروں کی تزیین وآرائش مطلقا جائز قرار نہیں دیا بلکہ بلا تفاخر کی قید کے ساتھ جائز قرار دیا تو آج جب ہم عالم اسلام کے امراء کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں تو اکثریت کی زندگیوں میں تفاخر کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا، عالم اسلام کے امراء کی اکثریت کا بڑے اور عالی شان محلات میں رہنا، مہنگی گاڑیوں میں سفر کرنا اور سادگی اور قناعت نہ ہونا یہ، سب تفاخر کی علامت ہے اور تفاخر کے ارادہ سے سونے سے بنی اشیاء سے گھروں کی تزیین و آرائش احناف و مالکیہ کے نزدیک بھی ناجائز و حرام ہے تو حاصل کلام یہ ہوا کہ فی زمانہ تمام ائمہ و مجتہدین کے نزدیک سونے سے بنی اشیاء سے گھروں کی تزیین و آرائش ناجائز و حرام ہے۔

---

(۷۰) نهاية المحتاج إلى شرح المنهاج، ۲:۳۸۱۔

(۷۱) الموسوعة الفقهية الكويتية، ۱۱:۲۷۵۔

سونے سے بنی اشیاء سے گھروں کی تزیین و آرائش کے ناجائز و حرام ہونے کی دوسری وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اس میں مال کا ضیاء و اسراف ہے جو کہ حرام ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۝ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا﴾[۷۲]

اور رشتے داروں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرتے رہو اور اسراف اور بے جا خرچ سے بچو، بیشک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔

سونے کے بٹن کا استعمال:

قمیص، کرتا، جبہ، ویسکوٹ وغیرہ میں سونے کے بٹن لگا کر پہننے کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں فقہائے کرام کا آپس میں اختلاف ہے۔ مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک مرد کے لیے حالت اضطرار کے علاوہ سونے کا ہر قسم کا استعمال مطلقا ناجائز و حرام ہے جس کا معنی یہ ہے کہ ان کے نزدیک مرد کے لیے قمیص، کرتہ وغیرہ میں بھی سونے کے بٹن کا استعمال جائز نہیں ہے جبکہ ان کے نزدیک عورت کے لیے ہر قسم کے زیور اور زینت کے لیے سونے کا استعمال مطلقا جائز ہے جس کا معنی یہ ہے کہ ان کے نزدیک عورت کے لیے سونے کے بٹن کا استعمال جائز ہے۔

جبکہ احناف کے نزدیک عورت کے لیے ہر قسم کے زیور اور زینت کے لیے سونے کا استعمال جائز ہے اور مرد کے لیے صرف قمیص، ویسکوٹ وغیرہ میں سونے کے بٹن لگا کر استعمال کرنا اور پہننا جائز ہے۔

سونے کے بٹن لگانے میں مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کے دلائل:

ائمہ ثلاثہ یعنی مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک مرد کے لیے سونے کا بطور زیور و زینت ہر قسم کا استعمال ناجائز و حرام ہے جبکہ ان کے نزدیک عورت کے لیے سونے کا ہر قسم کا استعمال جائز ہے جس پر انہوں نے مندرجہ ذیل دلائل پیش کیے ہیں۔

سنن ابوداؤد میں ہے:

عن علی بن أبی طالب یقول ان نبی اللہ ﷺأخذ حریرا فجعله فی یمینه وأخذ ذهبا فجعله فی شماله ثم قال إن هذین حرام علی ذکور أمتی۔[۷۳]

---

(۷۲)الإسراء:۲۶۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ریشم کو اپنے دائیں ہاتھ میں اور سونے کو اپنے بائیں ہاتھ میں لے کر فرمایا: بیشک یہ دونوں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں۔

مسند امام احمد میں ہے:

عن أبی موسی قال رفع رسول الله صلی الله علیه وسلم حریرا بیمینه وذهبا بشماله فقال أحل لاناث أمتی وحرم علی ذکورها۔[٧٤]

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے اپنے دائیں ہاتھ میں ریشم اور بائیں ہاتھ میں سونا لیکر فرمایا میری امت کی عورتوں کے لیے حلال ہے اور میری امت کے مردوں پر حرام ہے۔

ائمہ ثلاثہ نے مندرجہ بالا احادیث سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ مرد کے لیے سونے سے بنی ہر چیز بطور زیور و زینت پہننا مطلقا حرام ہے اور عورت کے لیے سونے سے بنی ہر چیز بطور زیور و زینت پہننا مطلقا جائز ہے۔ جس کا معنی یہ ہے کہ ان کے نزدیک مرد کے لیے سونے کے بٹن کا استعمال جائز نہیں ہے جبکہ عورت کے لیے سونے کے بٹن کا استعمال جائز ہے۔

عبد الکریم بن محمد الرافعی، الشافعی لکھتے ہیں:

فاما الذهب فأصله علی التحریم فی حق الرجال وعلی التحلیل فی حق النساء لما روی أنه صلی الله علیه وسلم قال فی الذهب والحریر هذان حرام علی ذکور امتی حل لاناثها۔[٧٥]

بہر حال سونے میں اصل یہ ہے کہ سونا مردوں پر حرام ہے اور عورتوں پر حلال ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ سونا اور ریشم میری امت کے مردوں پر حرام کر دیے گئے اور میری امت کی عورتوں پر حلال کر دیئے گئے۔

علامہ الدسوقی المالکی لکھتے ہیں:

حرم استعمال ذکر بالغ محلی بذهب اوفضة نسجا کان اوطرزا اوزرا۔[٧٦]

---

(٧٣) سنن أبي داود، حدیث: ٤٠٥٧۔

(٧٤) مسند أحمد، حدیث: ١٩٥٠٢۔

(٧٥) الرافعي، محمد بن عبد الکریم، فتح العزیز بشرح الوجیز، ادارة الطباعة المنیریة. ٦: ٢٧۔

بالغ مرد پر سونے وچاندی کے زیور کا استعمال حرام ہے چاہے بناوٹ میں استعمال کیا گیا ہو چاہے نقش ونگار میں اور تاروں میں سونے وچاندی کا استعمال کیا گیا ہو۔[۷۷]

ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

ويحرم اتخاذ الآنية من الذهب والفضة واستصناعها؛ لأن ما حرم استعماله حرم اتخاذه على هية الاستعمال كالطنبور والمزمار. ويستوى فى ذلک الرجال والنساء لعموم الحديث ولأن علة تحريمها السرف والخيلاء وكسر قلوب الفقراء وهذا معنى يشمل الفريقين وإنما أبيح للنساء التحلى للحاجة إلى التزين للأزواج فتختص الإباحة به دون غيره۔[۷۸]

سونے اور چاندی کے برتنوں کو اپنے پاس رکھنا اور ان کی صنعت اختیار کرنا حرام ہے کیونکہ ان کا استعمال حرام ہے یعنی ان کو استعمال کے طور پر اپنے پاس رکھنا حرام ہے جیسا کہ ستار اور بانسری وغیرہ، اور اس حکم میں مرد وعورت سب برابر ہیں کیونکہ حدیث عام ہے، اور اس لیے بھی (ان کا استعمال حرام ہے کہ) ان کی حرمت کی علت اسراف اور تکبر ہے جو فقراء کے دلوں کو توڑنے کا باعث بنتا ہے اور یہ معنی دونوں فریقوں کو شامل ہے اور شوہر کے لیے زینت اختیار کرنے کی ضرورت کی وجہ سے عورتوں کے لیے سونے وچاندی کے زیور کا استعمال جائز قرار دیا گیا ہے پس یہ جواز عورت کے ساتھ خاص ہو گا اس کے غیر کو یہ جواز شامل نہیں ہو گا (یعنی مرد کے لیے سونے کے ہر قسم کے زیور کا استعمال جائز نہیں ہے۔

سونے کے بٹن لگانے میں احناف کے دلائل:

احناف کے نزدیک مرد وعورت کے لیے قمیص وغیرہ میں سونے کے بٹن کا استعمال جائز ہے اور وہ جواز پر مندرجہ ذیل حدیث کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

نهى نبى الله صلى الله عليه وسلم عن لبس الحرير الا موضع اصبعين او ثلاث اواربع۔[۷۹]

---

(۷۶) حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر/ ۶۲:۱۔

(۷۷) المغنی/ ۵۲۰:۱۲۔

(۷۸) ایضا/ ۵۲۰:۱۲۔

(۷۹) صحیح مسلم/ حدیث: ۲۰۶۹۔

رسول کریم ﷺ نے ریشم پہننے سے منع فرمایا سوائے دو یا تین انگل کے۔

احناف کا موقف یہ ہے کہ مذکورہ بالا حدیث میں مرد کے لیے قمیص، جبہ وغیرہ میں دو یا تین انگل ریشم کا باڈر لگانے کی اجازت دی گئی ہے اور ریشم کی یہ مقدار قلیل ہے اور "**القلیل کالمعدوم**" کے تحت قلیل کثیر کے تابع ہونے کی وجہ سے جائز ہے لھذا انہوں نے اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ مرد کے لیے قمیص وغیرہ میں سونے کے بٹن لگانا جائز ہے کیونکہ سونے کے بٹن قمیص وغیرہ کے تابع ہیں اور اصول یہ ہے کہ جب متبوع جائز ہو تو تابع بھی جائز ہوتا ہے لھذا قمیص وغیرہ میں سونے کے بٹن کا استعمال جائز ہے۔

ملا علی القاری مذکورہ بالا حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فی هذه الرواية إباحة العلم من الحرير فی الثوب إذا لم يزد على أربع أصابع، وعليه الجمهور۔[۸۰]

اس روایت میں کپڑے میں ریشم کا باڈر لگانے کی اباحت کا ذکر ہے بشرطیکہ چار انگل سے زیادہ نہ ہو۔

فتاویٰ شامی میں ہے:

لا بأس بأزرار الديباج والذهب۔[۸۱]

ریشم اور سونے کے بٹن لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

سونے کے بٹن لگانے پر مقالہ نگار کا موقف:

قمیص وغیرہ میں سونے کے بٹن لگانے کے حوالہ سے مجوزین ومانعین کے دلائل کا بنظر غائر جائزہ لینے کے بعد جو بات نتیجہ کے طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں ائمہ احناف کا موقف صائب و درست ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا مرد کے لیے سونے اور ریشم کے استعمال سے منع فرمانا عام ہے اور یہ ایسا عام ہے جس سے رسول کریم ﷺ نے خود ہی **مخصوص البعض** کا استثناء فرمایا ہے یا یہ کہ منع فرمانا مطلق نہیں بلکہ مقید ہے اور اس کی تقیید ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے۔

حدیث پاک میں ہے:

---

(۸۰) مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح/۸:۲۰۲۔

(۸۱) ردالمحتار/۶:۳۵۵۔

عَنْ مُعَاوِيَة أَنَّ رَسُولَ اللَّه صَلَّى الله عَلَيْه وَسَلَّمَ نَهى عَنْ لُبْسِ الْحَرِيرِ وَالذَّهبِ إِلَّا مُقَطَّعًا۔[۸۲]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ریشم اور سونا پہننے سے منع فرمایا سوائے چھوٹے سے ٹکڑے کے۔

مذکورہ بالا حدیث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ رسول کریم ﷺ نے قلیل مقدار میں سونے کے استعمال کی اجازت دی ہے جس کا معنی یہ ہے کہ سونا اور ریشم مرد پر مطلق طور پر حرام نہیں ہیں بلکہ ان کی قلیل مقدار کا استعمال مرد کے لیے جائز۔

تہذیب السنن میں ہے:

سمعت شيخ الإسلام ابن تيمية يقول حديث معاوية –رضى الله عنه– فِي إباحة الذهب مقطعًا، هو فِي التابع غير الفرد، كالزّرّ، والعَلَم، ونحوه.[۸۳]

(حافظ ابن قیم نے "تھذیب السنن" میں کہا کہ) میں نے ابن تیمیہ کو کہتے ہوئے سنا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سونے کے چھوٹے ٹکڑے کے استعمال کے جواز میں ہے جو اپنی انفرادی حیثیت نہ رکھنے کی وجہ سے تابع کے حکم میں ہے جیسا کہ بٹن، باڈر وغیرہ۔

سنن ابو داود میں ہے:

حدثنا عبد الله أبو عمر، مولى أسماء بنت أبى بكر قال رأيت ابن عمر فى السوق اشترى ثوبا شأميا، فرأى فيه خيطا أحمر فرده، فأتيت أسماء فذكرت ذلک لها فقالت يا جارية ناولينى جبة رسول الله صلى الله عليه وسلم فأخرجت جبة طيالسة مكفوفة الجيب، والكمين، والفرجين بالديباج.[۸۴]

اسماء بنت ابی بکر کے آزاد کردہ غلام عبد اللہ ابو عمر نے حدیث بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ابن عمر کو بازار میں شامی کپڑا خریدتے دیکھا، پس آپ نے اس میں سرخ رنگ کا دھاگہ دیکھا تو آپ نے اسے واپس کر دیا تو میں نے

---

(۸۲) سنن النسائی / حدیث: ۵۱۴۹۔

(۸۳) ابن قیم (م ۷۵۱ھ)، محمد بن ابی بکر بن ایوب، ابو عبد اللہ، الزرعی، تھذیب السنن، الریاض، مکتبۃ المعارف / ۱:۱۹۶۵۔

(۸۴) سنن ابی داوٗد / حدیث: ۴۰۵۴۔

حضرت اسماء سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا اے لڑکی مجھے رسول اللہ ﷺ کا جبہ دیجئے تو میں ایک طیالسی جبہ نکال کر لائی جس کا گلا، آستین اور کفیں ریشم کی تھیں۔

مذکورہ بالا حدیث سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایسا جبہ زیب تن فرمایا ہے جس پر ریشم کا کام کیا ہوا تھا جس سے یہ پتہ چلا کہ مرد کے لیے قلیل مقدار میں ریشم کا استعمال جائز ہے تو جب ریشم قلیل مقدار میں جائز ہے تو سونا بھی قلیل مقدار میں استعمال کرنا جائز ہے کیونکہ سونا اور ریشم دونوں کا حکم ایک ہے تو جتنی مقدار سونے کی مرد کے لیے حرام ہے اتنی ہی مقدار ریشم کی بھی حرام ہے اور جتنی مقدار ریشم کی حلال ہے اتنی مقدار سونے کی بھی حلال ہے۔

مرد وعورت کے لیے سونے کی گھڑی پہننے کا حکم:

تمام فقہائے اسلام کا اس بات پر اجماع واتفاق ہے کہ مرد کے لیے سونے کی گھڑی پہننا ناجائز و حرام ہے، کیونکہ مرد کے لیے سونے کا بطور زیور و زینت استعمال مطلقاً ناجائز و حرام ہے البتہ مرد کے لیے سونے کا ضرورتاً استعمال جائز ہے۔ کیونکہ ضرورت سے مراد ہر ایسی چیز ہے جس کے استعمال کیے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہو یا ضرورت سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کو استعمال نہ کیا جائے تو انسانی زندگی میں حرج لائق ہو جائے، اور یہ بات واضح ہے کہ سونے کی گھڑی نا پہننے سے انسانی زندگی کو کوئی حرج لاحق نہیں ہوتا۔ البتہ عورت کے لیے سونے کی گھڑی پہننا بالاتفاق و بالاجماع جائز ہے کیونکہ عورت کے لیے سونے کو بطور زیور وزینت استعمال کرنا جائز ہے۔

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

لا يجوز استعمال الساعات والأقلام وأدوات المكتب والمرايا وأدوات الزينة الذهبية أو الفضية۔[۸۵]

(مردوں کے لیے) سونے وچاندی کی گھڑی، قلم، لکھنے کے اوزار اور آئینہ کا استعمال جائز نہیں ہے۔

عبد الرحمن الجزیری لکھتے ہیں:

يحرم اتخاذ فنجان القهوة من الذهب والفضة وظرف الساعة۔[۸۶]

سونے وچاندی سے قہوہ کا کپ اور گھڑی کا ڈائل بنانا حرام ہے۔

---

(۸۵) الفقہ الاسلامی وادلتہ /۳: ۵۴۴۔

(۸۶) الفقہ علی المذاھب الاربعۃ /۲: ۱۹۔

علامہ بن باز ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں:

لیس لک لبسھا لأن الساعة من الذھب محرمة، وھکذا المطلیة بالذھب، وھکذا الخاتم من الذھب، کل ذلک محرم علی الذکر۔[۸۷]

تیرے لیے سونے کی گھڑی کا پہننا جائز نہیں ہے کیونکہ سونے کی گھڑی حرام ہے اور ایسے ہی جس پر سونے کا پانی چڑھایا گیا ہو اور ایسے ہی سونے کی انگوٹھی یہ سب چیزیں مرد پر حرام ہیں۔

ایک دوسرے استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں:

ھل یجوز لبس ساعة الذھب أو الساعة الصفراء ذات اللون الذی کأنه لون ذھب-ج:یجوز ذلک للنساء۔[۸۸]

کیا سونے کی گھڑی یا ایسی گھڑی جس کا رنگ سونے جیسا ہو پہننا جائز ہے؟جواب:عورتوں کے لیے جائز ہے۔

مرد کے لیے سونے کا لباس اور زیور پہن کر نماز پڑھنے کا حکم:

سابقہ سطور میں بیان کیا جاچکا ہے کہ احناف کے نزدیک مرد کے لیے لباس میں چار انگل سے زائد سونے کا استعمال حرام ہے جبکہ ائمہ ثلاثہ یعنی مالکیہ،شوافع، حنابلہ،اصحاب الظواہر اور غیر مقلدین کے نزدیک لباس میں سونے کا استعمال علی الاطلاق حرام ہے، اسی طرح تمام فقہائے اسلام کے نزدیک مرد کے لیے سونے کا ہر قسم کا زیور"مثلاً انگوٹھی، گلے کا لاکٹ،بریسلٹ، گھڑی،وردی پر لگائے جانے والے بیجز وغیرہ پہننا علی الاطلاق حرام ہے۔ لھذا اگر کسی مرد نے سونے کا لباس یا زیور پہن کر نماز پڑھی تو اس کی نماز مکروہ تحریمی،واجب الاعادہ ہو گی۔

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

ما یختص تحریمه بالرجال دون النساء: وھو الحریر، والمنسوج بالذھب، والمموه به، یحرم لبسه وافتراشه فی الصلاة وغیرھا.[۸۹]

---

(۸۷)فتاوی بن باز/۸:۹۹۔

(۸۸)فتاوی بن باز/۸:۹۹

(۸۹)الفقہ الاسلامی وادلتہ/۲:۲۰۷۔

جس چیز کا بالخصوص مردوں کو پہننا حرام ہے، عورتوں کے لیے حرام نہیں ہے وہ ریشم اور سونے کے بانے والا لباس اور سونے کے پانی سے رنگا ہوا لباس ہے جس کا پہننا اور نماز میں جائے نماز وغیرہ کے طور پر اس کا بچھانا حرام ہے۔

امام احمد رضا خاں بریلوی لکھتے ہیں:

ناجائز کپڑا پہن کر نماز مکروہ تحریمی کہ اسے اتار کر پھر اعادہ کی جائے۔[۹۰]

مرد وعورت کے لیے سونے کا بطور ضرورت استعمال:

عالم اسلام میں سونے کو بطور زیور استعمال کرنے کے ساتھ، ساتھ بطور ضرورت بھی استعمال کیا جاتا ہے اور شریعت اسلامیہ میں ضرورت سے مراد یہ ہے کہ "جب کوئی شخص حرام اختیار کرنے پر اس قدر مجبور ہو جائے کہ حرام اختیار نہ کرنے کی صورت میں اسے جان جانے کا خطرہ ہو یا زندگی کو کسی ضرر کے لاحق ہونے کا خطرہ ہو تو یہ حالت، حالت اضطرار کہلاتی ہے اور اسلام میں اسی حالت اضطرار کو ضرورت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور پھر اسی ضرورت کی وجہ سے بقدر ضرورت حرام کے استعمال کی اسلام نے اجازت دی ہے۔

جب کسی انسان کے لیے سونے کا استعمال اس قدر ضروری اور لازمی ہو جائے کہ سونے کا استعمال کیے بغیر انسانی جان ضائع ہونے یا انسانی جان کو کوئی ضرر لاحق ہونے کا خطرہ ہو تو ایسی حالت میں مرد وعورت کے لیے بقدر ضرورت سونے کا استعمال بالاتفاق وبالاجماع جائز ہے اور جب یہ ضرورت کسی دوسری چیز سے پوری ہو سکتی ہو تو پھر اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔ یہ امام اعظم ابو حنیفہ اور ایک روایت کے مطابق قاضی ابو یوسف کا مسلک ہے[۹۱] اور یہی معاصر عالم، الشیخ عبد العزیز بن باز[۹۲] (سعودی عرب کے مفتی اعظم) کی تحقیق کا مستفاد ہے جبکہ امام محمد، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک سونے کا استعمال بطور ضرورت مطلقا جائز ہے، چاہے وہ ضرورت کسی دوسری چیز سے پوری ہو سکتی ہو یا نہ ہو سکتی ہو۔

---

(۹۰) فتاوی رضویہ / ۲۲:۱۵۳۔

(۹۱) الهداية فی شرح بداية المبتدی / ۷:۱۸۵۔

(۹۲) بن باز (م ۱۴۲۰ھ)، عبد العزیز بن عبد اللہ، مجموع فتاوی بن باز، دار القاسم / ۱۰:۴۴۔

سونے کا دواؤں میں استعمال:

علمائے اسلام کا اس پر اتفاق واجماع ہے کہ سونے کا دواؤں کی تیاری میں استعمال جائز ہے۔ کیونکہ قرآن میں ارشاد باری تعالی ہے:

هُوَ الَّذِی خَلَقَ لَكُمْ مَا فِی الْأَرْضِ جَمِیعًا۔[۹۳]

وہ ذات جس نے تمہارے لیے پیدا کیا وہ سب کچھ جو زمین میں ہے۔

اور یہ آیت مبارکہ سونے کے بطور ضرورت استعمال پر مطلق ہے اور اس اطلاق کا تقاضا یہی ہے کہ سونے کا دواؤں میں استعمال جائز ہے۔

سونے کی ناک، دانت اور دیگر اعضاء لگوانا:

سونے کی ناک، دانت اور دیگر اعضاء لگوانے کے بارے میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہ اور جمہور فقہائے اسلام کے مابین اختلاف ہے۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک سونے کی ناک، دانت وغیرہ لگانا جائز نہیں، جبکہ جمہور فقہائے اسلام کا مذہب یہ ہے کہ سونے کی ناک، دانت وغیرہ لگانا جائز ہے۔ ذیل میں پہلے جمہور فقہائے اسلام کے موقف کو بالتفصیل وبالدلیل پیش کیا جائے گا اور بعد میں امام اعظم کے موقف کی تفصیل ودلیل پیش کی جائے گی۔

سونے کے بطور ضرورت استعمال کے جواز پر جمہور فقہاء کے دلائل:

اگر کسی شخص کی ناک کٹ جائے تو اس کے لیے سونے کی ناک لگوانا جائز ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کا دانت ٹوٹ جائے یا گر جائے تو سونے کا دانت لگوانا اور ہلتے دانت کو سونے کے تار سے باندھنا جائز ہے، حضرات تابعین میں سے ابراھیم النخعی، حماد بن ابی سلیمان، نافع بن جبیر، امام الحسن البصری، ثابت البنانی، موسی بن طلحۃ اور ائمہ ومجتہدین میں سے قاضی ابو یوسف، امام محمد، امام مالک، امام الشافعی، امام احمد بن حنبل سے یہی منقول ہے اور جمہور فقہائے اسلام کا بھی یہی موقف ہے، اسی طرح فقہائے شوافع کے نزدیک سونے کی انگلیاں لگوانا بھی جائز ہے، البتہ جب کسی شخص کا ہاتھ یا پاؤں کٹ جائے تو اس کے لیے سونے کے ہاتھ، پاؤں لگوانے میں جمہور فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ امام نووی نے کہا کہ شوافع کے ہاں صحیح یہ ہے کہ سونے کے ہاتھ، پاؤں لگوانا جائز نہیں ہے اور مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی میں ہے کہ احناف اور

---

(۹۳) البقرۃ:۲۹۔

شوافع کے نزدیک سونے کے ہاتھ، پاؤں، مکمل انگلیاں اور دیگر اعضاء لگانا جائز نہیں ہے۔ الموسوعۃ الفقھیۃ الکویتیۃ میں ہے کہ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ اگر ضرورت ہو تو تمام اعضاء سونے کے لگانا جائز ہے۔

جمہور فقہائے اسلام نے مندرجہ ذیل حدیث وآثار سے استدلال کیا ہے۔ امام ترمذی اور امام ابو داؤد نے عبد الرحمن بن طرفۃ سے روایت کیا ہے کہ ان کے دادا عرفجۃ بن اسعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ:

"اصيب أنفى يوم الكلاب فى الجاهلية فاتخذت أنفا من ورق فأنتن على فأمرنى رسول الله صلى الله عليه وسلم ان اتخذ انفا من ذهب".[۹۴]

زمانہ جاہلیت میں یوم الکلاب کے موقع پر میری ناک کٹ گئی تو میں نے چاندی کی ناک بنوالی، اس میں بدبو پیدا ہوگئی تو نبی کریم ﷺ نے مجھے فرمایا کہ میں سونے کی ناک لگوالوں (تو میں نے لگوالی)۔

امام ترمذی مندرجہ بالا حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

روى غير واحد من أهل العلم أنهم شدوا أسنانهم بالذهب۔[۹۵]

بعض اہل علم سے روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے دانت سونے کے تار سے باندھے ہوئے تھے۔

الماوردی نے سونے کے بطور ضرورت استعمال پر اپنی رائے کا اظہار کرنے کے بعد حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے عمل بطور دلیل پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

أَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ رَضِيَ اللَّه عَنْه شَدَّ أَسْنَانَه بِالذَّهب۔[۹۶]

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اپنے دانتوں کو سونے کے تار سے باندھ رکھا تھا۔

مذکورہ بالا حدیث و آثار کو دلیل بناتے ہوئے جمہور فقہاء نے ہلتے دانت کو سونے کے تار سے باندھنے، سونے کا دانت لگوانے اور سونے کی انگلی لگوانے کو جائز قرار دیا جبکہ بعض متاخرین نے ضرورت کے وقت سونے کے ہاتھ، پاؤں اور دیگر اعضاء لگوانے کی بھی اجازت دی ہے۔

امام، النووی سونے کے بطور ضرورت استعمال کے جواز پر مذکورہ حدیث کو بطور دلیل بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(۹۴) سنن الترمذی / حدیث: ۱۷۷۰۔ سنن ابی داؤد / حدیث: ۴۲۲۳۔

(۹۵) سنن الترمذی / حدیث: ۱۷۷۰۔ سنن ابی داؤد / حدیث: ۴۲۲۳۔

(۹۶) الحاوی الکبیر فی فقہ مذہب الامام الشافعی / ۹ / ۴۷۔

يجوز لمن ذهب انفه او سنه او انملته أن يتخذمكانها ذهبا سوا أمكنه فضة وغيرها أم لا وهذا متفق عليهويجوز له شد السن والأنملة ونحوهما بخيط ذهب لأنه أقل من الأنف المنصوص عليه وهل لمن ذهبت إصبعه أو كفه أو قدمه أن يتخذها من ذهب أو فضة فيه طريقان أصحهما لا يجوز وبه قطع البغوى وغيره۔[۹۷]

جس شخص کی ناک، دانت یا انگلیاں کٹ جائیں اس کے لیے سونے کی ناک، دانت اور انگلیاں لگوانا جائز ہے چاندی وغیرہ کی لگانا ممکن ہو یا نہ ہو (یعنی ہر حالت میں جائز ہے) اور یہ متفق علیہ ہے۔ دانت اور انگلیاں وغیرہ کو سونے کے تار سے باندھنا جائز ہے کیونکہ یہ سونے کی ناک لگوانے کی مقدار سے کم ہے جس پر نص آئی ہے اور (اگر کوئی یہ سوال کرے کہ) انگلیاں، ہتھیلی، پاؤں سونے یا چاندی کے لگوانا کیسا ہے تو اس بارے میں صحیح قول یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے اور امام بغوی وغیرھم نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

الموسوعۃ الفقھیۃ الکویتیۃ میں ہے:

اتفق الفقهاء على جواز اتخاذ الأنف من الذهب۔[۹۸]

سونے کی ناک لگوانے کے جواز پر فقہاء کا اتفاق ہے۔

دوسرے مقام میں ہے:

يجوز اتخاذ السن من الذهب عند الجمهور قياسا على الأنف۔[۹۹]

جمہور فقہاء کے نزدیک ناک پر قیاس کرتے ہوئے سونے کے دانت لگوانا جائز ہے۔

بدائع الصنائع میں ہے:

شد السن المتحرک بالذهب فقد ذکر الکرخی انه یجوز۔[۱۰۰]

ہلتے دانت کو سونے (کے تار) سے باندھنا امام کرخی نے کہا جائز ہے۔

---

(۹۷) المجموع شرح المہذب/۴:۳۲۷۔

(۹۸) الموسوعۃ الفقھیہ الکوتیہ/۱۱:۱۲۰۔

(۹۹) ایضا۔

(۱۰۰) بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع/۵:۱۳۲۔

فقہ السنۃ میں ہے:

یجوز للشخص ان یتخذ سنا من الذہب وانفا منہ إذا احتاج إلی شیء من ذلک۔[101]

ضرورت ہو تو آدمی کے لیے سونے کی ناک اور دانت لگوانا جائز ہے۔

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

صناعۃ الأنف إذا قطع والأسنان اذا سقطت یجوز عملها من الذہب أو الفضۃ وہذا رای الجمہور۔[102]

اگر کسی کی ناک کٹ جائے یا دانت ٹوٹ جائے تو سونے، چاندی کی ناک یا دانت لگوانا جائز ہے، یہی جمہور کی رائے ہے۔

مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی میں ہے:

فقد قرر الفقهاء بالاتفاق جواز اتخاذ سن أو أنملۃ أو أنف من ذهب أن اقتضت الضرورۃ أن یکون ذہباً وعلی خلاف فیما بینهم فی جواز اتخاذہ من الذہب إن قامت الفضۃ أو نحوها مقامہ فأجاز الشافعیۃ والمالکیۃ الذہب مطلقاً ومنعہ الحنفیۃ عند عدم الضرورۃ أما الأطراف کالید والرجل وکالإصبع الکاملۃ منهما فقد ذهب الحنفیۃ والشافعیۃ فی المعتمد عندهم إلی عدم جواز اتخاذها من ذهب أو فضۃ نظراً إلی أنها لن تکون أعضاء عاملۃبل لمجرد الزینۃ فلا ضرورۃ فی ترکیبها إذن أی فلا ضرورۃ فی ارتکاب المحظورومعنی ذلک أن اتخاذ طرف طرف اصطناعی من غیر الذہب والفضۃ جائز بالاتفاق۔[103]

فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ سونے کی ناک، دانت اور انگلیاں لگانا اگر ضروری ہو تو جائز ہے۔ سونے کے علاوہ کسی دوسری دھات، مثلاً چاندی وغیرہ سے سونے کی ناک، دانت اور انگلیاں ممکن ہو تو پھر اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، شوافع اور مالکیہ نے اسے مطلقاً جائز قرار دیا اور ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے منع کیا ہے۔ رہا سونے

(۱۰۱)السید سابق (م ۱۴۲۰ھ)، فقہ السنۃ، القاہرۃ، الفتح لاعلام الغربی/ ۳:۲۵۰۔

(۱۰۲)الفقہ الاسلامی وادلتہ/ ۳:۵۴۳۔

(۱۰۳)مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی، التابع لمنظمۃ المؤتمر الاسلامی بجدۃ/ ۴:۱۲۳۔

وچاندی کے دیگر اعضاء مثلاہاتھ، پاؤں اور مکمل انگلیاں لگوانا تو احناف وشوافع کے نزدیک جائز نہیں ہے کیونکہ سونے، چاندی کے اعضاء سے کام، کاج کرنا ممکن نہیں ہے یہ محض زینت ہے پس ان کو لگوانے کی اجازت دینے کی ضرورت نہیں ہے یعنی ممنوع کے ارتکاب کی ضرورت نہیں ہے اور سونے وچاندی کے علاوہ دیگر چیزوں کے بنے مصنوعی اعضاء لگانا بالاتفاق جائز ہے۔

سونے کے دانت، ناک وغیرہ لگوانے میں امام اعظم ابو حنیفہ کا موقف:

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک سونے کا دانت لگوانا اور ہلتے دانت کو سونے کی تار سے باندھنا جائز نہیں ہے، امام صاحب کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ سونے وچاندی میں اصلا حرمت ہے اور حرام صرف ضرورت کی حد تک مباح ہوتا ہے اور جب یہ ضرورت کسی دوسری چیز سے پوری ہو سکتی ہو تو شریعت حرام کے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتی لھذا سونے کے علاوہ کسی دوسری دھات یا مٹیریل کے دانت دستیاب ہونے کی صورت میں سونے کی حرمت اپنی اصل پر قائم رہے گی اور اس وجہ سے سونے کا دانت وغیرہ لگوانا جائز نہیں ہو گا۔ یعنی امام صاحب کے نزدیک حدیث عرفجہ عام اور مطلق نہیں ہے بلکہ حدیث عرفجہ میں جو سونے کی ناک لگانے کی اجازت دی گئی ہے وہ صرف ضرورت کی وجہ سے دی گئی کیونکہ اس زمانہ میں سونے کے علاوہ کسی دوسری دھات مثلاً چاندی وغیرہ کی ناک کامیاب نہیں تھی جیسا کہ حدیث میں ہے، چاندی کی ناک میں بدبو پیدا ہو گئی تھی جو تکلیف کا باعث تھی۔

صاحب الھدایۃ علامہ المرغینانی نے امام صاحب کا موقف بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

لأبی حنيفة أن الأصل فيه التحريم والإباحة للضرورة وقد اندفعت بالفضة وهی الأدنى فبقی الذهب على التحريم۔[۱۰۴]

امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک اس (سونے) میں اصلا حرمت ہے اور اباحت ضرورت کی وجہ سے ہے جب چاندی سے یہ ضرورت پوری ہو گئی جو درجہ میں کم ہے تو سونا اپنی حرمت پر باقی رہا۔

ابن عابدین الشامی سونے کے دانت لگوانے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

المحرم لا يباح إلا لضرورة وقد اندفعت فی السن بالفضة فلا حاجة إلى الأعلى وهو الذهب۔[۱۰۵]

---

(۱۰۴) الھدایۃ فی شرح بدایۃ المبتدی / ۷: ۱۸۵۔

حرام صرف ضرورت کی حد تک مباح ہوتا ہے اور یہ ضرورت چاندی کے دانت سے پوری ہو جانے کی وجہ سے اعلیٰ درجہ کی دھات یعنی سونے کی ضرورت نہ رہی۔

فریقین کے دلائل کا بنظر غائر جائزہ لینے سے یہ بات مجھ پر واضح ہوئی ہے کہ اس مسئلہ میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کا موقف بلحاظ دلیل زیادہ قوی اور صائب ودرست اور عمل کے زیادہ لائق ہے کیونکہ سونے کا استعمال مرد پر مطلقاً حرام ہے۔

جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

حرم لباس الحرير والذهب على ذكور أمتى وأحل لإناثهم.[١٠٦]

میری امت کے مردوں پر سونا اور ریشم حرام کر دیا گیا ہے اور عورتوں کے لیے حلال کر دیا گیا ہے۔

اسی طرح عورتوں کو بھی صرف سونے کا زیور استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے دیگر مقاصد کے لیے سونے کا استعمال عورتوں کے لیے بھی حرام ہے جیسا کہ سونے وچاندی کے برتنوں کے استعمال والی احادیث سے ظاہر ہے، کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لا تلبسوا الحرير ولا الديباج، ولا تشربوا فى آنية الذهب والفضة، ولا تأكلوا فى صحافها۔[١٠٧]

ریشم اور دیباج نہ پہنو اور نہ سونے، چاندی کے برتنوں میں پیو اور نہ ان کی پلیٹوں میں کھاؤ۔

الغرض مرد کے لیے سونے کا استعمال مطلقاً حرام ہے اور عورت کے لیے صرف زیور پہننے کی اجازت ہے دیگر مقاصد کے لیے استعمال کرنا عورت کے لیے بھی جائز نہیں ہے اور نبی کریم ﷺ نے حدیث عرفجہ میں سونے کی ناک لگوانے کی جو اجازت عطا فرمائی وہ آپ ﷺ نے صرف حالت اضطرار کی وجہ سے ضرورتاً عطا فرمائی، یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے سونے کی حرمت والی احادیث کو عموم واطلاق پر محمول کرتے ہوئے کہا کہ سونے کے استعمال میں اصلاً حرمت ہے اور استعمال کی اجازت ضرورت کی وجہ سے ہے۔

ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

---

(١٠٥) ردالمحتار/٥٢١:٩۔

(١٠٦) سنن الترمذی/حدیث:١٧٢٠۔

(١٠٧) صحیح مسلم/حدیث:٢٠٦٧۔

فأما الذهب، فلا يباح الا في الضرورة، كأنف الذهب۔[۱۰۸]

سونا صرف ضرورتاً مباح ہے جیسا کہ سونے کی ناک۔

الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ میں ہے:

فيحرم على الرجل استعمال الذهب ولا يحل له منه إلا مادعت الضرورة أو الحاجة إليه۔[۱۰۹]

سونے کا استعمال مرد پر حرام کیا گیا ہے اور مرد کے لیے اس کا استعمال صرف ضرورت و حاجت کے وقت جائز ہے۔

سعودی عرب کے مفتی اعظم، الشیخ عبدالعزیز بن باز لکھتے ہیں:

أما تركيب سن الذهب بدون حاجة فإنه غير جائز؛ لتحريم الذهب على الرجال۔[۱۱۰]

سونے کے دانت لگوانا بلاضرورت جائز نہیں ہے کیونکہ سونا مردوں پر حرام ہے۔

لہذا میری نظر میں آج کے دور جدید میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کی درست اور صائب رائے کے مطابق جب سونے کے علاوہ دیگر دھاتوں اور متریل کے بنے اعضاء باسہولت دستیاب ہیں اور سونے کے مقابلے میں سستے اور پائیدار ہیں تو آج کے دور میں سونے کے بنے مصنوعی اعضاء اور دانت وغیرہ لگوانا جائز نہیں ہو گا۔

حاصل بحث:

سطور بالا میں سونے کے استعمال پر کی جانے والی تحقیق کا ماحاصل مندرجہ ذیل ہے۔

1۔ سونا ایک مشہور و معروف، سنہری رنگ کی قیمتی، چمک دار، نرم و ملائم، نفیس، عمدہ دھات ہے، جس پر موسمی اثرات اور عام تیزابات اثر انداز نہیں ہوتے اور اسے عربی میں "الذہب"، انگریزی میں "Gold" اور لاطینی زبان میں "اورم" کہا جاتا ہے۔

2۔ زمین سے نکلنے والی معدنیات میں سے سونے کو سب پر فضیلت اور برتری حاصل ہے۔

3۔ سونا انسانی زندگی کے لیے ایک جزو لاینفک کی حیثیت رکھتا ہے۔

---

(۱۰۸)ابن قدامۃ(م ۶۲۰ھ)، عبداللہ بن احمد بن محمد، الدمشقی، الحنبلی، الکافی فی فقہ الامام احمد، دار الکتب العلمیۃ/ ۱:۴۶۔

(۱۰۹)الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ/ ۲۲:۱۱۷۔

(۱۱۰)بن باز(م ۱۴۲۰ھ)، عبدالعزیز بن عبداللہ، مجموع فتاوی بن باز، دار القاسم/ ۱۰:۴۴

4۔ مرد کے لیے سونے کا ہر طرح اور ہر قسم کا بطورزیوروبطور زینت استعمال ناجائز و حرام ہے۔

5۔ امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک مردوعورت کے لیے سونے کا بطور ضرورت استعمال اُس وقت نا جائز ہےجب وہ ضرورت کسی دوسری چیز سے پوری ہو جاتی ہو اور جب ضرورت کسی دوسری چیز سے پوری نہ ہوتی ہو تو پھر امام اعظم کے نزدیک سونے کا استعمال بطور ضرورت جائز ہے جبکہ دیگر ائمہ کے نزدیک سونے بطور ضرورت مطلقا جائز ہے۔

6۔ عورت کے لیے سونے کا ہر قسم اور ہر طرح کا بطور زیوراوربطور زینت استعمال مطلقا جائز ہے۔

7۔ عصر حاضرمیں امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک مرد و عورت کے لیے سونے کی ناک اور دانت اور دیگر اعضاء لگوانا جائز نہیں ہے کیونکہ عصر حاضر میں اس کا متبادل مٹریل موجود ہے جو سونے کے مقابلے میں سستا اور پائدار ہے۔

8۔ احناف اور مالکیہ کے نزدیک گھر کی تزئین و آرائش کے لیےسونےکا بطور زینت استعمال جائز ہے جبکہ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

9۔ مالکیہ،شوافع اور حنابلہ کے نزدیک مرد کے لیے قمیص وغیرہ میں بطور زینت سونے کے بٹن کا استعمال جائز نہیں ہے جبکہ ان کے ہاں عورت کے لیےقمیص وغیرہ میں بطور زینت سونے کے بٹن وغیرہ کا استعمال جائز ہے۔

10۔ احناف اور مالکیہ نے سونے کی بنی اشیاء سے گھروں کی تزیین و آرائش کو جائز قرار دیا جبکہ شوافع و حنابلہ نے اسے ناجائز و حرام قرار دیاہے۔

11۔ ائمہ و مجتہدین کے اس اختلاف میں صائب اور درست رائے کس کی ہے تو مجھے اس مقام پر ائمہ شوافع و حنابلہ کی رائے زیادہ صائب اور درست دکھائی دیتی ہے کیونکہ احناف و مالکیہ نے بھی سونے سے بنی اشیاءسے گھروں کی تزیین وآرائش کومطلقا جائز قرار نہیں دیا بلکہ بلاتفاخر کی قید کے ساتھ جائز قرار دیا تو آج جب ہم عالم اسلام کے امراء کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں تو اکثریت کی زندگیوں میں تفاخر کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا،عالم اسلام کے امراء کی اکثریت کا بڑے اور عالی شان محلات میں رہنا،مہنگی گاڑیوں میں سفر کرنا اور سادگی اور قناعت کا نہ ہونایہ، سب تفاخر کی علامت ہے اور تفاخر کے ارادہ سے سونے سے بنی اشیاء سے گھروں کی تزیین و آرائش احناف و مالکیہ کے نزدیک بھی ناجائز و حرام ہے

تو حاصل بحث یہ ہوا کہ فی زمانہ تمام ائمہ و مجتہدین کے نزدیک سونے سے بنی اشیاء سے گھروں کی تزیین و آرائش ناجائز و حرام ہے۔

سونے سے بنی اشیاء سے گھروں کی تزیین و آرائش کے ناجائز و حرام ہونے کی دوسری وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اس میں مال کا ضیاء و اسراف ہے جو کہ حرام ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ٥إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا﴾

اور رشتے داروں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرتے رہواور اسراف اور بے جا خرچ سے بچو، بیشک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔

لھذا عصر حاضر میں میرے نزدیک سونے سے بنی اشیاء سے گھروں کی تزئین آرائش ناجائز و حرام ہے۔

12۔ مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک مرد کے لیے قمیص اور کرتہ وغیرہ میں سونے کے بٹن وغیرہ کا استعمال جائز نہیں ہے جبکہ احناف کے نزدیک مرد کے لیے قمیص، کرتہ اور ویسکوٹ وغیرہ میں صرف سونے کے بٹن کا استعمال جائز ہےاور عورت کے لیے قمیص وغیرہ میں سونے کے بٹن اور دیگر زری کے کام کا استعمال تمام ائمہ و فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔

13۔ مرد کے لیے قمیص، کرتہ اور ویسکوٹ وغیرہ میں سونے کے بٹن لگانے کے حوالہ سے مجوزین و مانعین کے دلائل کا بنظر غائر جائزہ لینے کے بعدمیں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں ائمہ احناف کا موقف صائب و درست ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کامرد کے لیے سونے اور ریشم کے استعمال سے منع فرمانااایسا عام ہے جس سے رسول کریم ﷺ نے خودہی مخصوص البعض کا استثناء فرمایا ہےجیساکہ سابقہ سطور میں کی گئی تحقیق سے واضح ہے۔

۱۴۔ تمام فقہائے اسلام کا اس بات پر اجماع واتفاق ہے کہ مرد کے لیے سونے کی گھڑی پہنناناجائز و حرام ہے، کیونکہ مرد کے لیے سونے کابطور زیور و زینت استعمال مطلقاناجائز و حرام ہے جبکہ عورت کے لیے سونے کی گھڑی پہننا بالاتفاق و بالاجماع جائز ہے کیونکہ عورت کے لیے سونے کو بطور زیور و زینت استعمال کرنا جائز ہے۔

مولانا وحید الدین خان کا تصورِ تصوف

☆ حافظ محمد عمران

☆☆ حافظ عمیر گلزار

☆☆☆ ڈاکٹر غلام حسین

ABSTRACT

Islamic law fulfills all the natural requirements of man as well as provides complete guidance. Sufism is the name of fulfilling spiritual needed .Sufism is an important branch of religion which is based on sincerity of intention and whose aim is to attain the relationship with Allah and the pleasure of Allah. The true meaning of spirituality in Islam is nearness to Allah. The closer a person is to Allah, that he the greater his spirituality. In Islam, attaining nearness to Allah is based on following the Qur'an and Sunnah. In the context of thinkers in the subcontinent, we see such a Thinker as Maulana Waheed-ud-Din Khan. Who call Sufism a parallel religion. This article tries to be critical study of Maulana Waheed-ud-Din Khan's concept of Sufism should be clarified.

Keywords: Quran Majeed ,Mysticism , Ideology, spirituality.

شریعت اسلامیہ انسان کے تمام فطری تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ مکمل رہنمائی بھی کرتی ہے۔چونکہ دین اسلام اخروی دین اور مکمل ضابطہ حیات ہے اسی بنا پر وہ انسان کی تمام تر ضروریات کا خیال رکھتا ہے کیونکہ انسان دو چیزوں کا مجموعہ ہے ایک جسم اور دوسرا روح ۔ دونوں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت انسان کو وسائل مہیا کیے ہیں۔روحانی ضرورت کو پورا کرنے کا نام ہی تصوف ہے۔ تصوف دین کا ایک اہم شعبہ ہے جس کی اساس خلوص فی النیت پر ہے اور جس کی غایت تعلق مع اللہ اورِ رضائے الٰہی کا حصول ہے ۔اسلامی تعلیمات میں محبت الٰہی، مکارم اخلاق اور خدمت خلق کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے، تصوف کی تعلیمات بھی انھیں چیزوں پر مشتمل ہیں ۔ صوفیاء کرام ہی نے اپنی عملی جدوجہد کے ذریعہ ہر زمانے میں اسلام کے اخلاقی و روحانی نظام کو زندہ رکھا، صوفیاء سے بڑھ کر تبلیغ

☆ پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور

☆☆ ایم۔فل اسکالر، جی سی یونیورسٹی، لاہور

☆☆☆ ایلیمنٹری سکول ٹیچر، دلہکے مہار، بصیرپور (اوکاڑہ)

اور تعمیرِ سیرت کا فریضہ کسی جماعت نے انجام نہیں دیا۔ اسلام میں روحانیت کا صحیح مفہوم قرب الٰہی ہے، جو شخص اللہ تعالیٰ کے جتنا قریب ہوتا ہے وہ اتنی ہی بڑی روحانی شخصیت ہوتا ہے۔ اسلام میں قرب الٰہی کے حصول کا دار و مدار قرآن وسنت پر عمل کرنے کا نام ہے۔ برصغیر میں مفکرین کے تناظر میں ہمیں ایک ایسی شخصیت مولانا وحید الدین خان کی نظر آتی ہے جو تصوف کو متوازی مذہب قرار دیتے ہیں۔ اس آرٹیکل میں تنقیدی نگاہ سے کوشش کی گئی ہے کہ مولانا وحید الدین خان کے تصور تصوف کو واضح کیا جائے۔

حقیقت تصوف

تصوف کا اشتقاق۔ مادہ صوف (اون) سے باب تفعل کا مصدر ہے اور اونی لباس عادتاً پہن لینے (لبس الصوف) کو ظاہر کرتا ہے۔ لہٰذا اسلامی اصطلاح کے مطابق "صوفی" بن کر خود کو متصوفانہ زندگی کے لئے وقف کر دینے کو تصوف کے نام سے تعبیر کریں گے۔[(۱)]

ابو بکر الکلاباذی لکھتے ہیں کہ:

"الصوف اللباس الأنبیاء وزھد الأولیاء"[(۲)]

"صوف انبیاء کا لباس اور اولیاء کا پہناوا ہے"

صوف اہل تصوف کا پسندیدہ لباس رہا ہے۔ شیخ ابو نصر سراج طوسی کے نزدیک انبیاء و صدیقین اسی لباس میں رہتے تھے، چنانچہ زاہدوں اور عابدوں نے بھی اسے اختیار کر لیا۔[(۳)] شیخ شہاب الدین سہروردی کا بیان ہے کہ ہمیشہ سے زاہدین وعابدین اور صالحین اور متقین کو صوف کا لباس مرغوب رہا ہے۔[(۴)]

یہ بات درست ہے کہ یہ لفظ رسول اللہ ﷺ کے کسی قول و عمل سے ثابت نہیں ہے۔ اوائل اسلام میں تصوف یا صوفی لفظ کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ شیخ شہاب سہروردی کو اعتراف ہے کہ کہ یہ الفاظ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نہ تھے۔[(۵)] امام قشیریؒ کے مطابق لفظ صوفی دوسری صدی ہجری کے اختتام سے کچھ قبل رائج ہوا۔[(۶)] اور اسی پر علماء

---

(۱) **اردو دائرہ معارف اسلامیہ**، دانش گاہ پنجاب، لاہور ۱۹۶۲، ج۶، ص۴۱۸

(۲) الکلاباذی، ابو بکر محمد، التعرف المذھب اھل التصوف، قاہرہ، ۱۹۶۲ء، ص ۲۵

(۳) الطوسی، ابو نصر، عبد اللہ بن علی سراج، **کتاب اللمع فی التصوف**، نیکلیسون، لیڈن، ۱۹۱۴ء، ص ۲۲

(۴) سہروردی، شیخ شہاب الدین، **عوارف المعارف**، مصر، ۱۴۹۲ھ، ص ۳۴

(۵) سہروردی، شیخ شہاب الدین، عوارف المعارف، ص ۳۴

(۶) القشیری، ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن، الرسالہ قشیریہ، مصر ۱۳۰۴ھ، ص ۹

تحقیق کا اتفاق ہے لیکن امام الطوسی نے اس سے مختلف رائے ظاہر کی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ حضرت حسن بصری (م: ۷۲۸ء) کے زمانہ میں لفظ صوفی مستعمل تھا۔[۷] شیخ علی بن عثمان الہجویریؒ نے صاف پوشی کو صوفیوں کا شعار بتایا ہے اور اسے سنت رسول ﷺ سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔[۸]

امام السیوطی کے نزدیک ابو الہاشم کوفی وہ پہلے شخص ہیں جنہیں صوفی کہا گیا اور انہیں نے سب سے پہلے علم قلوب پر لب کشائی کی۔[۹] ابو الہاشم کوفی کے دور میں جابر بن حیان کے نام کے ساتھ لفظ صوفی جڑا ہوا تھا، یہاں تک کہ اسے جابر بن حیان الصوفی کہا جاتا تھا۔[۱۰] لیکن ان کا ذکر اس لئے زد عام نہ تھا کیونکہ وہ ایک کیمیا گر تھے اور شیعہ عقائد رکھتے تھے۔ابو الہاشم اور جابر بن حیان دونوں کا تعلق کوفہ سے تھا اور کوفہ شیعت کا مرکز رہا ہے، یہیں سب سے پہلے صوفی لفظ کا استعمال ہوا اور اس کی جمع صوفیہ بھی یہیں کے نیم شیعی مسلمانوں کی ایک جماعت کے لئے استعمال ہوئی جس کا آخری امام عبدک الصوفی (م:۲۱۰ھ) تھا۔وہ نازک اللحم تھا۔حضرت علیؓ کی امامت اور ان کے حق وراثت کا قائل تھا۔[۱۱]

تصوف کی توضیح و تشریح کے لئے اگر کوئی لفظ سب سے زیادہ مناسب ہے تو وہ فقر ہی ہے کیونکہ یہ تصوف کی حقیقت کے قریب تر ہے۔[۱۲] مولانا سید ابو الحسن ندویؒ نے اس کے لئے تزکیہ نفس کا لفظ استعمال کیا ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ ''تزکیہ نفس و تہذیب اخلاق کا وسیع و مستحکم نظام جس نے بعد کی صدیوں میں ایک مستقل علم اور فن کی شکل اختیار کر لی اور جس کا عرفی و اصطلاحی نام بعد کی صدیوں میں تصوف پڑ گیا۔''[۱۳]

قرآن مجید اور تصوف دونوں میں اصلاح اور تربیت نفس کو بنیادی موضوع بنایا گیا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اہل تصوف میں قرآن مجید کی جس طرح باطنی تفسیر اور احادیث رسول ﷺ کی مخصوص روحانی پیرائے میں تشریح کی۔اس کی وجہ بلاشبہ اشاعت دین اور فرد کی روحانی نشو نما کے میدان میں گراں قدر خدمات کے اہل علم نے بالخصوص

(۷) الطوسی، ابو نصر، عبد اللہ بن علی سراج،، کتاب اللمع فی التصوف، ص ۲۲

(۸) الہجویری، ابو الحسن علی بن عثمان، کشف المحجوب، اسلام آباد، ۱۹۷۸ء، ص ۳۸

(۹) عبد الباقی، طہ، اعلام التصوف الاسلامی، مصر، ج ۲، حاشیہ، ص ۳۰

(۱۰) ذکی نجیب، ڈاکٹر، **جابر بن حیان**، مصر ۱۹۶۱ء، ص ۱۶

(۱۱) **اردو دائرہ معارف اسلامیہ**، دانش گاہ پنجاب، ج ۶، ص ۴۱۹

(۱۲) فراہی، عبید اللہ، ڈاکٹر، **تصوف ایک تجزیاتی مطالعہ**، دار التذکیر، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۴

(۱۳) ندوی، ابو الحسن علی، سید، تزکیہ **واحسان یا تصوف و سلوک**، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص ۲۹

تزکیہ نفس کا جو منہج پیش کیا اس کے اکثر اصول قرآن و سنت کی رو سے درست قرار نہیں دیے جاسکتے۔ تصوف تقاضا کرتا ہے کہ جس طرح ہمارا چہرہ کعبے کی طرف تھا اُسی طرح ہمارا دِل بھی ربِ کعبہ کی طرف ہو، تصوف دراصل تکمیلِ اِیمان و اِسلام ہے۔ حسنِ نیت اور حسنِ اِخلاص کے ساتھ اِسلام کے جملہ اَوامر کو بجالانے کا نام تصوف ہے۔

مولانا وحید الدین خان کا تصور تصوّف:

مولانا وحید الدین خان تصوف کے بارے میں بھی منفرد نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔ان کے نزدیک تصوف اپنی تمام صورتوں اور ناموں کے ساتھ اسلام کے لئے اجنبی ہے۔ شروع اسلام میں ایسا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ یہ بعد کے لوگوں کی اختراع ہے۔ مولانا کے نزدیک تصوف کا ابتدائی محرک یہ تھا کہ فقہ ظاہر کی طرح فقہ باطن بنائی جائے۔ اسی ضمن میں لکھتے ہیں:

> "فنی اصطلاحات کی زبان کسی شئی کے صرف خارجی پہلوؤں کا احاطہ کر سکتی ہے۔ اس لئے بندے اور خدا کے درمیان تعلق جیسے معاملہ کو فن کا موضوع بنانا دین میں ایک قسم کے عمل تفریق کو جگہ دینا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کیفیت محبت کے بیان کے لئے ریاضیاتی زبان کو استعمال کیا جائے۔ اس کوشش نے عبادت کے کیفی پہلو کو خارجی مظاہر سے الگ کر دیا۔ ذکر نے ورد کی صورت اختیار کر لی اور کثرت ذکر کے معنی یہ ہو گئے کہ کچھ مخصوص الفاظ کو تسبیح کے دانوں پر بتکرار دہرایا جاتا رہا۔"(۱۴)

تصوف کی حقیقت اور صوفیاء کے کلام سے ناواقف لوگوں نے اس کے افہام و تفہیم میں بہت دھوکے کھائے ہیں۔ انہوں نے الفاظ کے قطعی ظاہری پہلوؤں کو لے لیا اور خلق سے منقطع ہونے کا مطلب یہ سمجھا کہ صوفی وہ ہے جو گوشہ گیر ہو، دنیا سے دور بھاگتا ہو، کسی کونے کو اپنا مسکن سمجھتا ہو۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ صوفیاء کرام کی توضیحات او رتشریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انقطاع عن الخلق کو وہ گوشہ گیری اور رہبانیت کے مفہوم میں نہیں لیتے بلکہ وہ یہ مراد لیتے ہیں کہ آدمی اپنے سینے کو ان جذبات واحساسات سے خالی کر دے جو صرف دنیوی رشتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ لوگوں میں رہ کر ان کو اللہ سے ملانے کی تگ و دو میں لگائے رکھے۔

تصوّف، ایک متوازی مذہب:

مولانا وحیدالدین خاں کے مطابق تصوف ایک روحانی فن کی حیثیت سے ، قرآن و حدیث میں اجنبی ہے۔ تصوف کے نام سے سلوک اور تزکیہ کے جس فن کو کتابوں میں مدون کیا گیا ہے یا شیوخ اپنے مُریدوں کو جس کی

---

(۱۴) وحید الدین خان، مولانا، تجدید دین، ملک اینڈ کمپنی، لاہور، ۲۰۱۱ء ص ۴۶-۴۷

تعلیم دے رہے ہیں، وہ تمام تر ایک اضافہ ہے جو اپنی موجودہ شکل میں، قرآن و سنت کے اندر موجود نہیں ہے۔ تصوف کی وجہ تسمیہ کے متعلق مولانا موصوف کی رائے ہے کہ:

"پہلا شخص، جس کو اسلام کی تاریخ میں "صوفی" کے لفظ سے پکارا گیا، وہ ابو ہاشم الصوفی (م: ۱۵۰ھ) تھے۔ تاہم اس وقت تک صوفی معنی صرف یہ تھے کہ وہ شخص جو زُہد اور عبادت میں غلو کرے۔ چوں کہ یہ لوگ اچھے لباس کو چھوڑ کر صوف یعنی اُون کے معمولی کپڑے اپنے جسم پر لپیٹ لیتے تھے، اس لیے انہیں صوفی کہا جانے لگا۔ اس کے بعد زہد کے قواعد اور اصطلاحات بننے لگے۔ یہاں تک کہ تیسری صدی ہجری میں پہنچ کر تصوف نے اسلامی روحانیات کے ایک باقاعدہ فن کی شکل اختیار کر لی۔ اشراقی فلسفہ، رہبانیت اور ویدانت سے اس نے معاونت حاصل کی۔ اس طرح مختلف بیرونی عناصر کی مدد سے ایک ایسی چیز وجود میں آئی جس پر اسلام کا لیبل لگا ہوا تھا، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک متوازی مذہب تھا، جو اسلام کے اندر اسلام کے بالمقابل بنا یا دیا گیا تھا"[(۱۵)]

موجودہ تصوف کی اقسام:

مولانا وحید الدین خاں موجودہ تصوف کی تمام شکلوں کو غیر اسلامی تصور کرتے ہیں۔ اس کا تحلیل و تجزیہ کرتے ہوئے، تصوف کی شکلوں کی وضاحت کرتے ہیں کہ تصوف دو طرح کا ہے:

۱۔ مسنون تعبدی (عباداتی) طریقوں میں مقداری اضافہ۔

۲۔ مسنون تعبدی (عباداتی) طریقوں میں نوعی اضافہ۔[(۱۶)]

مولانا کے نزدیک ابتدائی دور کے صوفیاء میں، ان میں سے پہلی قسم کا تصوف رائج تھا۔ ان لوگوں نے نماز، روزہ، تلاوتِ قرآن وغیرہ، جو بذاتِ خود مسنون طریقِ عبادت ہیں، ان کی مقدار میں وہ حد بندی باقی نہ رکھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تھی۔ مثلاً، پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے پچھلے پہر کی کچھ رکعتیں (اکثر گیارہ رکعتیں) ادا فرماتے تھے۔ جبکہ ان بزرگوں نے ساری رات نماز پڑھنی شروع کر دی۔ آپؐ فرض روزوں کے علاوہ مہینہ میں چند دن مزید روزے رکھ لیتے تھے۔ ان حضرات نے مسلسل روزے رکھنے شروع کر دیے۔ اسی طرح تلاوتِ قرآن اور باقی عبادات کا حال تھا۔ عبادت کے مسنون طریقوں میں اس قسم کا اضافہ، صراحتاً ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ دلیل کے طور پر مولانا موصوف، بخاری و مسلم کی روایت جو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، بیان کرتے ہیں کہ تین مسلمان ازواجِ رسولؐ کے گھروں پر آئے اور آپؐ کی عبادت کے بارے میں دریافت

---

(۱۵) ایضاً، ص ۳۹

(۱۶) ایضاً، ص ۴۰

کیا۔ جب انہیں بتایا گیا تو انہیں آپؐ کی عبادت بہت کم معلوم ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارا کیا مقابلہ۔ آپؐ کے تو تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے گئے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا: میں تورات بھر نماز پڑھوں گا۔ دوسرے نے کہا، میں مسلسل روزے رکھوں گا۔ تیسرے نے کہا، میں تجرد کی زندگی اختیار کروں گا اور عورتوں سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے ایسی بات کی ہے۔ سنو، خدا کی قسم، میں تم سب میں سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں اور متقی ہوں۔ مگر میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ اور عورتوں سے نکاح کرتا ہوں۔ یہ میری سنت ہے، اور جو میری سنت کو چھوڑے وہ مجھ سے نہیں۔[۱۷]

مولانا موصوف کے نزدیک تصوف کی یہ پہلی قسم، قرآن کی رو سے اعتداء یعنی خود ساختہ ہے۔ جبکہ دوسری قسم قرآن کی رو سے ابتداع یعنی بدعت ہے۔

تصوف کی دوسری صورت کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا موصوف فرماتے ہیں کہ صحابہ ؓ کرام رضوان اللہ علیہ اجمعین، معاملات کے بارے میں کیے گئے اجتہاد کو قبول کرتے تھے جبکہ عبادات کے بارے میں بہت سخت تھے اور ذرا سی تبدیلی کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے[۱۸]

مثال کے طور پر عبد اللہ بن مغفل کے بیٹے فرماتے ہیں کہ میرے والد نے مجھ کو نماز میں کہتے ہوئے سنا بسم اللہ الرحمن الرحیم تو مجھ سے کہا، میرے بیٹے یہ نئی چیز ہے اور تم کو چاہیئے کہ نئی چیز سے بچو۔[۱۹]

مولانا وحید الدین خاں مزید لکھتے ہیں کہ نبوت کے بعد امّتِ مسلمہ میں جو فتنے پیدا ہوئے، ان کو شاہ ولی اللہ نے تیس تک شمار کیا ہے۔ اور دسواں فتنہ ان کے الفاظ میں یہ ہے۔ سنت ماثورہ میں جو، اوراد و وظائف آگئے ہیں، ان کے علاوہ اپنی طرف سے مزید اوراد و وظائف کا بہ نیت تقرب الی اللہ عزوجل یعنی ثواب پانے کی غرض سے اختراع کرنا اور امورِ مستحبہ کو مثل واجبات کے اپنے ذمہ لازم کر لینا، اور لوگوں میں ان وظائف کے پھیلانے کی رغبت کا دلوں میں پیدا ہونا۔[۲۰]

(۱۷) ایضاً، ص ۴۱

(۱۸) ایضاً، ص ۴۲

(۱۹) ایضاً، ص ۴۴

(۲۰) ایضاً، ص ۴۵

لاریب کہ صحابہ کرامؓ کے نزدیک دین میں کوئی نئی چیز نکالنا درست نہیں تھا، مگر جوں جوں حالات و واقعات تبدیل ہوتے اور عصری ضرورتیں دیکھی جاتیں تو ان کے مطابق ہی فیصلے کیے جاتے تھے۔ تاکہ عصری ضرورتوں کو پورا کیا جاسکے۔ مولانا وحید الدین صاحب صحابہ کرامؓ کے دور آج کے دور کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں تو یہ مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ کا فرمان ہے:

''إن الله عزوجل يحدث للناس أقضيه يحسب زمانهم وأحوالهم''(۲۱)

''اللہ تعالیٰ لوگوں کے فیصلے ان کے زمانے اور احوال کے مطابق کرتا ہے۔''

ان مسائل کو لازمی حل کرنے میں غور و فکر کو دخل دینا پڑے گا۔ جس طرح فقہائے کرام نے اپنے اپنے زمانے کے مسائل حل کرنے میں دخل دیا تھا۔ اور اسی طرح طعن و تشنیع کو برداشت کرنا پڑے گا۔ جس طرح آئمہ کرام نے کیا تھا۔

روحانی تہذیب:

مولانا وحید الدین خان کے نزدیک کہ انسان آج ناکام کیوں دکھائی دیتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسی چیز کی تلاش میں ہے جہاں وہ اپنی کوششوں سے پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ روحانی تہذیب کو تشکیل دے یہی اس کی کامیابی ہے۔ اسی ضمن میں لکھتے ہیں:

''مادی تہذیب وقتی دنیا کی تعمیر ہے اور روحانی تہذیب ابدی دنیا کی تعمیر۔ تاہم دونوں دنیاؤں میں کامیابی کا ایک ہی اصول ہے۔ قدرت کے متفرق اشاروں کو پڑھ کر ان سے ایک کامل نقشہ بنانا۔۔ اسی طرح آنے والی دنیا میں وہ لوگ کامیاب رہیں گے جنہوں نے اپنے اندر روحانی تہذیب کی تشکیل کی اور وہ لوگ برباد ہو کر رہ جائیں گے جو اپنے اندر روحانی تہذیب کی تشکیل نہ کر سکے''(۲۲)

مذکورہ بالا عبارت میں تو مولانا صاحب روحانی تہذیب کے دلدادہ نظر آتے ہیں، لیکن تصوف جس کا تعلق ہی روحانیت سے ہے اس سے تو کافی حد تک نالاں دکھائی دیتے ہوئے اسے متوازی مذہب قرار دیتے ہیں۔

---

(۲۱) امام شعرانی، عبد الوھاب، **کتاب المیزان**، مطبع الازہری، مصر، ۱۹۲۵ء، ج۱، ص۳۱

(۲۲) وحید الدین خان، مولانا، اسلام اور عصر حاضر، مکتبہ قاسم العلوم، لاہور، ص۱۱

مرشدِ کامل کا عقیدہ:

مولانا وحید الدین خان کے نزدیک جب تصوف کو باقاعدہ ایک روحانی فن کی حیثیت حاصل ہو گئی تو تصوف کے داعیین یعنی شیوخ کے بارے میں انتہائی مبالغہ آمیز قصے کہانیاں وضع کی گئیں اور ان کو عوام میں پھیلایا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام میں ایک شدید تر بدعت وجود میں آئی، اور وہ ہے "مرشد کامل کا عقیدہ" "تعلق مع اللہ کے لیے نماز، روزہ اور قرآن و سنت کی حیثیت پسِ منظر میں چلی گئی اور ان کی جگہ ایسے تصورات نے لے لی، جو بالکل غیر اسلامی تھے مثلاً یہ کہا جانے لگا کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ایک ایسا فن ہے جو خاص لوگوں کو معلوم ہے، اور اس سلسلے میں کی جانے والی عبادات، خاص انہی لوگوں کو معلوم ہیں اگرچہ یہ قرآن و سنت موجود نہیں ہیں۔ یہ شیوخ خاص قسم کے علوم کے مالک ہیں اور صرف یہی اپنی پیروی کرنے والوں میں ان علوم کو منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وغیرہ۔ لہذا ان لوگوں (یعنی شیوخ) سے تعلق اور عقیدت کو نجات کے لیے ضروری قرار دے دیا گیا۔ اسی ضمن میں مولانا وحید الدین خان لکھتے ہیں:

> "نتیجتاً ایسے لوگ جو ہندو جوگیوں اور عیسائی راہبوں کی طرز کا فنِ تسخیر رکھتے تھے، لوگوں میں معتبر ہوتے چلے گئے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ یہ لوگ صحابہ کرام سے بھی زیادہ بلند مرتبے کے لوگ ہیں۔"[۲۳]

اس کی وضاحت میں مزید لکھتے ہیں:

> "بزرگ پرستی (دوسرے لفظوں میں بزرگی کی گدی وجود میں آنے) کا سلسلہ یہیں نہیں رکا۔ اب وہ اپنے بزرگوں کو عام انسانوں سے ایک الگ مستقل طبقہ فرض کرنے لگے جس طرح انبیاء اور ملائکہ عام انسانوں سے الگ ایک طبقہ ہوتے ہیں اور ان کی طرف سے ایسے ایسے فضائل منسوب کرنے لگے جو مضحکہ خیز حد تک بے معنی تھے۔ اسی میں سے اولیاء اللہ کا مروجہ تصور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اولیاء اللہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اہل ارشاد اور دوسرا اہل تکوین۔۔۔ گویا کہ اہل ارشاد انبیاء کے مماثل ہیں اور اہل تکوین فرشتوں کے مماثل جن کو مدبرات الامر کہا گیا ہے۔ حیرت انگیز بات ہے کہ اتنا بڑا عقیدہ بے شمار لوگوں نے نہایت اخلاص کے ساتھ قبول کر لیا۔"[۲۴]

---

(۲۳) وحید الدین خان، مولانا، تجدید دین، ص ۴۹، ۵۰

(۲۴) ایضاً، ص ۵۰۔۵۱

کشف و کرامات کی حقیقت:

مولانا وحید الدین خان کے نزدیک اولیاء کے کشف و کرامات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ محض قصہ و کہانی کو منسوب کر کے وسعت دی جارہی ہے۔ جس کے نتیجے میں لوگوں کے دلوں سے خوف خدا اور رجوع الی اللہ ختم ہو رہا ہے اور لوگوں میں دین کے بارے میں جرأت پیدا ہو رہی ہے۔ لوگ دین کی عزت کی بجائے، صوفی کی عزت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں۔

"ان بزرگوں سے منسوب خارقِ عادت واقعات کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بالکل ایک غیر اسلامی تصور ہے۔ اور اس طرح کے واقعات جو صحابہؓ کرام سے منسوب ہیں، ان واقعات کی نوعیت اس سے یکسر مختلف ہے جو ان صوفیاء کی طرف منسوب ہیں۔ صحابہؓ کرام اللہ تعالیٰ سے تعلق کے نتیجے میں، دعا کے ذریعے سے جب اللہ تعالیٰ کی نصرت طلب کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مدد کی شکل میں ان کے حق میں بعض ایسی کرامتیں ظاہر ہو جاتی تھیں جن کے نتیجے میں معاشرے میں ظلم ختم ہوتا تھا اور باطل قوتیں زیر ہو جاتی تھیں۔ اور لوگوں میں رجوع الی اللہ کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ جبکہ موجودہ تصوف میں ایسے واقعات کا نتیجہ اس کے برعکس نکل رہا ہے۔ انسانیت میں ظلم بڑھتا جارہا ہے اور عوام میں رجوع الی اللہ پیدا ہونے کی بجائے، ان نام نہاد بزرگوں کی عظمت اور رعب پیدا ہو رہا ہے۔"(۲۵)

صحابہؓ کرام کا عمل:

مولانا وحید الدین خان کے نزدیک صحابہؓ کرام، عبادت کے معاملہ میں بہت حساس تھے اور معمولی سی تبدیلی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ اور ان کے لیے یہ بات ناقابل تسلیم تھی کہ خدا کے دین کو ایسے ایک باقاعدہ فن کی شکل دے دی جائے جس طرح آج یہ موجود ہے، اور تعلق مع اللہ کے نام پر ایک مستقل ادارہ تشکیل دے دیا جائے، بزرگی کے نام پر لوگ شاہانہ طرز کی زندگی بسر کریں اور یہ منصب بادشاہوں کی طرح شاہانہ طور پر ایک فرد سے دوسرے فرد کی طرف منتقل ہو، جیسا کہ تصوف کے نام پر موجودہ دور میں ہو رہا ہے۔ صحابہؓ کرام کا عمل تو ہمیں بتاتا ہے کہ عام مسلمانوں میں ایسی اخلاقی جرأت پیدا کی جائے کہ وہ حاکمِ وقت سے بھی باز پرس کر سکیں۔ اور کسی شخص کو اپنا مقتدا بنانے کے لیے شخصی عقیدت مندی کی بجائے اس کی صداقت اور کردار کو پرکھیں۔ اور اس سلسلے میں صحابہؓ کرام کی رائے یہ تھی کہ نبی کے سوا کوئی بھی شخص معصوم نہیں ہے۔ کوئی شخص جب تک زندہ ہے، وہ کسی بھی وقت، راہِ راست سے ہٹ

(۲۵) ایضاً، ص ۵۰

سکتا ہے۔ اس لیے اقتداء صرف ایسے لوگوں کی کرنی چاہیے، جو اس دنیا سے جاچکے ہوں، کیوں ان کی صداقت پوری طرح واضح ہوچکی ہوتی ہے۔

”حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: رجال کی سنت پکڑنے سے بچو۔ اس لیے کہ آدمی جنت والوں کا عمل کرتا ہے، پھر اللہ کے علم کے مطابق پلٹ جاتا ہے اور آگ (جہنم) والوں کا عمل کرنے لگتا ہے۔ پھر اسی حال میں مر جاتا ہے۔ اور بے شک آدمی آگ والوں کا عمل کرتا ہے، پھر اللہ کے علم کے مطابق پلٹ جاتا ہے اور جنت والوں کا عمل کرنے لگتا ہے اور اسی حال میں مرجاتا ہے کہ وہ جنت والوں میں سے ہوتا ہے۔ پس اگر تمہیں لوگوں کی اقتداء ہی کرنی ہے تو مرے ہوئے لوگوں کی اقتداء کرو نہ کہ زندہ لوگوں کی۔“[۲۶]

مولانا کے نزدیک صحابہ کرامؓ کی جو کرامات تھیں وہ صرف اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت تھی مگر جو موجودہ ہمارے بزرگان کا حال ہے وہ بے بسی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ ان کے چاروں اطراف باطل قوتیں اسلام اور ملت کو روند رہی ہیں اور وہ ان کے دفعیہ کے لئے کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ اسی ضمن میں لکھتے ہیں:

”صحابہ کرام کے بعض خارق عادات واقعات جو صحیح روایات میں آتے ہیں وہ ہرگز کرامت کے واقعات نہیں۔ ان کی حیثیت اہل ایمان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی نصرت کی ہے۔ کرامت بطور ایک شخصی صفت کے، قطعاً ایک غیر اسلامی تصور ہے۔ اسلام میں جو چیز ثابت ہے وہ صرف دعا اور اس کی مقبولیت کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی نصرت ہے۔“[۲۷]

مولانا مزید لکھتے ہیں:

”عبادتی امور میں صحابہ کرام کس قدر حساس تھے اور معمولی جدت کو بھی انتہائی طور پر ناپسند کرتے تھے۔ کجا کہ یہ اضافے اتنے زیادہ ہوجائیں کہ وہ متوازی مذہب بن جائے اور باقاعدہ اس کے ماہرین اور معلمین پیدا ہونے لگیں اور آج بدقسمتی سے امت مسلمہ کی صورت حال یہی ہے۔“[۲۸]

مولانا کے نزدیک یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ تصوف اور خاص طور پر برصغیر کے تصوف سے نالاں دکھائی دیتے ہیں۔ وہ تصوف کی تمام شکلوں کو ہی تصوف قرار دیتے ہیں جبکہ ایسی صورت میں میانہ روی اختیار کی جاتی تو بہتر تھا۔

---

(۲۶) عبد البر، علامہ، جامع بیان العلم، جلد ۲، صفحہ ۱۱۴

(۲۷) وحید الدین خان، مولانا، تجدیدِ دین، ص ۵۰

(۲۸) ایضاً، ص ۴۶

اگر کہیں مولانا صاحب کو اضافت نظر آتی تو اس کی اصلاح فرماتے نہ کہ سب کو ہی رگڑا لگاتے ہوئے متوازی مذہب قرار دے دیتے۔

تزکیہ نفس:

مولانا وحید الدین خان تصوف کو حقیقت تسلیم نہیں کرتے، اسلام نہیں بلکہ مذہب کی تاریخ میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے تزکیہ نفس کی بنیاد قلب کی بجائے عقل کو بنایا ہے۔ اسی ضمن میں لکھتے ہیں:

"دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن کا تزکیہ مبنی بر عقل تزکیہ ہے، نہ کہ مبنی بر قلب تزکیہ۔ اس سلسلے میں قلب کا لفظ قرآن اور حدیث میں لٹریری معنوں میں استعمال کیا گیا ہے نہ کہ سائنسی معنوں میں۔ جدید تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ انسان کا قلب خون کی گردش کے لئے صرف ایک پمپ کا کام کرتا ہے۔ قلب کے اندر سوچنے کی صلاحیت موجود نہیں۔ تزکیہ کا مقصد بھی دماغ کی سطح پر سوچنے کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، نہ کہ قلب پر مفروضہ توجہ دینے سے۔۔ قلب پر توجہ دینا اتنا ہی زیادہ بے بنیاد ہے جتنا کہ حصول تزکیہ کے لئے ناخن یا بال پر توجہ دینا۔"(۲۹)

مولانا صاحب کا یہ تصور کہ کتاب و سنت کے تزکیہ نفس کے تصور کی بنیاد قلب نہیں ہے تو یہ بات کتاب و سنت کے بالکل متضاد ہے۔ جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

''ألا وإن في الجسد مضغة إذا صلحت صلح الجسد كله وإذا فسدت فسد الجسد كله ألا وهي القلب''(۳۰)

"انسان کے جسم میں ایک عضو ہے اگر وہ صالح ہو جائے تو سارا جسم صالح ہو جائے اور اگر وہ فاسد ہو جائے تو سارا جسم فاسد ہو جائے، آگاہ ہو جاؤ وہ قلب ہے۔"

اس حدیث مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ قلب ہی انسانی جسم کے بناؤ اور بگاڑ کی بنیاد ہے جبکہ مولانا صاحب عقل کو بنیاد گردانتے ہیں۔

---

(۲۹) الرسالہ، ماہنامہ، فروری، ۲۰۱۱، ص ۱۳

(۳۰) القشیری، حجاج بن مسلم، الصحیح المسلم، کتاب المساقاۃ، باب اخذ الحلال وترک الشبہات،

اسی طرح مولانا مودودی بھی تصوف کی اصطلاح کی بجائے تزکیہ نفس کو استعمال میں لاتے ہیں ۔ وہ فرد کی اصلاح کو معاشرتی اصلاح کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔لہذا اس کے لئے باطنی اور روحانی اصلاح کے ساتھ ساتھ ظاہری اصلاح کی اہمیت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"نفس کو بری صفات سے پاک کیا جائے اور اچھی صفات کی آبیاری سے اس کو نشو نما دی جائے۔"(۳۱)

شیخ علی ہجویریؒ فرماتے ہیں:

"آدمی نمونہ ہے کل عالم کا اور عالم نام ہے دو جہاں کا اور انسان میں دونوں جہانوں کا نشان موجود ہے۔(۳۲)فطری خواہشات اور طبعی میلانات کو بھی اہل تصوف نے ہوائے نفس کا نام دیا ہے، چنانچہ چالیس دن تک ترک طعام کو اس خیال سے ٹھہرایا ہے کہ اس سے پہلے سچی بھوک لگتی ہی نہیں اور اس دوران اگر کھانے کی طلب ہو تو اسے انہوں نے حرص اور غرور طمع پر محمول کیا ہے۔"(۳۳)

تزکیہ نفس کے نام پر تصوف کا اعتبار قائم و دائم ہے ،اس لئے کہ انہوں نے تصفیہ باطن ،اور تطہیر قلب کا نیک اور مبارک کام انجام دینے کی کوشش کی ہے۔اسی طرح اہل تصوف کے رذائل اخلاق کو دور کرنے اور قلبی امراض کے علاج کے لئے جو نسخے تجویز کیے ہیں یا جو طریقے اپنائے اس میں کون سے اصول ان کے سامنے رہے ہیں۔اس سلسلہ میں امام غزالیؒ نے ایک بہت ہی بنیادی بات کی ہے:

"اس کی عام ترسبیل یہ ہے کہ نفس جس چیز کی بھی خواہش کرے اور جدھر بھی مائل ہو ان سب کے معاملہ میں مخالفانہ روشن اختیار کی جائے۔"(۳۴)

طرقِ تزکیہ:

مولانا کے نزدیک جب تعلق مع اللہ ایک خارجی طور پر قابل بیان چیز بن گیا تو اس کے بعد بالکل فطری طور پر اس کے حصول کے مختلف طریقے شروع کئے گئے جس کی گنجائش قرآن و سنت اور اسلامی شریعت میں نہ ہے بلکہ یہ سب قیاس آرائیاں ہیں۔اسی ضمن میں لکھتے ہیں:

---

(۳۱) شیخ احمد، **مولانا مودودی اور تصوف**، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۲۰۳

(۳۲) الہجویری، ابو الحسن علی بن عثمان، **کشف المحجوب**، ص ۱۷۸

(۳۳) ایضاً، ص ۲۸۴

(۳۴) الغزالی، ابو حامد محمد، **احیاء علوم الدین**، مصر ۱۹۲۵ء، ج ۳، ص ۵۴

"محض قیاس کی بنیاد پر یہ فرض کر لیا گیا کہ انسان کے بدن میں چھ مقامات ہیں جہاں انوار و برکات بھرے ہوتے ہیں ان کو لطائف ستہ کا نام دیا گیا ہے۔

۱۔ لطیفہ قلبی (جس کی جگہ بائیں پستان کے نیچے ہے)

۲۔ لطیفہ روحی (جس کا مقام دائیں پستان کے اوپر ہے)

۳۔ لطیفہ نفس (جس کا مقام ناف کے نیچے ہے)

۴۔ لطیفہ سری (جس کا مقام سینہ کے درمیان ہے)

۵۔ لطیفہ خفی (جس کا مقام ابرو کے اوپر ہے)

۶۔ لطیفہ اخفی (جس کا مقام ام الدماغ ہے)

اس مفروضہ کی بنا پر عجیب عجیب قسم کے اشغال، ضربات اور مراقبے وضع کیے گئے جن کا مقصد یہ تھا کہ ان مقامات انور پر زور ڈال کر ان کو جاری کیا جائے تاکہ سارا جسم اللہ اللہ پکارنے لگے"(۳۵)

مولانا کے نزدیک معروف دینی طریقوں کے مقابلے میں جو طریقے تصوف کے حصول مقصد کے لئے اپنائے گئے یہ حقیقت میں ایک واہمہ تھے۔ ان لفظی ورزشوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی ضمن میں مزید لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ محض یہ ایک واہمہ ہے۔ قلب اور تنفس تو درکنار کسی مشین کی کھٹ کھٹ کی آواز میں آواز ملا کر اگر آپ حق حق کہنے لگیں تو کچھ دیر کی مشق کے بعد آپ کو محسوس ہو گا گویا مشین سے کھٹ کھٹ کی نہیں حق حق کی آواز آرہی ہے مگر شدید ترین غلط فہمی ہو گی کہ اس قسم کے واہمہ کو ذکر سمجھ لیا جائے۔"(۳۶)

جبکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾(۳۷)

"یعنی ایسے لوگوں کو جو ایمان لائے اور ان کے دلوں کو چین ملتا ہے اللہ (پاک) کے ذکر سے، آگاہ رہو کہ اللہ کے ذکر ہی سے چین ملتا ہے دلوں کو"

---

(۳۵) تجدید دین، ص ۴۷۔۴۸

(۳۶) ایضاً، ص ۴۸۔۴۹

(۳۷) الرعد ۱۳:۲۸

تصوف سے متعلق وحید الزمان کا منفی نظریہ:

مولانا وحید الدین خان کے نزدیک تصوف عیسائیت اور ہندو جوگیوں کا فن تسخیر ہے جو کہ اب اسلامی لباس اختیار کر چکا ہے۔ چنانچہ وہ تصوف کو ہندو جوگیوں اور عیسائی راہبوں کے طرز کا ایک فن قرار دیتے ہیں اسی ضمن میں لکھتے ہیں:

"اب ایسے بزرگ پیدا ہونے لگے جو اس قسم کا کرشمہ دکھا سکتے تھے کہ ایک نظر سے آدمی کو تڑپا دیں اور ایک توجہ سے قلوب کو بدل ڈالیں۔ اس طرح عیسائی رہبانوں اور ہندو جوگیوں کا فن تسخیر اسلامی لباس اختیار کر کے دین محمدی میں داخل ہو گیا۔"[۳۸]

مزید لکھتے ہیں:

"ایسے لوگ جو ہندو جوگیوں اور عیسائی راہبوں کی طرز کا فنِ تسخیر رکھتے تھے، لوگوں میں معتبر ہوتے چلے گئے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ یہ لوگ صحابہ کرام سے بھی زیادہ بلند مرتبے کے لوگ ہیں۔"[۳۹]

مولانا وحید الدین خان ایسے کسی تربیتی نظام کے اثرات کے قائل نہیں ہیں بلکہ ان کے نزدیک تصوف اپنی تمام صورتوں اور ناموں کے ساتھ اسلام کے لئے اجنبی ہے۔ شروع اسلام میں ایسا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ یہ بعد کے لوگوں کی اختراع ہے۔

"اسی طرح تصوف کے وہ طریقے جو سماع اور رقص کو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ بتاتے ہیں حتیٰ کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو امرد پرستی کو قرب الٰہی کا سبب سمجھتے ہیں۔"[۴۰]

مولانا وحید الدین خان تصوف کو اسلام میں ایک اجنبی اور متوازی مذہب سمجھتے ہیں جو کہ عیسائی رہبانیت اور ہندو جوگیوں کی محنت و ریاضت سے مستعار ہے۔ اس کی دین اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مولانا صاحب اگر وعظ و نصیحت تک محدود رہتے تو ان کا یہ کام قابل قدر ہے لیکن انہوں نے جو فکری اعتبار سے مثلاً فقہ، تصوف اور علم الکلام وغیرہ کی اصلاح کا جو بیڑہ اٹھانے کی سعی کی ہے وہ ناممکن دکھائی دیتی ہے۔

---

(۳۸) وحید الدین خان، مولانا، تجدیدِ دین، ص۴۹

(۳۹) ایضاً، ص۴۹ - ۵۰

(۴۰) ایضاً، ۴۰

خلاصہ بحث:

۱. مولانا وحید الدین خان کے نزدیک تصوف ایک متوازی مذہب ہے۔
۲. مولانا کے نزدیک تصوف کا مقصد مسنون اعمال اور مقدار میں نوعی اضافہ ہے اور فن تصوف کے پیشواؤں کے متعلق روایات اور فرضی کہانیوں کا تسلسل ہے جس میں ان کے کشف و کرامات کو منسوب کیا جاتا ہے۔
۳. مولانا کے نزدیک تصوف ایک بالکل غیر اسلامی طریقہ ہے۔
۴. مولانا کے نزدیک کشف و کرامت کی کوئی حقیقت نہیں یہ صرف قصہ اور کہانیاں ہیں۔
۵. مولانا کے نزدیک مرشد کامل اور تصور شیخ عیسائی رہبانیت اور ہندو جوگیوں کی محنت و ریاضت سے مستعار ہے۔
٦. مولانا وحید الدین خان تصوف کو حقیقت تسلیم نہیں کرتے، اسلام نہیں بلکہ مذہب کی تاریخ میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے تزکیہ نفس کی بنیاد قلب کی بجائے عقل کو بنایا ہے۔

بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ میں اسلام کا تصورِ رواداری

☆ محمد اقبال

☆☆ شگفتہ سید

ABSTRACT

This research analysis highlights the concept of Islam about tolerance, harmony, permissiveness and sympathy to all humanity. It also rejects the negative propaganda of those who wrote that Islam is a religion of cruelty and extremism, the passion of Jihad spares the Muslims to exercise any kind of cruelty with the people of other religions. Although the reality is other way round. This research explains the reality that Islam is not only the religion of peace and love but also teaches the lesson of the rights of other religions and emphasizes to give them religious independence with great tolerance.

Keywords:Peace, Islam, Harmony, Tolerance.

اسلام امن، محبت، اخوت اور رواداری کا درس دیتا ہے۔ یہ ایسے لوگوں کی سوچ کی نفی کرتا ہے جو اسلام کو شدت، انتہاء پسندی اور ظلم و ستم کے دین سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسلام جہاں دیگر انسانی حقوق کی بات کرتا ہے وہیں مذہبی رواداری پر بھی زور دیتا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث نبویہ کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اسلام نے صرف مذہبی رواداری پر ہی زور نہیں دیا بلکہ اخلاقی، معاشی اور معاشرتی رواداری پر بھی زور دیا ہے۔

اسلام باہمی محبت، اخوت، انصاف اور رواداری کا درس دیتا ہے۔ دینِ اسلام کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ غیر مسلموں کے حقوق پر جتنا زور دیتا ہے اتنا روئے زمین پر کوئی بھی مذہب دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ حُسنِ سلوک پر زور نہیں دیتا۔ یہ دینِ اسلام ہی کا خاصہ ہے کہ جس نے غیر مسلموں کو بھی حقوق دینے کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھ رواداری کا درس دیا۔ دین اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس کا مزاج تکریمِ

☆ پی۔ایچ۔ڈی اسکالر، منہاج یونیورسٹی، لاہور

☆☆ ایم۔فل اسکالر، اسلامک سٹڈیز

انسانیت، نفع بخشی اور فیض رسانی ہے۔ قرآن مجید کے مطابق امت مسلمہ انسانوں کی خیر وفلاح کے لیے پیدا کی گئی ہے۔(۱)

جو بلا تفریقِ مسلک ومذہب پوری انسانیت کے لیے سر تاپاباعثِ خیر ہے۔ اسلامی تعلیمات میں مذہبی فرائض کے بعد انسانیت کی خدمت اور ان کے ساتھ رواداری کے ساتھ پیش آنا ایک مقدس فریضہ ہے۔ یہ ملتِ اسلامیہ کی بدقسمتی ہے کہ بعض لوگوں نے صرف نماز، روزہ، حج اور زکوۃ کو ہی عبادت سمجھ رکھا ہے اور دیگر اَخلاقیات، معاملات اور دیگر معاشرے کو عملاً دین کے دائرے سے خارج کر دیا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے جہاں صوم، صلوۃ، حج، عمرہ کے احکامات کی ترغیب دی وہاں آقا علیہ السلام نے حقوق العباد کی بھی تعلیم دی جس کا مطلب صاف ہے کہ صرف عباداتِ اسلامیہ پر عمل پیرا ہونا ہی سب کچھ نہیں بلکہ حقوق اللہ کے مقابلے میں حقوق العباد کی زیادہ اہمیت ہے۔

اسلام ہر رنگ، مذہب اور نسل کے لوگوں کے ساتھ رواداری کے ساتھ پیش آنے کی تعلیم دیتا ہے۔

ا۔ رواداری کا لغوی معنی ومفہوم

لغت کے اعتبار سے 'روا' کا معنی جائز سمجھنا اور 'داری' کا مطلب رکھنا ہے۔(۲) لیکن اصطلاحا اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان یا کوئی گروہ یا حکومت ان باتوں کو جنہیں وہ اصولی طور پر اپنے دائرے میں غلط سمجھتی ہے لیکن دوسروں کے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے انہیں برداشت کرے۔ ان باتوں کو ناپسند کرتے ہوئے دوسرے انسانوں کو جو ان باتوں کو پسند کرتے ہوں ان کو اختیار کرنے دے۔(۳)

ڈاکٹر سید باشہریار نے فرہنگ اردو، فارسی میں رواداری کی درج ذیل تعریف کی ہے:

"روا (اس مذ) جایز مجاز، وداری (اس مث) جایز دانستن کاری یا چیزی یا امری تحمل"(۴)

"رواداری (دو کلمات کا مجموعہ ہے) جن میں روا اسم مذکر ہے اور اس کا معنی کسی بات کو جائز رکھنا ہے۔ یعنی وہ بات جس کی اجازت دی گئی ہو اور (داری) اسم مؤنث ہے اس سے مراد کسی چیز، کام یا معاملے کو جائز سمجھنا اور تحمل اختیار کرنا ہے۔"

اس تعریف کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رواداری، فارسی الاَصل لفظ ہے اور عصر حاضر میں یہ لفظ اردو میں بہت زیادہ مستعمل ہے۔ اردو زبان میں اس کا معنی روا رکھنا، جائز، مباح اور منظور کرنا مراد لیا جاتا ہے۔

The Collinsڈکشنری میں رواداری کی تعریف

"Broad-mindness, charity, forbearance, indulgence, lenity, magnanimity, open-mindness, patience, permissiveness, sufferance, sympathy."(۵)

آکفسورڈ کشنری میں رواداری کی تعریف

"The willingness to accept or tolerate, especially opinions or behavior that you may not agree with, or people who are not like your." (۶)

مذکورہ مختلف اردو، فارسی اورانگریزی لغات کی روشنی میں اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ رواداری انسان کے ایسے رویے، عمل اور سوچ کا نام ہے جس میں تحمل، برداشت، بردباری، جودوکرم، سخاوت اور دوسروں کے لیے سہولت اور آسانی پیدا کرنے کے اوصاف حمیدہ پائے جاتے ہیں وہ رویہ، سوچ اور عمل مذہبی تصورات کے حوالے سے بھی ہو سکتی ہے اور معاشرتی صورت میں بھی، گویا رواداری ایک ایسا جوہر ہے جس میں ایک شخص اپنے تصورات اور اعتقادات پر قائم رہتے ہوئے دوسرے شخص کے وجود اور اس کے تصورات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے۔

۲۔رواداری کی اصطلاحی تعریف

رواداری کا اصطلاحی معنی ومفہوم یہ ہے کہ رواداری اس صفت کا نام ہے جو تعصب، انفرادیت، جبر،زبردستی، ہٹ دھرمی کے متضاد ہو اور جس میں کسی فعل کو رعائت جت ساتھ مباح اور جائز رکھا جائے۔جس میں دوسرے ادیان کے افراد کے تصورات ونظریات کو تحمل سے برداشت کیا جائے۔(۷)

رواداری ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا آغاز مختلف ادیان کے محققین علماء نے اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں کیا۔ابن عاشور جو دور جدید کے عظیم محقق گزرے ہیں،نے رواداری کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اسی طرح علامہ ماجد غرباوی لفظِ 'رواداری' کی تاریخ کے متعلق لکھتے ہیں کہ رواداری کا لفظ بطور اِصطلاح (۱۷-۱۸ام) میں متعارف ہوا۔(۸)یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ رواداری مختلف ادیان کے مابین خوشگوار رویے کے اپنائے جانے کا نام ہے۔

۳۔ڈاکٹر جمیل صلیبا کے نزدیک رواداری کی تعریف

''أن تترك لكل إنسان حرية التعبير عن آرائه وإن كانت مضادة لآرائك. وقريب من هذا المعنى قول (غوبلو) إن التسامح لا يوجب على المرء التخلي عن معتقداته، أو الامتناع عن إظهارها، أو الدفاع عنها، أو التعصب لها، بل يوجب عليه الامتناع عن نشر آرائه بالقوة والقسر والقدح والخداع. أن يحترم المرء آراء غيره لاعتقاده أنها محاولة للتعبير عن جانب من جوانب الحقيقة، وإنما هو واجب أخلاقي ناشئ عن احترام الشخصية الإنسانية.''(۹)

"رواداری سے مراد یہ ہے کہ انسان دوسروں کو آزادی رائے کے بیان کرنے کے لیے کھلا چھوڑ دے اور اسی بات کے قریب مشہور فلاسفر (Goblo) کا رواداری کے متعلق قول ہے کہ: رواداری انسان پر یہ واجب نہیں کرتی کہ انسان اپنے عقائد کو چھوڑ دے یا اپنے عقائد کا اظہار کرنے سے رُک جائے، یا اُس کا دفاع کرنے سے رُک جائے، یا اپنے عقیدے کے لیے دوسروں کے ساتھ تعصب کے ساتھ کام لے، بلکہ رواداری انسان پر یہ واجب کرتی ہے کہ انسان اپنی آراء اور افکار کو دوسروں پر طاقت، جبر اور دھوکے کے ساتھ لاگو نہ کرے۔(نیز رواداری)انسان کو یہ بھی سکھاتی ہے کہ انسان دوسروں کی آراء کا احترام کرے یہ انسان کی شخصی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔"

مذکورہ بالا اصطلاحی تعریفات کے مطابق رواداری کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کے عقائد یا اعمال ہمارے نزدیک غلط ہیں انہیں ہم برداشت کریں۔ ان کے جذبات کا لحاظ کر کے ان پر ایسی نکتہ چینی نہ کریں جو انہیں رنج پہنچانے والی ہو اور انہیں ان کے اعتقا د سے پھیرنے یا ان کے عمل سے روکنے کے لیے زبردستی کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ اس قسم کا تحمل اور اس طریقے سے لوگوں کو اعتقاد و عمل کی آزادی دینا نہ صرف ایک مستحسن عمل ہے بلکہ امن و سلامتی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔

۴۔رواداری کی اَخلاقی اہمیت

اَخلاقی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو رواداری کی صفت بڑی اہم اور ضروری ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی ایک شے کے بارے میں تمام بنی نوع انسان کا ایک نقطۂ نظر پر متحد ہو جانا مختلف وجوہ سے ممکن نہیں۔ ہمیں اَخلاقی اور نظریاتی حوالے سے ایک دوسرے کے مذہب، مسلک اور اَفکار کی قدر کرنی چاہیے۔ اَخلاقی رواداری کے حوالے سے متین طارق کہتے ہیں:

”اَفراد اور قوموں کی طبیعتوں کے اختلافات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خندہ پیشانی سے دوسروں کے جذبات کا احترام کرنا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔“(۱۰)

۵۔رواداری کی دینی اور مذہبی حیثیت

دینِ اسلام کے آسان ہونے کا تصور آج کا نہیں بلکہ آج سے ۱۴سو سال قبل کا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ امت کو آسانی، رحمت اور شفقت کی تعلیم دیتے رہے۔ آج ایک طرف تنگ ذہن، محدود مطالعہ اور سطحی شعور کے حامل بعض لوگ ان باتوں کو سننے کے روادار نہیں اور دوسری طرف غیر مسلم اور اہل اسلام دونوں کی جدید نسلوں میں سیکولر ذہن رکھنے والے بھی یہی سوچتے ہیں کہ شاید اسلام میں واقعتاً شفقت، نرمی اور رواداری کا کوئی تصور نہیں۔ ان تینوں طبقات کی یہ سوچیں لاعلمی، بے خبری اور تعصب سے جنم لیتی ہے۔ اہلِ علم اور اہلِ شعور نے دینِ اسلام کے ’آسان‘ ہونے پر باقاعدہ ابواب قائم کئے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ (۱۱)

”بے شک دین آسان ہے اور جو اسے مشکل بنائے گا تو یہ اس پر غالب آجائے گا۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

هلكَ المُتَنَطِّعُون. (۱۲)

یعنی اسلام سراسر رواداری، محبت اور امن کا دین ہے۔ سختی اور انتہا پسندی کو اپنانے والے کو دینِ اسلام نے کبھی برداشت نہیں کیا۔ یعنی حضور نبی اکرم ﷺ نے چودہ صدیاں قبل پہلے دہشت گردی اور شدت پسندی کی بیخ کنی کے لیے یہ سنہری اصول عطا فرمایا اور دینِ اسلام نے انسانیت کی خاطر امن، محبت اور رواداری کا قانون عطا کیا۔

مذہبی عقائد کا نظام اس دنیا پر موجود ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ تمام انسان ایک ہی نظامِ فکر کے پابند ہو جائیں اور تفصیلات میں بھی ان کے درمیان بُعد نہ رہے۔ اس لیے محض اختلافاتِ عقائد کی بنا پر کسی شخص سے بُغض وعناد رکھنا ہر مذہب کے نزدیک ناپسندیدہ عمل ہے۔ محقق طارق متین لکھتے ہیں کہ:

”خدا کے نزدیک ایسا شخص بھی مبغوض ہے جو دو پیاسے آدمیوں میں امتیاز کرے کہ اپنے قبیلے کے آدمیوں کو پانی پلائے اور دوسرے شخص کو پانی سے اس لیے محروم رکھے کہ وہ اس قبیلے کا نہیں جبکہ خود خدا کی رحمت کی گھٹائیں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی پر برابر برستی ہیں اور وہ ہر ذی روح کے لیے اس کی ضرورت کا سامان مہیا کرتا ہے تو پھر

ہمارے لیے کہاں زیبا ہے کہ ہم محض اس بناپر کہ کوئی دوسرا فرد یا گروہ ہمارے خیالات وعقائد کا حامل نہیں اُس سے عناد رکھیں اور اس پر ظلم وزیادتی کریں؟۔"(۱۳)

۶۔ مذہبی آزادی میں اسلام کے اعلیٰ اخلاقی اصول

اسلام خدائے واحد کی بندگی کی دعوت دیتا ہے لیکن دوسرے مذاہب کے لوگوں پر اپنے عقائد بدلنے اور اسلام قبول کرنے کے لیے دباؤ نہیں ڈالتا، نہ کسی جبر واکراہ سے کام لیتا ہے۔ دعوتِ حق اور جبر واکراہ بالکل الگ حقیقتیں ہیں۔ اسلام کے پیغام حق کے ابلاغ کا طریقہ اور اسلوب قرآنِ کریم نے بیان کرتے ہوئے کہا:

﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ﴾ (١٤)

"(اے رسولِ معظّم!) آپ اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلائیے اور ان سے بحث (بھی) ایسے انداز سے کیجئے جو نہایت حسین ہو، بے شک آپ کا رب اس شخص کو (بھی) خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹک گیا اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں کو (بھی) خوب جانتا ہے۔"

اسلام نے ایسے طریق دعوت سے منع کیا جس سے کسی فریق کی مذہبی آزادی متاثر ہوتی ہو۔ شریعت کی یہ حکمت عملی ہے کہ غیر مسلموں کو ان کے مذہب ومسلک پر برقرار رہنے کی پوری آزادی ہوگی۔ اسلامی مملکت ان کے عقیدہ وعبادت سے تعرض نہ کرے گی۔ مختلف ادوار میں گرجا گھر اور کلیسے اسلامی حکومت میں موجود رہے ہیں۔ کبھی بھی انہیں ادنیٰ گزند تک نہیں پہنچائی گئی بلکہ حکومت نے ان کی حفاظت کی ہے اور غیر مسلموں کو ان میں عبادات کی انجام دہی کے لیے سہولیات فراہم کی ہیں۔

۷۔ نرمی اور اخلاقِ حسنہ کا اشاعتِ اسلام میں کردار

حضور نبی اکرم ﷺ نے جب دینِ اسلام کی تبلیغ شروع فرمائی تو آپ کے ساتھ چند اَفراد تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کی نصرف ومدد کے ساتھ آپ ﷺ کا سب سے بڑا سہارا آپ کا اعلیٰ انسانی کردار تھا۔ آپ ﷺ نے اپنے وہل وعیال کے ساتھ زندگی گزاری، تجارت بھی کی، دوست ودشمن سے تعلقات بھی رکھے مگر ہر حال میں آپ ﷺ اپنے ہم وطنوں کی نظروں میں پاکیزہ اور اَرفع دکھائی دیئے۔ جب اعلانِ نبوت فرمایا تو آپ کی زندگی جو جلوت میں رہی خلوت گزیں ہوگئی۔ یا آپ ﷺ حقوق اللہ کی خاطر مسجد میں دیکھے گئے۔ یعنی آہستہ آہستہ آپ کی زندگی کے تمام گوشے لوگوں کے سامنے آتے گئے۔ ان میں

آپ کے حسنِ اخلاق، حسن معاملہ، حسن سلوک، عدل، انصاف، عدم تشدد، مساوات، تواضع، حلم، دشمنوں کے ساتھ رواداری کے ساتھ پیش آنا اور دیگر ایسے اخلاق عالیہ تھے جو دین اسلام کی اشاعت کا اہم سبب بنے۔(۱۵)

۸۔ بین المذاہب کفالت میں اسلام کا نظریہ حسنِ خلق

جس طرح اسلامی بیت المال کسی مسلمان کے معذور ہو جانے یا بوجہ عمر رسیدگی اور غربت کے محتاج ہو جانے پر کفالت کی ذمہ داری لیتا ہے اسی طرح اسلامی بیت المال پر ایک غیر مسلم کے معذور ہونے یا عاجز ہونے کی صورت میں اس کی کفالت لازم ہے۔

کتاب الاموال میں ابوعبید نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے:

أن رسول الله ﷺ تصدق صدقة على أهل بيت من اليهود فهي تُجرى عليهم. (١٦)

"رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کے ایک گھرانہ کو صدقہ دیا اور (حضور ﷺ کے وصال کے بعد بھی) وہ انہیں دیا جارہا ہے۔"

حضرت زید بن ہاد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

إن صفية رضي الله عنها زوج النبي تصدّقتْ على ذوي قرابة لها، فهما يهوديان، فبيع ذلك بثلاثين ألفا. (١٧)

"بے شک ام المومنین نبی اکرم ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہانے اپنے رشتہ داروں کو صدقہ دیا حالانکہ وہ دونوں یہودی تھے جو تیس ہزار (درہم) کے عوض فروخت کیا گیا۔"

۹۔ پڑوسیوں کے حقوق اور اسلام کا نظریہ:

جب تک کسی معاشرے میں رواداری نہیں ہی گی معاشرہ میں امن، سکون، محبت کی فضا قائم نہیں ہو سکی۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ہمیشہ پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تلقین فرمائی۔ اس میں مسلمان، عابد، فاسق، کافر، دشمن، مسافر کی کوئی قید نہیں رکھی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

ما آمن بي من بات شبعانا وجاره جائع إلى جنبه وهو يعلم به. (١٨)

”وہ شخص مجھ پر ایمان نہ لایا جس نے پیٹ بھر کھانا کھا کر رات گزاری اور اُس کا ہمسایہ بھوکا رہا حالانکہ اُسے معلوم تھا۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

ليس المؤمن الذي يشبع وجاره جائع. (۱۹)

”وہ شخص مؤمن نہیں جو اپنا پیٹ بھرے اور اُس کا پڑوسی بھوکا رہے۔“

یہ وجہ ہے کہ اسلام نے بلا رنگ و نسل کے امتیاز کئے بغیر پڑوسیوں سے حسنِ سلوک اور ان کے ساتھ رواداری برتنے کا حکم دیا ہے۔

ا۔ قرآن میں رواداری کا تذکرہ

جب تک کسی معاشرے میں برداشت اور رواداری کا رویہ موجود نہ ہو وہاں انسانی حقوق کے احترام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ برداشت اور رواداری ہی دوسرے افراد معاشرہ کے حقوق کے احترام کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہر سطح پر برداشت اور رواداری کی تعلیم دی۔ قرآنِ مجید کی کئی آیات میں رواداری کا درس دیا گیا جن میں سے چند ایک درج کی جا رہی ہیں۔ انفرادی سطح پر رواداری کی اہمیت قرآن حکیم نے یوں بیان کی:

۱. ﴿الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (۲۰)

"یہ وہ لوگ ہیں جو فراخی اور تنگی (دونوں حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے (ان کی غلطیوں پر) درگزر کرنے والے ہیں، اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔"

جبکہ اجتماعی سطح پر رواداری کو بیان کرتے ہوئے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

۲. ﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (۲۱)

"دین میں کوئی زبردستی نہیں، بے شک ہدایت گمراہی سے واضح طور پر ممتاز ہو چکی ہے"۔

دنیا کے لوگوں کا ہمیشہ یہی نظریہ اور دستور رہا ہے کہ اپنے سے الگ دوسرے لوگوں اور دوسری قوموں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھتے رہے ہیں۔ ترقی کے آج کے اس دور میں بھی دشمنوں کو پامال کر دینا قابلِ ستائش عمل سمجھا جاتا ہے لیکن

اللہ رب العزت نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ دنیا میں چاہے جو کچھ بھی ہو رہا ہو لیکن تم ہر گز ایسا نہ کرنا کہ کسی کی دشمنی میں انصاف کے راستے سے ہٹ جاؤ۔ اسی کے متعلق اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

۳. ﴿لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (۲۲)

"اللہ تمہیں اس بات سے منع نہیں فرماتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین (کے بارے) میں جنگ نہیں کی اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے (یعنی وطن سے) نکالا ہے کہ تم ان سے بھلائی کا سلوک کرو اور اُن سے عدل و انصاف کا برتاؤ کرو، بے شک اللہ عدل و انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے"

یعنی مسلمان کسی کے ساتھ خواہ مخواہ دشمنی نہ رکھیں۔ جو شخص تمہارے ساتھ عداوت نہیں رکھتا انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ تم بھی اس کے ساتھ عداوت نہ رکھو بلکہ اس کے ساتھ نیک اور اعلیٰ اخلاق سے پیش آؤ تاکہ وہ تمہارے اخلاق سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے۔

جہاں اللہ رب العزت نے مسلمانوں کو اعتدال، میانہ روی اور ہمدری کی تلقین فرمائی وہاں پر غیر مسلم کے خداؤں کو جھوٹا ہونے کے باوجود انہیں بُرا بھلا کہنے سے منع فرمادیا۔

۴. ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَى رَبِّهِمْ مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (۲۳)

"اور (اے مسلمانو!) تم ان (جھوٹے معبودوں) کو گالی مت دو جنہیں یہ (مشرک لوگ) اللہ کے سوا پوجتے ہیں پھر وہ لوگ (بھی جواباً) جہالت کے باعث ظلم کرتے ہوئے اللہ کی شان میں دشنام طرازی کرنے لگیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر فرقہ (و جماعت) کے لیے ان کا عمل (ان کی آنکھوں میں) مرغوب کر رکھا ہے (اور وہ اسی کو حق سمجھتے رہتے ہیں)، پھر سب کو اپنے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے اور وہ انہیں ان اعمال کے نتائج سے آگاہ فرمادے گا جو وہ انجام دیتے تھے۔"

یعنی تم ان کے خداؤں کو برا نہ کہو۔ اسی آیت ہی کے احکامات کی روشنی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے ہمیشہ غیر مسلموں کے ساتھ نہایت سیر چشمی اور اعلیٰ ظرفی کا سلوک کیا چاہے وہ کسی جگہ فاتح کی حیثیت سے گئے یا حاکم کی حیثیت سے۔ انہوں نے

اپنی غیر مسلم رعایا کے مذہبی حقوق کی پاسداری کی اور ان کے ساتھ رواداری سے پیش آئے، ان کے عقائد و شعائر کا احترام کیا اور ان کی عبادت گاہوں سے مسمار ہونے سے بچایا۔(۲۴)

۲۔ حدیثِ نبوی میں غیر مسلموں کے لیے امن و محبت

اسلام محبت و شفقت، حسن سلوک، عفو در گذر اور رواداری کا درس دیتا ہے۔ اسلام نے ہمیشہ خیر و صلح، محبت و اخوت اور خدمت خلق کی ترغیب اپنے پیروکاروں کو دی ہے اور خاص طور پر حقوق العباد کی ادائیگی کو عبادت کا درجہ دیا ہے۔ حدیث نبوی میں کئی واقعات ملتے ہیں جن سے اخلاق حسنہ اور رواداری کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں اقلیتوں کے حقوق کو کتنی زیادہ اہمیت دی گئی ہے اس کا اندازہ حضور نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان مبارک سے ہوتا ہے:

أَلَا مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا أَوْ انْتَقَصَهُ أَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ طَاقَتِهِ أَوْ أَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ طِيبِ نَفْسٍ فَأَنَا حَجِيجُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ(۲۵)

"خبردار! جس کسی نے کسی معاہد (اقلیتی فرد) پر ظلم کیا یا اس کا حق غصب کیا یا اُس کو اس کی استطاعت سے زیادہ تکلیف دی یا اس کی رضا کے بغیر اس سے کوئی چیز لی تو بروز قیامت میں اس کی طرف سے (مسلمان کے خلاف) جھگڑوں گا۔"

غیر مسلموں کے جو بیرونی وفود حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں آتے ان کی حضور نبی اکرم ﷺ خود میزبانی فرماتے چنانچہ جب مدینہ منورہ میں آپ ﷺ کی خدمت میں حبشہ کے عیسائیوں کا ایک وفد آیا تو آپ ﷺ نے ان کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور ان کی مہمان نوازی خود اپنے ذمہ لی اور فرمایا:

إنهم كانوا لأصحابنا مكرمين، وإني أحب أن أكافئهم. (۲۶)

"یہ لوگ ہمارے ساتھیوں کے لیے ممتاز و منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے میں نے پسند کیا کہ میں بذات خود ان کی تعظیم و تکریم اور مہمان نوازی کروں۔"

ایک دفعہ نجران کے عیسائیوں کا چودہ رکنی وفد مدینہ منورہ آیا۔ آپ نے اس وفد کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور اس وفد میں شامل مسیحیوں کو اجازت دی کہ وہ اپنی نماز اپنے طریقہ پر مسجد نبوی میں ادا کریں چنانچہ یہ مسیحی حضرات مسجد نبوی کی ایک جانب مشرق کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے۔(۲۷)

آپ ﷺ کا اہلِ کتاب کے علاوہ مشرکین (بت پرست اقوام) سے بھی جو برتاؤ رہا اس کی بھی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ مشرکین مکہ و طائف نے آپ ﷺ پر بے شمار مظالم ڈھائے، لیکن جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو آپ ﷺ کے ایک انصاری کمانڈر سعد بن عبادۃ نے ابوسفیان سے کہا:

الیوم یوم الملحمۃ:

"آج لڑائی کا دن ہے"

یعنی آج کفار سے جی بھر کر انتقام لیا جائے گا تو آپ ﷺ ناراض ہو گئے اور ان سے جھنڈا لے کر ان کے بیٹے قیس کے سپرد کر دیا اور ابوسفیان سے فرمایا

الیوم یوم المرحمۃ:

"(آج لڑائی کا نہیں بلکہ) آج رحمت کے عام کرنے (اور معاف کر دینے) کا دن ہے۔"(۲۸)

(اس سے بڑی امن، محبت، شفقت اور رواداری کی اور مثال کیا ہو گی کہ حضور ﷺ نے اپنے مخالفین کو صرف معاف ہی نہیں کیا بلکہ انہیں اپنی رحمت خاص سے نوازا اور انہیں فرمایا:

"آج کے دن تم پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے، آج کے بعد تم سب آزاد ہو۔"(۲۹)

۳۔ خلفائے راشدین کے اَدوار اور اسلام کا نظریہ امن و محبت

اسلام شرفِ اِنسانیت کا علمبردار دین ہے۔ ہر فرد سے حسن سلوک کی تعلیم دینے والے دین میں کوئی ایسا اصول یا ضابطہ روا نہیں رکھا گیا جو شرف انسانیت کے منافی ہو۔ دیگر طبقات معاشرہ کی طرح اسلامی ریاست میں اقلیتوں کو بھی ان تمام حقوق کا مستحق قرار دیا گیا ہے اور ان کے ساتھ رواداری رکھنے پر زور دیا گیا۔ خلفائے راشدین کا دور حضور نبی اکرم ﷺ کے دور کا تسلسل ہے۔ جو تعلیمات آقا علیہ السلام نے انسانی معاشرہ کے لیے دیں انہیں تعلیمات کے مطابق خلفائے راشدین نے خلافتِ راشدہ کے وقت فیصلے کئے اور اسلامی قوانین کا نفاذ کیا۔

سیدنا صدیق اکبر ﷛ اور غیر مسلموں کے ساتھ رفق ونرمی

سیدنا صدیق اکبر ﷛ کے دور میں جو معاہدات اور وثائق غیر مسلموں کے ساتھ ہوئے ان کی تعداد کثیر ہے۔ مگر یہاں غیر مسلموں کے ساتھ رواداری کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے چند درج کئے جارہے ہیں آپ نے 'عانات' کے لوگوں کے متعلق فرمایا:

۱۔ ان کے گرجے اور خانقاہیں منہدم نہیں کی جائیں گی۔

۲۔ وہ ہماری نماز پنجگانہ کے سوا ہر وقت اپنا ناقوس بجاسکتے ہیں ان پر کوئی پابندی نہیں۔

۳۔ وہ اپنی عید پر صلیب نکال سکتے ہیں۔

۴۔ مسلمان مسافر کی تین دن ضیافت کریں اور وقت پڑنے پر مسلمانوں کی جان ومال کی نگہداشت کریں۔(۳۰)

سیدنا فاروقِ اعظم ﷛ اور اسلام کا نظریہ محبت

عہد فاروقی میں رواداری کی کئی امثال تاریخ کے صفحات پر رقم ہیں۔ امام طبری کہتے ہیں کہ:

"حضرت عمر کے زمانہ میں جب بنو تغلب مغلوب ہوئے۔ وہ اپنے قدیم مذہب کو ترک کرنے پر رضامند نہ تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ ان پر کسی قسم کا دباو نہ ڈالا جائے اور وہ اپنے مذہب کی پیروی میں آزاد ہیں۔ البتہ اگر ان میں سے کسی شخص نے اسلام قبول کرنا چاہا تو کوئی شخص مزاحمت کا مجاز نہ ہو گا۔"(۳۱)

سیدنا عثمان غنی ﷛ کے دور میں رواداری

حضرت عثمان ﷛ کا زمانۂ خلافت بھی اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے شاندار ریکارڈ کا حامل ہے۔ آپ کے زمانہ خلافت میں کوفہ کے گورنر ولید بن عقبہ کے دربار میں ایک یہودی شعبدہ بازی کے کرتب دکھارہا تھا، حضرت جندب بن کعب ازدی بھی تماشائیوں میں تھے، آپ کا شمار کبار تابعین میں ہوتا تھا، آپ نے ان شعبدوں کو شیطانی اثر سمجھا اور یہودی کو قتل کر دیا۔ ولید نے اسی وقت آپ کو گرفتار کر لیا اور قصاص میں قتل کرنے کے لیے جیل بھیج دیا۔ آپ نے داروغہ جیل ابوسنان سے پوچھا کہ کیا تو بھاگنے میں میری مدد کرے گا۔ اس نے کہا: ہاں اور پھر حضرت جندب کو جیل سے بھاگنے میں مدد دیتے ہوئے کہا: یہاں سے بھاگ جا اللہ تعالیٰ تیرے بارے مجھ سے کچھ نہ پوچھے گا۔

جب ولید نے آپ کو قتل کرنے کے لیے طلب کیا تو معلوم ہوا کہ آپ تو بھاگ گئے ہیں۔ ولید نے داروغہ کو نگرانی میں کوتاہی کرنے کے جرم میں قتل کر دیا۔(۳۲)

سیدنا علی ؓ کے نزدیک غیر مسلموں کے حقوق

حضرت علی المرتضی ص کا دور بہت پر آشوب تھا۔ مگر اس کے باوجود آپ کے دور خلافت میں اقلیتوں کے حقوق کو کوئی گزند نہیں پہنچنے دی گئی۔ ایک دفعہ آپ کے پاس ایک مقدمہ آیا جس میں قاتل مسلمان تھا اور مقتول غیر مسلم تھا۔ آپ نے قاتل کو مقتول کے وارثوں کے سپرد کر دینے کا حکم دیا اور حضرت عمر ؓ کے فتویٰ پر فیصلہ کیا۔ مگر مقتول کے وارثوں نے دیت لے کر قاتل کو چھوڑ دینا چاہا۔ جب حضرت علی ؓ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے مقتول کے ورثاء کو بلا کر پوچھا کہ تمہارے اُوپر کوئی دباؤ تو نہیں ڈالا گیا، تو اُنہوں نے عرض کیا کہ نہیں ہم پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا۔ تب آپ نے وہ دیت دلا دی جو مسلمانوں کی دیت کے برابر تھی اور فرمایا:

من كان له ذمتنا فدمه كدمنا، وديّته كديّتنا. (۳۳)

"یعنی جو غیر مسلم ہماری ذمہ داری میں ہے اس کا خون ہمارے خون جیسا ہے اور اس کی دیت بھی ہماری یعنی مسلمانوں کی دیت کے برابر ہے۔"

جدید محققین کا نظریہ رواداری:

مولانا مودودی کا نظریہ رواداری:

"لوگوں کے جذبات کا لحاظ کر کے ان پر ایسی نکتہ چینی نہ کریں جو ان کو رنج پہنچانے والی ہو۔ انہیں ان کے اعتقادات سے پھیرنے یا عمل سے روکنے کا زبردستی کا طریقہ اختیار نہ کریں بلکہ روزمرہ کے معاملات میں وسیع القلبی کا ثبوت دیں۔"(۳۴)

سید سلیمان ندوی کا نظریہ رواداری:

سید سلیمان ندوی جہاں حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کو بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں وہیں اسلامی تعلیمات میں رواداری کا تصور کے متعلق لکھتے ہیں:

”اس تفصیل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی اس تعلیم نے دنیا میں امن وامان اور مسلمانوں میں مذہبی رواداری کے پیدا کرنے میں کتنا عظیم الشان حصہ لیا ہے، یہی وہ نظریہ تھا جس نے مسلمانوں کو اپنے مذہبی عقائد و شریعت کی سخت پیروی کے باوجود بھی دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ مشارکت اور میل جول کے

لیے آمادہ کیا۔ مجوسیوں، صابیوں، یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مختلف ملکوں میں ان ملکوں کے مناسب مختلف تمدنوں کی بنیاد رکھنے کی ان میں قوت پیدا کی۔"(۳۵)

سید صباح الدین کا نظریہ رواداری:

رواداری دینِ اسلام کا عظیم خاصہ ہے اور قابل تعریف ہے۔ مذہبی رواداری کے متعلق سید صباح الدین لکھے ہیں:

"کیا مذہبی رواداری کی اس سے بہتر مثال کسی اور مذہب کی تاریخ میں مل سکتی ہے کہ وحشی نے حضور نبی اکرم ﷺ کے چچا حضرت حمزہ کو شہید کیا اور فتح مکہ کے بعد بھاگ کر طائف چلے گئے، پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا اور حضور ﷺ نے ان کو مسلمان کر لیا۔"(۳۶)

سید محمد صدیق شاہ کا نظریہ رواداری:

رواداری انسانی اخلاقی پہلو کا بنیادی جزو ہے اس کے بغیر معاشرہ امن وسکون سے خالی ہو جاتا ہے۔ اسی نظریہ کی عکاسی سید محمد صدیق شاہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رواداری اعلیٰ انسانی اقدار کا جزو اعظم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی کتاب ہو یا اُن کے پیغمبر، اُن کے پیغمبر کے ساتھ یا بعد کے اکابرین ہوں، سپاہی ہوں یا سپہ سالار ہوں، عام مسلمان ہوں یا حکمران ہوں سب اپنے شخصی اور قومی روے میں رواداری کے علم بردار نظر آتے ہیں۔"(۳۷)

انگریز آتھر آرنلڈ ٹی۔ ڈبلو اسلامی رواداری کے متعلق حضور نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کے متعلق لکھتے ہوئے کہتا ہے:

"آپ ﷺ کی انہی تعلیمات کے زیر اثر اسلامی معاشرہ رواداری اور برداشت کا ایسا مرقع بن گیا جہاں اقلیتیں بھی اپنے آپ کو غیر مسلم ممالک کی نسبت زیادہ محفوظ تصور کرتی تھیں۔"(۳۸)

دہشتگردی عدم رفق و محبت کا سبب ہے

رواداری ایک ایسا خاصہ ہے جو انسان کو انسان بنانے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ حقیقی انسان وہی ہے جو انسانیت کو مساوات اور برابری کا حق دیتا ہو۔ لہذا ایک ایسا شخص جو عدمِ رواداری کا قائل ہو وہی ہمیشہ انتہا پسندی کا شکار ہوتا ہے۔ انتہا پسندی ہی دہشتگردی کو جنم دیتی ہے۔ اسی لئے اسلام رواداری کا سب سے بڑا عَلَم بردار رہا ہے اور اسلام

کے تمام مشاہیر رواداری کا درس دیتے آئے ہیں۔ دور جدید کے محقق سید محمد صدیق شاہ عدمِ رواداری کے متعلق لکھتے ہیں:

”اسلام رواداری اور محبت واخوت کا دین ہے۔ بنیاد پرستی، تشدد، دہشتگردی، انسانی حقوق کی پامالی حقیقت میں عدم رواداری کا سبب ہے۔“(۳۹)

نتائج البحث

(۱)۔ اسلام امن، محبت، برداشت اور رواداری کا دین متین ہے۔ اسلام جہاں دیگر انسانی حقوق کی بات کرتا ہے وہیں مذہبی رواداری پر بھی زور دیتا ہے۔

(۲)۔ اسلامی تعلیمات روزِ روشن کی مانند مذہبی اقلیتوں کو جہاں حقوق مہیا کرتی ہیں وہاں ان کے ساتھ رواداری کے ساتھ پیش آنے کی بھی تلقین کرتی ہیں۔

(۳)۔ قرآن وحدیث میں جابجا رواداری کو اپنانے اور اس پر عمل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

(۴)۔ اسلام کے تمام اَدوار میں رواداری کی زندہ وجاوید مثالیں قائم کی گئی ہیں۔

(۵)۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا دور جسے آپ نے ”خیر القرون“ سے تعبیر فرمایا، سے لے کر خلفائے راشدین ، تابعین اور تبع التابعین کے اَدوار میں رواداری کی قابلِ تقلید مثالیں موجود ہیں۔

(۶)۔ اسلام اَدوار کے تمام علماء وفقہاء بالخصوص مشائخ عظام اور اولیائے کرام رواداری کی تبلیغ واشاعت نہ صرف زور دیتے رہے بلکہ خود اس پر عمل کر کے بھی دکھایا۔

مصادر و مراجع

(۱) آل عمران، ۳:۱۱۰

(۲) دہلوی، مولوی سید احمد، فرہنگ آصفیہ، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۶ء، ۲: ۳۷۷

(۳) متین طارق، اسلام اور رواداری، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان۔ المطبوع:۱۹۸۶ء۔ ص ۱۱

(۴) نقوی، ڈاکٹر سید باحیدر شہریار، فرہنگ، اردو، فارسی، لاہور، بک ٹاک، پاکستان، ۱۹۹۳ء، ص:۳۲۳

(۵)The Collins paperback Thesaurus, P: 638, Harper Collins Publishers, 1991

Oxford Advanced Learner's Dictionary, Seventh edition, P: 1615, Oxford University

(۶) Press, 2005

(۷) مختصر اردو لغات، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، انڈیا۔ المطبوع:۱۹۸۷ء۔ ص ۵۳۳

(۸) غرباوی، ماجد، التسامح و منابع الاتسامح فرص بین الادیان والثقافات، مدین، قم ایران، ۱۴۲۷ء، ص:۵

(۹) صلیبا، الدکتور جمیل، المعجم الفلسفی، دار الکتاب البناتی، بیروت، لبنان، ۱۹۹۴ء۔ ۱: ۲۷۲

(۱۰) متین طارق، اسلام اور رواداری، ص ۱۱، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان۔ المطبوع:۱۹۸۶ء۔

(۱۱) بخاری، محمد بن اسماعیل بخاری، الصحیح، ۲۳:۱، رقم:۳۹

(۱۲) مسلم، الصحیح، ۲۰۵۵:۴، رقم:۲۶۷۰

(۱۳) متین طارق، اسلام اور رواداری، ص ۱۲، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان۔ المطبوع:۱۹۸۶ء۔

(۱۴)[النحل:۱۲۵]

(۱۵) سید صباح الدین، اسلام میں مذہبی رواداری، دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، انڈیا۔ المطبوع:۲۰۰۹ء، ص ۵۸

(۱۶) ابو عبید، کتاب الاموال، ص ۱۹۹۲

(۱۷) ابو عبید، کتاب الاموال، ص ۱۹۹۳

(۱۸) طبرانی، المعجم الکبیر، ۱/۲۵۹، رقم:۷۵۱

(۱۹) بخاری، الادب المفرد، ص ۵۲، رقم:۱۱۲

(۲۰) آل عمران، ۳: ۱۳۴

(۲۱)۔ البقرۃ، ۲: ۲۵۶

(۲۲)۔الممتحنۃ،۶۰: ۸

(۲۳)۔الأنعام،۶: ۱۰۸

(۲۴)۔ متین طارق، اسلام اور رواداری، ص۵۶، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان۔ المطبوع:۱۹۸۶ء۔

(۲۵)۔ابو داود، السنن، ۳/ ۱۷۰، رقم:۳۰۵۲

(۲۶)۔ بیہقی، شعب الایمان، ۶/ ۵۱۸، رقم:۹۱۲۵

(۲۷)۔ابن سعد، الطبقات الکبری، ۱/ ۳۵۷

(۲۸)۔ابن عبد البر، الاستیعاب، ۲/ ۵۹۷

(۲۹)۔سیوطی، الجامع الصغیر، ۱/ ۲۲۰، رقم:۳۶۸

(۳۰)۔ابو یوسف، کتاب الخراج، ص۱۵۵

محمد حمید اللہ، الوثائق السیاسیۃ، ص۳۱

(۳۱)طبری، التاریخ، ج۵، ص ۲۴۸۲۔

(۳۲)بیہقی، السنن الکبری، ۸/ ۱۳۶

مزی، تہذیب الکمال، ۵/ ۱۴۶

(۳۳)۔زیلعی، نصب الرایۃ، ۴/ ۳۳۷

(۳۴)۔ متین طارق، اسلام اور رواداری، ص۱۴، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان۔ المطبوع:۱۹۸۶ء۔

(۳۵)سلیمان ندوی، سیرۃ النبی، ۴/ ۶۰۱

(۳۶)سید صباح الدین، اسلام میں مذہبی رواداری، دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، انڈیا۔ المطبوع:۲۰۰۹ء، ص ۵۴

(۳۷)سید محمد صدیق شاہ، رواداری اور مغرب، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، پاکستان، المطبوع:۱۹۹۹ء، ص۵۵، ۴۰

(۳۸)Arnold. T.W, The Preaching of Islam, London, 1913. Page: 50.

(۳۹) محمد صدیق شاہ، رواداری اور مغرب، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، پاکستان، المطبوع: ۱۹۹۹ء۔ ص ۲۷

عصرِ حاضر کا اَخلاقی انحطاط اور تدارک کا لائحہ عمل

(اسلامی تعلیمات کی روشنی میں)

Contemporary Moral Decline and Remedial Strategy

(In the light of Islamic teachings)

☆ شفاقت علی شیخ

☆☆ ڈاکٹر فیض اللہ بغدادی

ABSTRACT

In modern times, moral decay has engulfed society in a comprehensive manner, which has resulted in many defects in individual and collective life. Humanity is sobbing and despite all the inventions and advances, life is in full swing. To address this, a four-point strategy is being presented in the light of the teachings of the Qur'an and Hadith, which can be adopted to improve the situation and revive the dying moral values. These four points are below .1. Faith: Faith is such a great power that no material power in the world can match it. Through a living and conscious faith, man can easily overcome his moral weaknesses and flaws and make himself civilized. 2 .Knowledge: Knowledge is that which can subdue the universe. The whole world agrees that knowledge plays a significant role in improving human morals and habits. 3.Zikr: The third thing that lifts man from the level of animality to the highest level of humanity is zikr. Zikr means the remembrance of God in the heart and mind of man. This is the spirit of all acts of worship in Islam. 4. Good Companionship: The effects of companionship on the human personality are obvious. As a person sits in the company, same effects begin to form on him. Therefore, avoiding bad company and adhering to good company also plays an important role in taking a person out of moral depravity and leading him towards heights.

عصرِ حاضر میں اخلاقی انحطاط جو معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں زہر گھول رہا ہے۔ زندگی کو بوجھل اور دشوار تر بناتا چلا جارہا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا حل کیا ہے؟ وہ کون سی

☆ پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، لاہور یونیورسٹی، لاہور

☆☆ اسسٹنٹ پروفیسر منہاج یونیورسٹی، لاہور

تدابیر ہیں جنہیں اختیار کر کے اخلاقی انحطاط کے اس جن کو بوتل میں بند کیا جاسکتا ہے اور بے سکونی بے چینی اور اضطراب کی آگ میں جلتی ہوئی زیست کو امن و امان اور سکون و اطمینان سے ہم کنار کیا جاسکتا ہے؟اس حوالے سے ابن مسکویہ اور امام غزالیؒ کے نظریہ اخلاق سے کیا مدد مل سکتی ہے اس کا جائزہ اس آرٹیکل میں لیاجائے گا۔ یہاں اس مسلے کا ایک عمومی حل پیش کیا جارہاہے۔چار نکات پر مشتمل یہ نسخہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کی روشنی میں ترتیب دیا گیاہے جسے اخلاقی انحطاط کے تدارک میں یقین اور وثوق سے استعمال کیا جاسکتاہے۔اس نسخہ کوایک فرد انفرادی طور پر اپنائے یا اجتماعی سطح پر عمل میں لایاجائے، دونوں صورتوں میں نتائج یقینی ہیں۔ یہ لائحہ عمل درج ذیل ہے۔

ا۔ایمان

افراد اور معاشروں کی اصلاح بغیر کسی اُصول وضابطہ کے محض اتفاقات کے تھپیڑوں سے نہیں ہو جایا کرتی بلکہ اس کے لیے واضح لائحہ عمل درکار ہوا کرتاہے۔جو لوگ گرنے کے بعد سمبھلنے اور زوال کے بعد عروج کے آرزومند ہوتے ہیں وہ اپنے سامنے تربیت کا ایک ٹھوس پروگرام اور عزمِ مصمم رکھتے ہیں۔ جس پر عمل پیرا ہوئے بغیر رفعت و سربلندی کا کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکتا یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جسے قرانِ مجید میں بڑے دوٹوک انداز میں یوں بیان کیا گیاہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ﴾ [1]

"بے شک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتاجب تک وہ خود اپنی حالت کونہ بدلے "

لیکن اپنی حالت کو بدلنے والا کام بہت مشکل ہے۔ دریاؤں کے رُخ بدلنے آسان ہیں، زمین کا سینہ شک کرنا، پہاڑوں کے جگر چھید ڈالنا اور طوفانوں کا رُخ موڑ دینا آسان ہے لیکن قلوب و نفوس میں تبدیلی اور طبائع کی اصلاح کہیں زیادہ دشوار ہے۔ تاہم یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔اس مشکل کو آسان بنانے والی قوت ایک ہی ہے اور اُس کا نام ہے ''ایمان''۔

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ انسان کی تربیت و اصلاح کا ایک وقت معین ہوتا ہے یعنی عہدِ طفولیت۔ اگر یہ وقت گزر جائے تو پھر تکوینِ عادات اور تہذیب اخلاق کی کوششیں بے سود ہوتی ہیں۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسان جس ماحول میں پیدا ہوتا، بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے وہ بھی اُس کے بناؤ بگاڑ کا بہت حد تک ذمہ دار ہوتا ہے اور آدمی بالعموم اُسی سانچے میں ڈھل جاتاہے۔ لیکن یہاں جس قوتِ ایمانی کا ذکر کیا جارہاہے اُس کی معجز نمائی اور کارفرمائی ہر

---

[1] الرعد۱۳:۱۱

حال میں مسلّمہ ہے۔ خواہ آدمی عمر کے کسی بھی حصہ میں ہو اور اُس کا ماحول اور ارد گرد کے حالات اُس کی تبدیلی کی راہ میں کتنی ہی بڑی دیوار بن کر کھڑے ہوں ایمان کی ایک لہر ہی اُس کے دل و دماغ کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ اس نکتے کی وضاحت کے لیے تاریخ کے اوراق سے کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن یہاں صرف دربارِ فرعون سے وابستہ جادوگروں کی قلبِ ماہیت کے ایک واقعہ پر اکتفا کیا جارہاہے:

﴿فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِيْنَ﴾[۲]

"پھر جب جادوگر آئے تو فرعون سے کہا اگر ہم غالب آگئے تو کیا ہمیں کوئی بڑاانعام ملے گا"

یہ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے کا منظر ہے جب جادوگر فرعون سے ملنے والے انعام واکرام کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن جب ایمان اُن کے دل و دماغ میں گھر کر لیتا ہے تو اُسی فرعون کے سامنے سینہ تان کر کہتے ہیں:

﴿قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِىْ فَطَرَنَا﴾[۳]

"کہا ہم تجھے ہر گز ترجیح نہ دیں گے ان کھلی ہوئی نشانیوں کے مقابلہ میں جو ہمارے پاس آچکی ہیں اور نہ اس کے مقابلہ میں جس نے ہمیں پیدا کیا ہے "

اور پہلی نیاز مندی کے مقابلے میں بعد کی جراتِ ایمانی کا یہ حال کہ فرعون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتے ہیں:

﴿فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِىْ هٰذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا﴾[۴]

"سوتو کر گزر جو تجھے کرنا ہے، تو صرف اس دنیا کی زندگی پر حکم چلا سکتا ہے۔"

چند لمحوں میں سیرت اور کردار میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے آئی؟ صرف ایمان کی بدولت!

---

[۲] الشعراء۲۶:۴۱

[۳] طٰہٰ۲۰:۷۲

[۴] طٰہٰ۲۰:۷۲

ایمان بحثیتِ اساس اخلاق

نفسِ انسانی کی گہرائیوں میں ایک مخفی قوت موجود ہوتی ہے جسے نہ خوردبین سے دیکھا جاسکتا ہے اور نہ ہی علم الطبعیات اُس کا ادراک کر سکتا ہے۔ اس کا کام فرائض وواجبات کی طرف انسان کی رہنمائی کرنا ہے اور خیر وصلاح کی طرف اُسے مائل رکھنا ہے جیسے مقناطیس(Magnet) قطب نما (Compass) کی سوئی کو کھینچے رکھتا ہے نیز یہ قوت اُسے شر وفساد سے بچاتی ہے جیسے باپ بیٹے کو یا اُستاد اپنے شاگرد کو غلط حرکات سے بچاتا ہے۔ یہ باطنی قوت جو تاریکی میں روشنی کا کام دیتی ہے فضائل پر آمادہ کرتی اور رذائل سے باز رکھتی ہے، معروف کا حکم دیتی اور منکر سے منع کرتی ہے علم الاخلاق کے ماہرین اسے ضمیر اور وجدان سے تعبیر کرتے ہیں اور اسلام نے اسی کا نام "القلب" (دل) رکھا ہے۔ حضور ﷺ سے جب ایک شخص نے نیکی اور گناہ کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:

> استفت قلبك واستفت نفسك البر ما اطمأنت إليه النفس واطمأن إليه القلب والإثم ما حاك في النفس وتردد في الصدر وإن أفتاك الناس وأفتوك ثلاثا.[٥]

> "اپنے دل اور اپنے نفس سے پوچھ۔ نیکی وہ ہے جس پر تیرا دل اور نفس مطمئن ہوں اور گناہ وہ ہے جو تیرے نفس میں کھٹکے اور دل میں شبہ پیدا کرے اگرچہ تو لوگوں سے فتویٰ لے چکا ہو اور وہ تین مرتبہ تجھے فتویٰ دے چکے ہوں۔"

چنانچہ قلب یا ضمیر اخلاق کا بنیادی ستون ہے۔ اس کے بغیر اخلاق کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہو سکتی ہے اور نہ قائم رہ سکتی ہے۔ زندہ ضمیر اخلاق کی تعمیر و تشکیل کا باعث بھی ہوتا ہے اور ایک مستعد دربان کی طرح اُس کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ کوئی معاشرہ محض قوانین اور آئینی ضوابط کے بل بوتے پر یا پولیس اور فوج کی قوت وطاقت کے ذریعے تنظیم وترقی اور سعادت وخوش بختی کی منزل سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قانون ایک طاقت ہے اور اجتماعی زندگی کا نظام چلانے کے لیے ناگزیر ہے۔ لیکن انسانی زندگی پر پوری طرح یہ اس لیے حاوی نہیں کہ اس کا تعلق صرف ظاہر سے ہوتا ہے باطن سے نہیں۔ نیز یہ اُمورِ عامہ سے بحث کرتا ہے اور خاص حالات کا اس میں لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

پھر قانون میں یہ سقم بھی ہے کہ وہ مجرم کو سزا دیتا ہے مگر محسن اور نیکوکار کے صلہ کا کوئی اہتمام نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں قانون کی گرفت سے لوگ حیلے بہانے کے ذریعے بچ جاتے ہیں اور قانون میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ

---

[٥] ابو یعلیٰ، أحمد بن علي بن المثنى الموصلي التميمي، المسند، ۱۶۱/۳

مجرمانہ ذہنیت کا کماحقہ تعاقب کر سکے۔یہی حال فلسفہء اخلاق کا ہے۔کوئی اخلاقی فلسفہ خواہ اُسے کتنے ہی عمدہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہو کسی معاشرے کے چند افراد کو تو اپنی طرف مائل کر سکتا ہے لیکن پورے معاشرے کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کر سکتا وجہ یہ ہے کہ ہر فلفی کا اپنا فلسفہ اخلاق ہوتا ہے اور ظاہر ہے اُس میں انسانی سطح پر جو فکری لغزشیں پائی جاتی سکتی ہیں اُن کا پورا امکان موجود ہوتا ہے چنانچہ بعض اوقات دو مختلف فلسفہ ہائے اخلاق میں اتنا زیادہ تضاد ہوتا ہے کہ کسی آدمی کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ صحیح کون سا ہے اور غلط کون سا؟ کس کی پیروی کرنی ہے اور کس کی نہیں؟ جسے ماننا ہے کیا عقل و دل اُس پر مطمئن بھی ہو جاتے ہیں یا وہ محض ایک سراب ہے جسے پانی سمجھ کر پیاسا اُس کی طرف لپکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انسانیت کی پوری تاریخ میں کوئی ایک فلسفی بھی ایسا دکھائی نہیں دیتا جسے وسیع پیمانے پر قبولیتِ عامہ حاصل ہوئی ہو اور جس کے فلسفہ اخلاق کی بنیاد پر کوئی مہذب معاشرہ معرضِ وجود میں آگیا ہو (یہاں فلاسفہ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے مذہب سے ہٹ کر محض عقلی بنیادوں پر فلسفہ اخلاق مرتب کیا) چنانچہ معاشرے کی تہذیب و اصلاح اور تعمیر و ترقی کے لیے بیدار ضمیر اور زندہ قلوب کا وجود بہت ضروری ہے۔اب سوال یہ ہے کہ جب اخلاق کی نشو و نما اور ارتقاء میں ضمیر کا اس حد تک عمل دخل ہے تو خود ضمیر کی تخلیق کا راز کس چیز میں مضمر ہے؟

ضمیر اور ایمان

ضمیر کی تعمیر و تخلیق میں ایمان بنیادی کردار ادا کرتا ہے اسے زندگی عطا کرنے، اس کی آواز کو زیادہ موثر بنانے اور ہر قدم پر اس کی محرک اور فعال حیثیت برقرار رکھنے کے لیے ایمان ناگزیر ہے۔اللہ پر ایمان انسان کے اندر یہ اعتقاد راسخ کر دیتا ہے کہ وہ جہاں بھی ہو اللہ اُس کے ساتھ ہوتا ہے۔سفر و حضر اور خلوت و جلوت میں اللہ سے اُس کی کوئی کیفیت چھپی نہیں رہ سکتی۔وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔انسان کے نہاں خانہء دل و دماغ کے اسرار و رموز، اُس کے پوشیدہ اعمال اور ظاہری حرکات و سکنات ہر ایک سے اللہ پوری طرح باخبر ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِى السَّمَاوَاتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلَاثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ (۶)

"کیا آپ نے نہیں دیکھا اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے،(یہاں تک) کہ جو کوئی مشورہ تین آدمیوں میں ہوتا ہے تو وہ چوتھا ہوتا ہے اور جو پانچ میں ہوتا ہے تو وہ چھٹا ہوتا ہے اور خواہ اس سے کم کی سرگوشی ہو یا زیادہ

---

(۶) المجادلہ ۵۸:۷

کی مگر وہ ہر جگہ ان کے ساتھ ہوتا ہے، پھر انہیں قیامت کے دن بتائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے، بے شک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے"

﴿ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ ﴾ (۷)

"اور تم جس حال میں ہوتے ہو یا قرآن میں سے کچھ پڑھتے ہو یا تم لوگ کوئی کام کرتے ہو تو ہم وہاں موجود ہوتے ہیں جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو، اور تمہارے رب سے ذرہ بھر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے نہ زمین میں اور نہ آسمان میں، اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی اور نہ بڑی مگر کتاب روشن میں ہے"

ایمان باللہ کے بعد انسانی ضمیر کو جو چیز مزید سنوار اور نکھار دیتی ہے وہ یومِ آخرت پر ایمان ہے۔ یومِ آخرت پر ایمان دراصل اس حقیقت کا شعور ہے کہ مرنے کے بعد انسان کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے تمام اعمال کا حساب دینا ہے، ہر اچھے عمل کی جزا ملے گی اور ہر بُرائی کا خمیازہ بُھگتنا ہو گا۔ اُس وقت اُس کی زندگی کے ہر لمحہ کی تفصیل اُس کے سامنے رکھ دی جائے گئ:

﴿اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ﴾ (۸)

"جب کہ ضبط کرنے والے دائیں اور بائیں بیٹھے ہوئے ضبط کرتے جاتے ہیں"

﴿ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ﴾ (۹)

"کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کا بھید اور مشورہ نہیں سنتے، کیوں نہیں اور ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کے پاس لکھ رہے ہیں"

---

(۷) یونس ۱۰:۶۱

(۸) قٓ ۵۰:۱۷

(۹) الزخرف ۴۳:۸۰

حیاتِ انسانی کا یہ سارا ریکارڈ جسے اللہ کے فرشتوں نے پوری جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ مرتب کیا ہو گا اور جس کے مطابق اُس سے مواخذہ و محاسبہ کیا جائے گا۔ایک ایسی ناقابلِ تردید دستاویز ہو گی جسے جھٹلایا نہیں جا سکے گا یہ احساس قلب کی زندگی کا ضامن اور ضمیر کی بیداری کا باعث ہوتا ہے۔

اللہ کے بارے میں یہ اعتقاد اور یومِ آخرت پر اس نوعیت کا ایمان ہی انسان کو ہر آن اللہ کی نگرانی کا احساس دلاتا ہے اور اپنے نفس کے محاسبہ پر مجبور کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کھلی آنکھوں سے اپنے اعمال و افعال کا جائزہ لیتا ہے، نتائج و عواقب پر نظر رکھتا ہے۔ ظلم و ستم اور خیانت و بد عہدی جیسے اعمال سے پرہیز کرتا ہے۔ اپنے فرائض کو خوش اُسلوبی سے بجالاتا ہے اور دوسروں کے حقوق خوش دلی سے ادا کرتا ہے کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس کے محاسبے کا خوف ہو اور نہ ہی چھپ کر کوئی ایسی حرکت کرتا ہے کہ جس کے نتیجے میں اُسے ندامت لاحق ہو سکتی ہو۔ خدا کے حاضر و ناضر ہونے کا کامل یقین اُسے راہِ راست سے ہٹنے اور اخلاقی انحطاط کا شکار ہونے سے بچاتا ہے اور اگر کبھی وقتی جذبات سے مغلوب ہو کر یا بے دھیانی و لاعلمی میں کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو احساس ہونے پر توبہ و استغفار اور دیگر ذرائع سے اُس کا مداوا کرتے ہوئے دوبارہ راست روی پر گامزن ہو جاتا ہے۔

نورِ ایمان سے منور ضمیر کا اعجاز

انسان کے اندر جو بشری کمزوریاں ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ خود اپنے وضع کردہ قوانین کی پابندی سے انحراف کرتا ہے جہاں کسی قانون کے نفاذ میں اُس کے ذاتی مفادات پر زد پڑ رہی ہو تو اُس سے گریز کی خاطر مختلف تدابیر سوچتا ہے۔ مثلاً یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ حکومتیں کاروبار سلطنت چلانے کے لیے ٹیکس عائد کرتی ہیں۔ امنِ عامہ بحال رکھنے اور معاشرتی جرائم کے سدِّ باب کے لیے قانونی تعزیرات نافذ کرتی ہیں۔ آپس کے معاملات کو درست رکھنے کے لیے خرید و فروخت اور لین دین کے اُصول و ضوابط مقرر کرتی ہیں سیاست و حکمرانی کے ضمن میں ایسی سرگرمیوں کی سختی سے ممانعت کر دی جاتی ہے جن سے ملک و قوم کا مفاد متاثر ہوتا ہو لیکن یہ سب کچھ کرنے کے بعد عملاً یہ ہوتا ہے کہ قواعد و ضوابط کی کھلم کھلا مخالفت کی جاتی ہے۔ ٹیکس چوری او دیگر جرائم کا ارتکاب سرِ عام ہوتا ہے۔ قانون کا احترام نہ حکام کرتے ہیں اور نہ ہی عوام اُس کے تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ لوگ قوانین کی افادیت و اہمیت کو سمجھنے کے باوجود اُن سے انحراف کیوں کرتے ہیں؟ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ اُن کا ضمیر بیدار نہیں ہوتا اور اُسے ایمان کی حرارت نصیب نہیں ہوتی۔ چنانچہ مادی مفادات، سفلی خواہشات اور بست جذبات سے مغلوب ہو کر انسان صحیح راستے کو چھوڑ کر غلط روش کو اپنا لیتا ہے۔ لیکن جو ضمیر ایمان کی بدولت بیدار ہو چکا ہو اُس پر عقل عیار کا کوئی حیلہ کارگر نہیں ہو سکتا اور نہ ہی وہ حرص و لالچ اور طمع و شہوت کے جذبات سے اس حد تک مغلوب ہو سکتا ہے کہ

جانتے بوجھتے ہوئے صحیح راستے کو چھوڑ کر غلط کو اپنا شعار بنالے۔ اس حوالے سے اسلامی تاریخ بلند کرداری، امانت و دیانت اور اعلیٰ اخلاق کے ایسے نادر و نایاب واقعات کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے جنہیں دیکھ کر عقلِ انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔ یہ سب کچھ ایمان کا کمال ہے۔

ضمیر بلا ایمان کی حقیقت

جو لوگ ایمان کی نفی کر کے فلسفہ اخلاق کی عمارت کو کھڑا کرنا چاہتے ہیں اُن کا موقف یہ ہے کہ تربیت اخلاق کے لیے ضمیر اپنی مجرد حیثیت میں بالکل کافی ہے اور اس مقصد کے لیے دین و ایمان کی کوئی ضرورت نہیں ہے بالفاظِ دیگر اُن کے خیال میں اخلاقی تصورات انسانی ضمیر میں فطری طور پر موجود ہوتے ہیں اور انسان ایمان کی غیر موجودگی میں بھی اخلاقِ حسنہ پر کاربند رہ سکتا ہے۔

اس دعویٰ میں جزوی صداقت موجود ہے۔ قرآنِ مجید کے بقول انسانی فطرت میں نیکی و بدی اور خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت فطری اور جبلی طور پر رکھ دی گئی ہے:

﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾ (۱۰)

"پھر اس کو اس کی بدی اور نیکی سمجھائی"

یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ایمان سے محروم لوگوں کے ہاں بھی اخلاقِ حسنہ کے کچھ مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں۔ تاہم یہ چند ایک مستثنیات ہیں جو بڑی قلیل تعداد میں اور وہ بھی محدود دائرے میں ہیں۔ عمومی اور اُصولی قاعدہ یہی ہے کہ رہنمائی کے قابل ضمیر صرف وہی ہوتا ہے جس نے ایمان کی روشنی سے جلا پائی ہو، جسے تعلیماتِ دین نے مسائلِ حیات کا مکمل شعور بخشا ہو، جو حلال و حرام سے پوری طرح باخبر ہو اور خطاء و صواب میں امتیاز کر سکتا ہو۔ جس کی آواز ہر حال میں صداقت پر مبنی ہو اور جو ہر قیمت پر اُصولوں کی پاسبانی کرتا ہو یہ سارے اوصاف اُسی ضمیر کے ہیں جو نورِ ایمان سے منور ہو۔ جہاں تک نورِ ایمان سے محروم ضمیر کا تعلق ہے تو اس حوالے سے تاریخ کی یہ واضح شہادت موجود ہے کہ ہر دور میں دنیا کے مختلف ممالک میں رہنے والے لوگ ضمیر کی آواز کو سنتے رہے ہیں مگر اُن کے "قلوب و ضمائر کبھی ہم آہنگ نہیں پائے گئے حالانکہ محاسنِ اخلاق کی عمارت تو اُن عالمگیر سچائیوں پر قائم ہونی چاہئے جو زمان و مکاں کے تغیر و تبدل سے ماوراء ہوں مگر یہاں ایسا نہیں ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک زمانہ کے لوگ ایک چیز کو عین عدل اور سراپا خیر سمجھتے ہیں مگر بعد کے کسی دور میں اُسی چیز کو عدل کے منافی اور خیر سے محروم قرار دے دیا جاتا ہے۔ مثلاً عہدِ

---

(۱۰) الشمس ۹۱:۸

قدیم کے یونانی غلامی کو جائز سمجھتے تھے اور اُن کے ذہین و فطین لوگ بھی جانوروں اور بے جان اشیاء کی طرح مردوں، عورتوں اور بچوں کی خرید وفروخت کو بالکل فطری اور طبیعی عمل سمجھتے تھے۔ قدیم روما کے قوانین دیگر مال و اسباب کی طرح بیوی بچوں کو بھی شوہر کی ملکیت قرار دیتے تھے اور باپ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی نو مولود بچی کو مارکیٹ میں لے جائے اور فروخت کردے بشرطیکہ اس کی کوئی اور بچی موجود ہو۔ تو یہ اپنے دور کے مہذب معاشروں کا حال تھا۔ اُن لوگوں کا ضمیر انسانوں کی خرید وفروخت جیسے جرم پر اُنہیں ملامت نہیں کرتا تھا۔ لیکن آج دنیا کا کوئی بھی ملک یا معاشرہ جسے تہذیب کی ذراسی بھی ہوا لگی ہے وہ ان افعال کو جائز قرار نہیں دے سکتا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دین وایمان کی روشنی کے بغیر ضمیر انسانی صحیح رہنمائی کے قابل نہیں ہوتا۔ یکساں نوعیت کے اعمال وافکار کے بارے میں تمدنی و معاشرتی حالات بدل جانے سے اُس کی رائے میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ اسی حوالے سے ایک اور بہت بڑی مثال اہلِ عرب کی ہے۔ اسلام کا سورج طلوع ہونے سے پہلے اُن کا رہن سہن، پسند و ناپسند اور صحیح و غلط کا معیار کچھ اور تھا۔ وہ شراب و قمار کے دلدادہ تھے، حرام خوری اور حرام کاری سے اُن کی طبیعت میں کراہت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اپنی معصوم بچیوں کو زندہ درگور کردینا بھی اُن کے نزدیک کوئی بُرا کام نہیں تھا عورتوں پر ظلم و ستم کرنا، یتیموں کا مال کھانا اور ذرا ذراسی بات پر قتل و غارت گری پر اُتر آنا اُن کے روزمرہ کے مشاغل تھے ان تمام اعمالِ قبیحہ کا ارتکاب دن رات کرنے کے باوجود اُن کا ضمیر کبھی ملامت نہ کرتا تھا۔ مگر یہی لوگ جب اسلام کے دامن سے وابستہ ہوگئے اور دین فطرت کی تعلیمات کو جذب کرنے لگے تو اُن کی زندگیوں کا رنگ ہی بدل گیا اُن کے جائز ناجائز اور خیر وشر کے پیمانے پہلے سے بالکل مختلف ہو گئے اور اب اُن کے ضمیر کی آواز بھی وہ نہیں تھی جسے وہ پہلے کبھی سنا کرتے تھے۔

صدائے ضمیر کا یہ اختلاف اس حقیقت کے اثبات کے لیے بالکل کافی ہے کہ ضمیر اپنی مطلق حیثیت میں فضائلِ اخلاق اور اعمالِ حسنہ کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ بلاشبہ ضمیر ایک فطری قوت ہے اور ایک ملکہ تمیز سے عبارت ہے مگر اس ملکہ کو معصوم قرار نہیں دیا جاسکتا۔

فرد کی زندگی میں عمر کے اختلاف سے، ایک ماحول سے دوسرے ماحول میں منتقل ہو جانے سے، عقل و شعور کے ترقی کر جانے سے، تہذیبی و تمدنی اثرات مرتب ہونے سے اور رفقاء واحباب کی تبدیلی وغیرہ جیسے عوامل کی وجہ سے اس فطری قوت کے اندازے اور تخمینے بھی بدل جاتے ہیں، اس کی سوچ کا انداز کچھ اور ہو جاتا ہے، حالات کے تغیر و تبدل سے ملکہ تمیز کے ادراکات و احساسات میں زمین و آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے اور کسی ایک حالت پر باقی نہیں رہتے۔ انہیں قرار و ثبات اور صحت و صواب سے ہمکنار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس فطری قوت اور ملکہ تمیز یعنی ضمیرِ انسانی کو کسی ٹھوس اور پائیدار حقیقت سے مربوط اور منسلک کر دیا جائے۔ ایسی حقیقت جو معصوم ہو اور ہر شائبہ عیب وخطا

سے پاک ہو وہ دین وایمان ہی ہو سکتی ہے جس کا منبع و سرچشمہ عقلِ انسانی نہیں بلکہ الہامی ہدایت ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دین وایمان کے بغیر ضمیر ایک بے معنی چیز ہے۔

ایمان اور اجتماعی زندگی

فرد اور معاشرہ کے درمیان تعلق کی نوعیت خاصی پیچیدہ ہے اور کسی ایسی حدِّ فاصل کا تعین آسان نہیں جو فرد اور معاشرہ کی حدودِ عمل کو واضح کر سکے۔ اس لیے کہ جو چیز فرد پر اثر انداز ہوتی ہے وہی معاشرہ پر بھی اپنے اثرات مرتب کرتی ہے اور پھر معاشرہ ہے کیا؟ افراد کے مجموعہ ہی کا تو نام ہے۔ افراد جن اعمال واخلاق اور جس سیرت و کردار کے حامل ہوں گے معاشرہ میں بھی وہی روح جاری و ساری ہو گی۔ اس تعلق کو ایک مثال کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ دیوار، اینٹیں چن کر تعمیر کی جاتی ہے۔ اینٹیں اگر کچی ہوں گی تو دیوار بھی ناپختہ ہو گی اور اگر اینٹیں پختہ ہوں اور اُنہیں ایک دوسرے سے پیوست کرنے والا مواد یعنی ریت اور سیمینٹ مناسب مقدار سے مرکب ہو تو دیوار بھی یقیناپختہ ہو گی۔ پس ایک بنیانِ مرصوص کی تعمیر کا خواب اُس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک خوب مستحکم اور مضبوط اینٹیں موجود نہ ہوں۔

یہی حال کسی معاشرے کی تعمیر کا ہے۔ کسی معاشرہ کے افراد اپنی انفرادی حیثیت میں جس قدر پختہ شخصیت کے مالک ہوں گے اُسی قدر مضبوط اور مستحکم معاشرہ معرضِ وجود میں آئے گا۔ ایمان افرادِ معاشرہ کی سیرت و کردار میں نکھار پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں ایک صالح معاشرہ قائم ہو سکے۔ لیکن اس مسئلے کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ کوئی فرد اگر انفرادی طور پر نعمتِ ایمان، سکونِ قلب، امانت و دیانت اور صبر و استقامت جیسے اوصاف سے متصف ہو بھی جائے تو ناموافق ماحول کی موجودگی میں سعادت کے مرتبہ کمال تک پہنچنا دشوار ہوتا ہے۔ یہ بلند مقام کسی فرد کو حقیقتاًاُسی وقت نصیب ہوتا ہے جب پورااجتماعی موحول نہ صرف ان صفات کے لیے سازگار ہو بلکہ انہیں پروان چڑھانے میں ممدو معاون ہو۔

ایک اچھے معاشرے کی سب سے بڑی خوبی افراد کا باہمی ربط وضبط ہے اسی کے ذریعے افراد کے مابین محبت و یگانگت کے رشتے استوار ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ہمدرد و خیر خواہ بن کر رہتے ہیں، نہ کوئی کسی پر زیادتی کرتا ہے اور نہ سنگدلانہ برتاؤ، بہترین اور سعادت مند معاشرہ وہ ہے جس میں دولت مند لوگ محروم طبقہ کو فراموش نہیں کرتے اور اثر ورسوخ اور قوت و طاقت کے مالک لوگ کمزوروں کو نظر انداز نہیں کرتے بلکہ اُنکی معاونت اور دستگیری کرتے ہیں بدترین چیز جو کسی معاشرہ کو لاحق ہوتی ہے وہ انتشار و پراگندگی اور باہمی روابط کا فقدان ہے اور یہ صورت اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب افراد خود غرضی کا شکار ہو جائیں۔ وہ اپنی ذات اور اپنے مفادات کو تو یاد رکھیں مگر اپنے بھائی کا

بالکل خیال نہ کریں بلکہ موقع ملنے پر اُسے اپنی اغراض کی بھینٹ چڑھانے سے بھی گریز نہ کریں۔ اسی طرح وہ وقت بھی کسی معاشرہ کے لیے بہت بُرا وقت ہوتا ہے جب افراد اپنے حقوق کے لیے لڑیں مگر اپنے فرائض سے غافل ہوں۔ نیز اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھیں اور دوسری مخلوقِ خدا کو بنظرِ حقارت دیکھیں۔

اس کے برعکس ایک دوسری قباحت جو مذکورہ بالا سے کسی طرح کم نہیں ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کے احساس ہی سے یکسر محروم ہو جائے۔ وہ معاشرے کے سمندر میں اپنے آپ کو اس طرح گم کردے کہ اُسے یاد ہی نہ رہے کہ اس سمندر میں اُس کی کوئی اپنی اہمیت و حیثیت بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے جو شرف عطا کیا ہو اور جو قوت و طاقت اُسے تفویض کی ہو اور جن انعامات سے نوازا ہو وہ ان کا شعور اور ادراک ہی نہ رکھتا ہو اور اپنی صلاحیتوں کو معطل اور بے کار کر کے بیٹھ جائے تو یہ چیز بھی انسان کی شخصیت کو نقصان پہنچاتی ہے اور اُسے کمزوری اور پست ہمتی کا شکار بنادیتی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ فرد اور معاشرہ کے مابین ان دونوں انتہا پسندانہ نظریات کے درمیان ایک ایسی حدِّ وسط تلاش کی جائے جہاں افراد اپنی ذات کا احساس بھی رکھیں اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کے حقوق و واجبات بھی تلف نہ ہوں یعنی معاشرہ بھی مستحکم بنیادوں پر قائم رہے اور فرد کی شخصیت کی نشوونما بھی صحیح طریقے سے ہو سکے۔ اس حدِّ وسط کے تعین کو عقلِ انسانی پر چھوڑا جائے تو اُس کے لیے بہت ہی مشکل کام ہے۔ کئی فلاسفروں اور دانسوروں نے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی مگر کوئی مثالی حل سامنے نہ آسکا۔ یہ ایمان ہے جو اس مسلے کو خوبصورتی سے حل کر دیتا ہے۔ ایک طرف تو:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي اٰدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا﴾ (۱۱)

"اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی ہے اور خشکی اور دریا میں اسے سوار کیا اور ہم نے انہیں ستھری چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر انہیں فضیلت عطا کی"

کہہ کر فرد کے سر پر فضیلت کا تاج رکھ دیتا ہے اُسے اُس کے مقام و مرتبہ سے آشنا کر دیتا ہے اور اُسے بتا دیتا ہے کہ انسانیت کے اس گلستان میں وہ ایک ایسا پھول ہے جس کا اپنا رنگ اور خوشبو ہے۔ اُسے اپنی شخصیت کو سنوارنا، نکھارنا اور پروان چڑھانا ہے۔ دوسری طرف:

﴿ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (۱۲)

---

(۱۱) الاسراء۱۷:۷۰

"اور آپس میں نیک کام اور پرہیزگاری پر مدد کرو، اور گناہ اور ظلم پر مدد نہ کرو"

کہہ کر انسان کو اجتماعی اور معاشرتی زندگی میں اپنا بھرپور اور موثر کردار ادا کرنے کی تلقین کرتا ہے تاکہ وہ اپنی انفرادیت کی نشو ونما کے ساتھ ساتھ معاشرے کے حسن وزیبائش میں بھی اضافہ کر سکے۔ گویا فرد ایک پھول ہے تو معاشرہ گلدستہ جب ایک پھول اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے کسی گلدستے کا حصہ بن جاتا ہے تو گلدستہ کی خوبصورتی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اُس کی اپنی قدر وقیمت بھی بڑھ جاتی ہے۔

ایمان اور دنیوی زندگی

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دین وایمان مجرد عقائد کا نام ہے جو انسان کو زندگی کی حرکت اور حرارت سے محروم رکھتے ہیں۔ اُس کے دل سے دنیا کی محبت وخواہش کو بالکل مٹا دیتے ہیں اور اُس کے اندر عمل اور جدوجہد کے لیے کوئی رغبت باقی نہیں رہنے دیتے۔ ایمان کے بارے میں یہ مغالطہ جہالت کا پیدا کردہ ہے۔ کیونکہ حقیقت ایمان ذہنی و قلبی تصدیق کا نام ہی نہیں بلکہ عمل اور جدوجہد سے بھی عبارت ہے۔ عمل ایمان کا جزولاینفک ہے۔ عمل دنیوی کامیابی اور آخروی سعادت کی بنیاد ہے۔ کقولہ تعالیٰ:

﴿وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (۱۳)

"اور یہی وہ جنت ہے جس کے تم وارث بنائے گئے ہو ان اعمال کے بدلے میں جو تم کرتے تھے"

یہ تو تھا اُخروی سعادت کا عمل پر موقوف ہونا ہے۔ جہاں تک دُنیوی کامیابی کا تعلق ہے وہ بھی عمل سے ہی حاصل ہوتی ہے:

﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ (۱۴)

"اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جو کرتا ہے"

تعلیمات اسلام میں محنت، مزدوری اور ہاتھ سے کام کرنے کی بہت زیادہ فضیلت بیان کی گئی ہے۔ تجارت اور کاروبار کے اُصول وضع کیے گئے ہیں حکومت وسلطنت کے فرائض، امن وامان کا قیام، معاشرتی زندگی کے قواعد وضوابط

---

(۱۲) المائدہ۵:۲

(۱۳) الزخرف۴۳:۷۲

(۱۴) النجم۵۳:۳۹

اور تسخیر کائنات کے جو ضابطے بیان کیے گئے ہیں وہ سب کے سب اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اسلام جہد مسلسل کا دین ہے جو انسان کو ہر وقت چاق و چوبند رکھتا ہے اور اُس کی سعی و عمل کی قوتوں کو ہر وقت مصروتِ عمل دیکھنا چاہتا ہے۔ نیز رضائے الٰہی کی نیت سے دنیوی مقاصد کے حوالے سے کی جانے والی سرگرمیوں کو بھی اعلیٰ درجے کی عبادت قرار دیتے ہوئے زندگی کے ایک ایک لمحہ کو قدر و قیمت کا حامل بنا دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان پر کاربند ہونے کی صورت میں آخرت کا نفع تو ملتا ہی ہے ساتھ دنیوی زندگی بھی خوبصورت بن جاتی ہے۔ بقول قرآنِ مجید:

﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (۱۵)

"جنہوں نے نیکی کی ہے (ان کے لیے) اس دنیا میں بھی بہتری ہے، اور البتہ آخرت کا گھر تو بہت ہی بہتر ہے، اور پرہیز گاروں کا کیا ہی اچھا گھر ہے"

چنانچہ اگر دنیوی فلاح و بہبود کے پیمانہ ہی سے دین کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جائے تو بھی اس کا پلڑا ہر چیز پر بھاری ہے تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ دین انسانی کی بنیادی ضرورت ہے۔ یہ فرد کے لیے ناگزیر ہے تاکہ وہ اطمینانِ قلب حاصل کر سکے، سعادت مند بن سکے اور اپنے نفس کا تزکیہ کر کے اعلیٰ اخلاق سے متصف ہو سکے اور معاشرے کے لیے بھی ضروری ہے تاکہ اُس میں ٹھہراؤ اور استحکام پیدا ہو، اخلاقی اقدار کا حامل بن سکے او نعت و ارتقاء سے ہمکنار ہو سکے۔

دین و ایمان کی نگاہوں میں دنیوی زندگی کی کیا اہمیت ہے اس کا اندازہ اس دُعا سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو اہلِ ایمان کو تلقین کی گئی ہے۔

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (۱۶)

"اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں نیکی اور آخرت میں بھی نیکی دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا"

یہاں صرف آخرت کی سعادت و خوش بختی ہی مانگنے کی بات نہیں کی گئی بلکہ آخرت سے پہلے دنیوی زندگی کی بھلائی مانگنے کو بھی اہل ایمان کا شعار بتایا گیا ہے۔ لہٰذا ایمان بالاخرۃ کا یہ معنیٰ نہیں کہ دنیا اور اُس کے معاملات سے کوئی

---

(۱۵) النحل ۱۶: ۳۰

(۱۶) البقرہ ۲: ۲۰۱

سروکار نہ رکھا جائے اور آدمی سعی و عمل اور جدوجہد سے دستبردار ہو جائے۔ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرام میں زراعت پیشہ بھی تھے، تاجر بھی تھے اور دیگر شعبہ ہائے زندگی کے لوگ بھی تھے۔ اُن کے نزدیک ایمان کا یہ مفہوم بالکل نہیں تھا کہ کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے اللہ تعالیٰ خود بخود ہی سارے معاملات درست کر دے گا۔

اسلام کی تعلیمات میں ایک اہم چیز توکل ہے۔ یعنی اللہ پر بھروسہ کرنا بعض لوگ اس کا مطلب ترکِ اسباب لیتے ہیں جو کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ توکل کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ آدمی اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے پوری کوشش کرے اور ممکن حد تک ذرائع وسائل کو استعمال کرنے کے بعد نتائج کے لیے اللہ تعالیٰ پر انحصار کرے اور یہ نہ سمجھے کہ میری کوشش ہی مطلوبہ نتائج کی ضامن ہے۔ جیسا کہ اعرابی والے واقعہ سے سمجھ میں آتا ہے۔ اُس نے مسجد کے دروازہ پر اپنا

اُونٹ کھلا چھوڑ دیا اور یہ گمان کیا کہ یہ توکل ہے۔ اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا:

(اعقلها وتوكل) [۱۷]

اسی طرح بعض لوگ اس حدیث سے ترکِ اسباب کا نتیجہ اخذ کرتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم اللہ پر توکل کرو جیسا کہ توکل کا حق ہے تو اللہ تمہیں بھی اُس طرح رزق دے۔ جیسے پرندوں کو دیتا ہے وہ خالی پیٹ اپنے آشیانوں سے نکل جاتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں۔ لیکن معمولی غور و فکر سے کام لیا جائے تو صورتِ حال اس کے برعکس نظر آتی ہے۔ پرندے آشیانوں سے نکلتے ہیں تو پھر اُن کی شکم سیری کا بندوبست ہوتا ہے۔ آشیانوں میں بیٹھے ہوئے تو اُن کے پیٹ نہیں بھر جاتے۔ اس حدیث سے ترکِ اسباب کا اثبات تو اس حدیث سے اُس صورت میں ہو سکتا تھا اگر حضور علیہ السلام نے یہ فرمایا ہوتا کہ پرندے خالی پیٹ اپنے آشیانوں میں ہی بیٹھے رہتے ہیں اور اُن کے پیٹ بھر جاتے ہیں۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کی جملہ تعلیمات اور زندگی بھر کے اُسوہ حسنہ سے جو سبق ملتا ہے وہ یہی ہے کہ دنیا کے وسائل و اسباب کو بھرپور طریقے سے استعمال میں لایا جائے اور اس کے لیے ممکن حد تک جدوجہد بھی کی جائے تاہم اس کو مقصود نہ بنالیا جائے۔ مقصود آخرت کو بنایا جائے اور دنیا کو اس مقصود کے حصول کا ذریعہ سمجھ کر اختیار کیا جائے۔

ایمان کی حقیقت

ایمان کے وہ تمام انفرادی و اجتماعی اثرات جو سطورِ بالا میں بیان کیے گئے ہیں اُس سے مراد محض لسانی، ظاہری، رسمی، رواجی اور موروثی ایمان نہیں ہے جو ایک شخص کو محض مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے پر مل جاتا ہے اور

---

[۱۷] ابن حبان، الصحیح، رقم: ۷۳۱، ۲/ ۵۱۰

اُسے قلب و باطن میں اُتارنے نیز مضبوط و مستحکم بنانے میں اُس نے کوئی کوشش نہیں کی ہوتی بلکہ اس سے مراد وہ زندہ بیدار اور شعوری ایمان ہے جو ظاہر سے گزر کر باطن میں گھر کر چکا ہو اور لسانی اقدار سے آگے بڑھ کر قلبی تصدیق کے درجے کو پہنچ چکا ہو جیسا کہ ایمان مجمل کی تعریف میں اقرارِ لسانی کے ساتھ تصدیق قلبی کو بھی شامل کیا گیا ہے:

(اقرار باللسان وتصديق بالقلب)[١٨]

چنانچہ حقیقی ایمان وہی ہے جو انسان کے رگ و ریشے میں اس طرح رچ بس جائے کہ اُٹھتے بیٹھتے زبان سے اُسی کا اظہار ہو اور ایسی تصدیق کہ اُس کے متعلق دل میں شک و تردد کا کوئی شائبہ بھی باقی نہ رہے۔ یہی اقدار و تصدیق انسان کے افکار و نظریات کی صورت گری کرے اسی کے سانچے میں اُس کے جملہ اعمال و افعال ڈھل جائیں اور زندگی کی تمام سرگرمیوں میں ایمانی نظریات کا رنگ چھلکتا ہوا دکھائی دے۔ ایمان کس طرح عمل کو مستلزم ہے اس کا اندازہ ذیل کی حدیث سے لگایا جا سکتا ہے:

(الإيمان بضع وستون شعبة والحياء شعبة من الإيمان)[١٩]

"ایمان کے ستر سے زائد شعبے ہیں اور حیاء بھی ایمان کا حصہ ہے"

اسی طرح ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا:

(من أحب لله وأبغض لله وأعطى لله ومنع لله فقد استكمل الايمان)[٢٠]

"جس نے اللہ کی خاطر ہی کسی سے محبت کی اور اللہ کی خاطر ہی کسی سے نفرت کی اور اللہ کی خاطر ہی کسی کو دیا اور اللہ کی خاطر ہی کسی کو نہ دیا تو اُس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔"

مندرجہ بالا احادیث مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ حقیقی ایمان پوری زندگی پر اپنے نقوش مرتب کرتا ہے اور اُسے اللہ کے رنگ (صبغتہ اللہ) میں رنگ دیتا ہے انسان کے افکار و نظریات، اُس کے جذبات و اطوار، حرکات و سکنات اور اعمال و افعال سب کے سب اطاعتِ الٰہی اور اللہ کی بندگی کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہوتا جو دائرہ ایمان سے باہر ہو۔ یہی وہ ایمان ہے جو انسان کو اخلاق کے اعلیٰ مراتب تک پہنچاتا ہے۔ اُس کی سیرت و کردار کی

---

[١٨] عسقلانی،، فتح الباري، رقم:٦١٣٥، ١١/ ٣٣٩

[١٩] بخاری، الصحیح، رقم:٩،، ١/ ١٢

[٢٠] ابوداود، سلیمان بن اشعث سجستانی، السنن، دار الفکر، بیروت، رقم:٤٦٨١، ٤/ ٢٢٠

اصلاح کرتا ہے، اُس کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے لیے اُسے مفید اور کار آمد بناتا ہے۔

گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایمان نہ تو محض زبانی دعوٰی کا نام ہے اور نہ ہی ذہنی طور پر بعض حقائق کی معرفت کو حاصل کر لینے کا نام ہے یہ تو درحقیقت ایک ایسا اخلاقی اور روحانی عمل ہے جو دل و دماغ کی گہرائیوں تک اپنا اثر و نفوذ رکھتا ہے اور انسان کے ارادہ و اختیار عقل و شعور اور وجدان غرض ہر چیز کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور وحی والہام کی مدد سے انسان پر حقائق کا انکشاف کرتا ہے اور یہ انکشاف محض علم کی حد تک نہیں رہتا بلکہ ایسے محکم یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے جہاں ریب و تشکک کا کوئی حملہ بھی اُسے متزلزل نہیں کر سکتا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ﴾ (۲۱)

"بے شک سچے مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے شک نہ کیا اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہی سچے (مسلمان) ہیں"

یہ یقینی علم جو کسی انسان کو ایمان کی بدولت نصیب ہوتا ہے اُس کے دل کو ذاتِ حق کے تابع کر دیتا ہے۔ اُس کے ارادہ و اختیار کو سمع وطاعت سکھاتا ہے اور اُس کے تکبر و غرور کو خشوع و خضوع میں بدل دیتا ہے اور بالآخر گوشت پوست کا یہ مجسمہ تسلیم و رضا کا پیکر بن جاتا ہے اس کے بعد معرفت حق انسان کے اندر حرارت عمل پیدا کرتی ہے۔ اور عقیدہ و ایمان کے مقتضیات کی تکمیل کے لیے اُسے سرگرم بنا دیتی ہے۔

ایمان اور عصرِ حاضر کے مسائل

دین و ایمان سے محروم لوگ، نام نہاد قسم کے دانشوار اور جدید سیکولر ذہن کے حاملین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مذہب کی تعلیمات صدیوں پرانی ہیں جو جدید دور کے مسائل کو حل نہیں کر سکتیں۔ زندگی اور اُس کے مسائل بہت آگے بڑھ چکے ہیں ایمان کے پاس اُن کا شافی حل نہیں ہے۔ یہ بھی ایک بہت بڑا مغالطہ ہے۔ جس میں حقیقت کوئی نہیں ہے۔ اس لیے کہ مسائل بھی وہی ہیں جو ہزاروں سال پہلے تھے اور اُن کے حل کے لیے نسخہ بھی وہی کار آمد ہے جو صدیوں کا آزمودہ ہے. بقول علامہ اقبالؒ

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک

---

(۲۱) الحجرات ۴۹:۱۵

دلیل کم نظری ہے مقصد جدید و قدیم [۲۲]

زندگی کے مسائل جو آج سے صدیوں پہلے تھے وہی آج بھی فکرِ انسانی پر تسلط جمائے ہوئے ہیں فرق جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ آج یہ مسائل نئے رنگ میں سامنے آئے ہیں نیز اُن کی شدت میں اضافہ ہو گیاہے۔ آج سے ہزاروں سال پہلے بھی انسان کو امن کی ضرورت تھی اور آج بھی انسان اس کا شدت سے ضرورت مند ہے۔ آفاتِ ارضی و سماوی، دکھ، تکلیف اور بیماریاں پہلے بھی انسانوں کو لاحق تھیں اور آج بھی ہیں۔ انسان ایک دوسرے کے حقوق پر پہلے بھی ڈاکہ ڈالتا تھا اور آج اس تہذیب و تمدن کے روشن دور میں بھی ڈاکہ زنی عام ہے، جھوٹ، مکر و فریب، وعدہ خلافی و بدعہدی جیسے اوصافِ رذیلہ اُس زمانے میں بھی انسان کے لیے مُضر تھے جب وہ اُونٹوں اور گدھوں پر سواری کرتا تھا اور آج بھی جب کہ وہ کاروں اور جیٹ طیاروں میں سفر کرتا ہے، اُن کی مُضرت میں کوئی کم واقع نہیں ہوئی ظلم و ستم، انسانوں کا انسانوں کے ہاتھوں استحصال پتھر کے زمانے میں بھی ہوتا تھا اور آج ایٹم کے دور میں بھی حق تلفی اور استبداد کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ خدا کے خوف سے عاری اور ابنیاء ورسل کی تعلیمات سے انحراف کرنے والے لوگوں کی پہلے بھی کمی نہ تھی اور آج بھی کمی نہی ہے۔ مرد وعورت اور فرد و معاشرہ کے مابین تعلقات میں عالمِ انسانی افراط و تفریط کا شکار پہلے بھی رہاہے اور آج بھی ہے پس جب زندگی کے مسائل اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہی پرانے ہیں تو اُن کے حل کیلئے نسخہ کیمیا بھی وہی کار آمد ہو سکتا ہے جس نے چودہ صدیاں پہلے عرب کے بگڑتے تگڑتے لوگوں کی کایا پلٹ کر رکھ دی تھی اور اخلاقی انحطاط کی پستیوں میں گرے ہوئے معاشرہ کو اخلاقی کمال کے اُس مقام پر پہنچادیا تھا کہ وہ امامتِ عالم کی قیادت کے منصب پر فائز ہو گیا۔

۲۔علم

اخلاقی انحطاط کے تدارک میں ایمان کے بعد دوسری اہم چیز علم ہے جو اخلاق کی تہذیب و اصلاح، سیرت و کردار کے نکھار اور شخصیت کی ترقی وارتقاء میں مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔ علم ایک ایسا درخت ہے جس پر سوچ اور سمجھ کی شاخیں اُگتی ہیں۔ بصیرت اور عقل کے پھل لگتے ہیں جو شخصیت کی نشو نما کر کے اُس میں نکھار پیدا کرتے ہیں۔ ایسی شخصیت معاشرے کا اثاثہ ہوتی ہے۔ علم ایک ایسا نور ہے جو شخصیت سے منفی اثرات کو غائب کر دیتا ہے۔ جب کسی انسان مُس علم کا نور داخل ہوتا ہے تو اُس میں محبت و شفقت، عزت و احترام، ہمدردی و خیر خواہی، ایثار و قربانی، تواضع و انکساری صداقت و دیانت اور خلوص جیسے اعلیٰ اوصاف پیدا کر دیتا ہے ایسے انسان کا وجود معاشرے کے لیے روشنی کے

[۲۲]ضربِ کلیم، ص۳۸/۵۳۸

مینار کی مانند ہوتا ہے جو نہ صرف خود روشن ہوتا ہے بلکہ اپنے وجود سے دوسرے لوگوں کو بھی روشن کرتا ہے اور اُن کی رہنمائی کرتا ہے۔

انسانیت کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ قوموں کے عروج وزوال میں علم کا بہت زیادہ کردار ہے۔ ہر دور میں وہی قومیں قیادت کے منصب پر فائز ہوئیں جو علم میں دوسروں سے آگے تھیں۔ جس زمانے میں مسلمان علمی میدان میں برتری کے حامل تھے اُس وقت امامتِ عالم کا تاج بھی انہی کے سر پر سجا ہوا تھا لیکن جب سے علم کی دوڑ میں مغربی اقوام آگے بڑھ گئی ہیں زندگی کے دوسرے میدانوں میں بھی قائدانہ حیثیت اُنہی کو حاصل ہے اور مسلمان ہر معاملے میں اُن کی پیروی کرنے پر مجبور ہیں۔

علم طاقت ہے

اس کائنات میں طاقت کے بہت سے ذرائع ہیں، مال و دولت بھی اپنے اندر ایک طاقت رکھتی ہے۔ کسی عہدہ و منصعب پر فائز ہونا بھی طاقت کا حامل بناتا ہے، ہم خیال لوگوں کا میسر آجانا بھی انسان کو طاقتور بناتا ہے۔اسی طرح بندوق، توپ، ٹینک اور دوسرے ہتھیار بھی طاقت کا ذریعہ ہیں مگر دنیا کی کوئی مادی طاقت ایسی نہیں ہے جو علم کی طاقت کا مقابلہ کرسکے۔ دینا میں بڑے بڑے انقلابات علم کی طاقت سے ہی برپا ہوتے ہیں۔ علم سے مراد کوئی مخصوص علم نہیں ہے بلکہ ہر قسم کا علم ہے۔ یہ علم مذہبی بھی ہو سکتا ہے اور سیکولر بھی، روحانی بھی ہو سکتا ہے اور مادی بھی دین کا بھی ہو سکتا ہے اور دنیا کا بھی قدیم بھی ہو سکتا ہے اور جدید بھی کسی مخصوص شعبے (Specif ic Field) کا بھی ہو سکتا ہے اور عمومی (General) بھی ایک شخص جو کسی بھی فیلڈ میں ہے مثلاً ڈاکٹر، انجینئر وغیرہ تو جب تک وہ اپنے مخصوص شعبے کے حوالے سے علمی پختگی کا حامل نہیں ہو گا کوئی بہت زیادہ ترقی نہیں کرسکے گا اور نہ ہی اس میں اپنا مقام بنا سکے گا۔ اور عمومی علم سے مراد ہے کہ س وقت دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ قومی معاملات کیا ہیں اور بین الاقوامی مسائل کیا ہیں؟ دنیا کن خطوط پر آگے بڑھ رہی ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں کیا ترقیاں (Developement) ہو رہی ہیں وغیرہ۔ جو شخص جس معاملے میں جتنا زیادہ علم حاصل کرے گا اُس کی ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے امکانات اُتنے ہی زیادہ روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔

علم اور تسخیرِ کائنات

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور کائنات اور اس کی جملہ اشیاء کو انسان کے لیے ہی بنایا گیا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ [۲۳]

"اللہ وہ ہے جس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے پیدا کیا ہے"

مزید یہ کہ پوری کائنات اور اُس کے جملہ مظاہر کو انسان کے لیے مسخر بھی کر دیا گیا ہے تاکہ وہ حسبِ منشاء اُن سے کام لے سکے:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمَاوَاتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ﴾ [۲۴]

"اور اس نے آسمانوں اور زمین کی سب چیزوں کو اپنے فضل سے تمہارے کام پر لگا دیا ہے"

لیکن انسان کے اندر مسخر کرنے کی قوت اور کائنات کے اندر مسخر ہونے کی صلاحیت بالقوہ ہے بالفعل نہیں ہے یعنی بطور امکان تو ہے لیکن بطورِ واقعہ نہیں ہے۔ جیسے ایک بیج کے اندر درخت بننے کا امکان تو موجود ہوتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ درخت بن بھی جائے اس امکان کو حقیقت میں بدلنے کے لیے اُس پر قوانین فطرت کی روشنی میں محنت کرنا ہو گی۔ ایسے ہی تسخیرِ کائنات کو بطورِ واقعہ معرضِ وجود میں لانے کے لیے اُس کی حکمتِ عملی کو اپنانا ہو گا اور اُس حکمتِ عملی کو آشکار کرنے والی قوت کا نام علم ہے۔ علم ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے ذریعے انسان ستاروں پر کمندیں ڈال سکتا ہے، ہواؤں اور فضاؤں پر حکمرانی کر سکتا ہے، پہاڑوں کا جگر کاٹ سکتا ہے، بپھرے ہوئے سمندروں کا رُخ موڑ سکتا ہے، زمین کا سینہ چیر کر اُس کی تہہ میں چھپے ہوئے خزانوں کو اپنے تصرف میں لا سکتا ہے اور شیر، چیتے، ہاتھی وغیرہ جیسے وحشی درندوں کو پنجرے میں بند کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کا نظام بڑے ٹھوس اور محکم قوانین پر اُستوار کیا ہے:

﴿قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا﴾ [۲۵]

"اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک پیمائش مقرر کر دی ہے"

یہ قوانین اتنے اٹل ہیں کہ ان میں کسی بھی قسم کا تغیر و تبدل ممکن ہی نہیں:

﴿سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا﴾ [۲۶]

---

[۲۳] البقرہ ۲:۳۰

[۲۴] الجاثیہ ۴۵:۱۳

[۲۵] الطلاق ۶۵:۳

"یہی اللہ کا قانون ہے ان لوگوں میں جو اس سے پہلے ہو گزرچکے ہیں، اور آپ اللہ کے قانون میں کوئی تبدیلی ہر گز نہ پائیں گے"

چنانچہ اس کائنات میں رونما ہونے والے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کی تہہ میں کوئی نہ کوئی قانون کام کر رہا ہوتا ہے جسے سائنس کی زبان میں علت و معلوم کا قانون(Law of Cause & Effect) کہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کسی درخت کی شاخ سے ایک پتہ بھی کسی قانون کے بغیر نہیں گرتا ہے علم کائنات کے سربستہ رازوں کو انسان پر آشکار کرتا ہے اور اُن قوانین کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے جو تمام حرکات وسکنات کے پسِ پردہ کارفرما ہیں۔ چنانچہ علم کی بدولت انسان کے لیے مظاہرِ کائنات کی حقیقت کو سمجھ کر اُن پر تصرف کرنا اور اُنہیں اپنے لیے مفید بنانا آسان ہو جاتا ہے۔ جو قومیں آج ترقی کے بامِ عروج پر پہنچی ہوئی ہیں اور بحر و بر پر حکمرانی کر رہی ہیں اُن کے پیچھے یہی علم کی قوت ہے۔ سائنس کی تمام ایجادات و اکتشافات علم ہی کے مرہونِ منت ہیں۔ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ سائنس قوانین کو ایجاد نہیں کرتی بلکہ صرف اُنہیں دریافت کرتی ہے اور پھر اُنہیں استعمال میں لاتے ہوئے ترقی وارتقاء کا سفر طے کرتی ہے۔

علم اور تسخیرِ ذات

مندرجہ بالا علم کی افادیت کا خارجی پہلو ہے جہاں تک اس کے داخلی پہلو کا تعلق ہے تو علم انسان کو کائنات کی تسخیر کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کی تسخیر کا طریقہ بھی بتاتا ہے۔ جس طرح کائنات کا کارخانہ مخصوص قوانین کے تحت چل رہا ہے اسی طرح خالقِ کائنات نے زندگی کی بقاء، ارتقاء اور نشو نما کے بھی قوانین بنا رکھے ہیں عروج وزوال اور فنا و بقاء کو خاص ضابطوں کا پابند بنا رکھا ہے۔ علم کے ذریعے اُن قوانین کو جان کر زندگی کے معیار کو بہتر سے بہتر بنایا جا سکتا ہے اور کامیابی، ترقی اور عروج کی فطری خواہش کو پورا کیا جا سکتا ہے ہر انسان کے اندر ایک وسیع کائنات موجود ہے جہاں جذبات ہیں، خیالات ہیں، خواہشات ہیں، آرزوئیں ہیں، اُمنگیں اور تمنائیں ہیں۔ علم کے ذریعے اپنے من کی دنیا میں جھانک کر ان چیزوں کو نظم وضبط کا پابند بنا کر اپنی شخصیت کو مہذب اور پاکیزہ بنایا جا سکتا ہے شخصیت کے منفی رجحانات پر قابو پا کر مثبت رویوں کو پروان چڑھایا جا سکتا ہے اور اپنی ذات کو اتنا نفیس بنایا جا سکتا ہے کہ وہ دنیا کے باغ میں ایک پھول کی طرح مہکتے ہوئے ماحول کو معطر کرے، سورج کی طرح روشنی بکھیرتے ہوئے ماحول کو منور کرے اور مرنے کے بعد جنت کی حسین و جمیل وادیوں میں بسنے کے قابل ہو سکے۔ چنانچہ علم انسان کو دنیا اور آخرت دونوں جگہوں میں مطلوب اور پسندیدہ بنا دیتا ہے۔

---

[۲۶] الاحزاب ۳۳:۶۲

علم اور اصلاحِ اخلاق

انسانی زندگی کا پہلا قانون "دفع ضرر اور جلبِ منفعت ہے۔"(۲۷)

یعنی ضرر سے بچنا اور نفع کو حاصل کرنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی فطرت اور جبلّت میں یہ بات رکھ دی گئی ہے کہ وہ ہر قسم کے نقصان سے اپنے آپ کو بچانا چاہتی ہے اور ہر قسم کے فائدے کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ یہ تقاضا صرف انسان میں ہی نہیں بلکہ ہر ذی روح کے اندر اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ وہ کسی حال میں اُس سے جدا نہیں ہو سکتا اور اس کے خلاف چلنا کسی کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔ دنیا کی بقا، ارتقا، اور نشو و نما کا تمام تر دار و مدار اسی قانون پر ہے۔

اس قانون کی مثالیں ہمیں جابجا ملتی ہیں۔ مثلاً ایک دن کا پیدا ہونے والا شیر خوار بچہ جب بھوک محسوس کرتا ہے تو وہ اُسکے ازالے کے لیے کسی شے کی طلب کا اظہار کرتے ہوئے رونا شروع کر دیتا ہے حالانکہ وہ لفظ بھوک سے آشنا بھی نہیں ہے۔ اسکی وجہ محض یہی ہے کہ بھوک کی حالت اُس کے لیے ضرر رساں اور نقصان دہ ہے لہٰذا اُس کی فطرت اُسے اس حالت سے بچانا چاہتی ہے چناچہ وہ اس حالت سے باہر آنے کے لیے دودھ یا کسی اور چیز کی طلب کرتا ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا ہاتھ اگر کہیں بے دھیانی میں آگ کی سمت بڑھنے لگے تو فوراً ہمارے ارادے کے بغیر ہی پیچھے ہٹتا ہے۔ ہماری آنکھوں میں اگر کوئی چیز پڑنے لگے تو وہ غیر ارادی طور پر چشمِ زدن میں بند ہو جاتی ہیں تاکہ ہر قسم کے نقصان سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔ یہ مثالیں اس حقیقت کو آشکار کرتی ہیں کہ ہم میں سے ہر شخص ہر معاملے میں فطری اور جبلّی طور پر ہر قسم کے نقصان سے بچنا چاہتا ہے اور ہر قسم کے فائدے اور منافع کو اپنے لیے حاصل کرنا چاہتا ہے۔

لیکن دوسری طرف روزمرہ کا مشاہدہ بتاتا ہے کہ لوگوں کی اکثریت شاہراہِ حیات پر سفر کرتے ہوئے تعمیر کو چھوڑ کر تخریب کی طرف چل پڑتی ہے اور بیسیوں ایسے کام کرتی ہے جو اُسے تباہی و بربادی کی طرف لے جانے والے ہوتے ہیں۔ مثلاً سگریٹ نوشی اور دوسرے نشہ جات کا استعمال، قتل، زنا، چوری، ڈکیتی، دوسروں کو ناحق ستانا اور اسی طرح کے بہت سے مذہبی، اخلاقی، سماجی و معاشرتی جرائم جن میں مبتلا ہو کر انسان دوسروں کو نقصان پہنچانے اور معاشرے کا امن و سکون تہس نہس کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی ذہنی و قلبی سکون و اطمینان سے محروم کر لیتا ہے اور دنیا و آخرت کی تباہیاں، بربادیاں، رسوایاں اور ذلتیں خرید لیتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ انسان اپنی فطرت کے تقاضوں کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے اُن کی مخالف سمت میں چلتے ہوئے نفع کی بجائے نقصان کا سودا کیوں کر لیتا ہے اور کامیابی و کامرانی کے راستے کو چھوڑ کر ناکامی و نامرادی کے

---

(۲۷) قرآن اور تعمیرِ سیرت، ص ۱۳

راستے پر چل کر اپنی منزل کو کھوٹا کیوں کر لیتا ہے؟ اس سوال کے جواب پر غور کرنے سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی دو چیزوں سے عبارت ہے، ایک فکر اور دوسرا عمل۔ فکر اور عمل اگرچہ دو الگ الگ چیزیں ہیں مگر دونوں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر اور لازم ہیں اور اسی طرح ملی ہوئی ہیں جیسے آگ کے ساتھ حرارت اور سورج کے ساتھ روشنی۔ ان دونوں میں تعلق یہ ہے کہ فکر مقدم ہے اور عمل مؤخر۔ انسان کا ہر عمل اُس کی فکر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر چیز پہلے خیال اور فکر کی سطح پر نمودار ہوتی ہے اور پھر اُس کے بعد عمل کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔ لہٰذا فکر اگر درست ہوگی تو عمل بھی درست ہو گا اور فکر غلط ہوگی تو عمل بھی غلط ہو جائے گا۔ لہٰذا عمل کو درست کرنا ہے تو پہلے فکر کو درست کرنا ہو گا۔ یہ فکر کی گمراہیاں ہیں جو انسان کو تعمیر کے راستے سے ہٹا کر تخریب کے راستے پر ڈال دیتی ہیں۔ تاریخِ انسانی میں جو بھی تخریب کاریاں، تباہیاں اور بربادیاں ہمیں دکھائی دیتی ہیں وہ سب کی سب پہلے انسانوں کے ذہنوں میں جنم لیتی رہی ہیں اور پھر ہی عمل کا روپ دھارتی رہی ہیں اور فکری گمراہیوں کا سبب ذہنی مغالطے، غلط فہمیاں اور توہمات ہیں جو حقیقت کے چہرے پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور انسان کو اشرف المخلوقات کے بلند ترین مقام سے نیچے گرا کر جانوروں کی سطح پر بلکہ بعض اوقات اس سے بھی نیچے لے آتے ہیں۔

سقراط کے ایک مشہور قول کا مفہوم ہے:

"نیکی علم ہے اور بدی جہل" (۲۸)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان کو کسی بھی معاملے میں صحیح علم حاصل ہو جاتا ہے تو وہ لازماً عمل کا روپ دھارتا ہے جو کہ نیکی کی شکل بنتی ہے۔ اسکے برعکس کسی بھی معاملے میں جہالت سے انسان کے اندر توہمات اور غلط تصورات پیدا ہوتے ہیں جن سے غلط عمل جنم لیتا ہے جو بدی کی شکل بنتی ہے۔ انسانی فکر کو سنوارنے اور بگاڑنے میں علم کا بہت بڑا عمل دخل ہے۔

علم اور اسلام

اسلام کا مقصد لوگوں کے اخلاق کی اصلاح کرنا ہے تاکہ وہ دنیا و آخرت کی سعادتیں حاصل کر سکیں۔ سطور بالا میں بتایا جا چکا کہ اصلاحِ اخلاق میں علم کا بہت اہم کردار ہے۔ چنانچہ اسلام نے علم کے حصول پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور اس کو اتنی اہمیت دی ہے جتنی دنیا کے کسی اور مذہب اور تہذیب میں نہیں دی گئی۔ قرآن مجید کی پہلی وحی کا آغاز ہی حصولِ علم کی تلقین سے ہو رہا ہے:

---

(۲۸) قرآن اور تعمیرِ سیرت، ص ۱۲۲

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ (۲۹)

"اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے سب کو پیدا کیا"

قرآن مجید نے جابجا علم کی اہمیت پر زور دیا ہے ایک جگہ فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُو الْاَلْبَابِ﴾ (۳۰)

"کہہ دو کیا علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں، سمجھتے وہی ہیں جو عقل والے ہیں"

یہاں استفہامِ انکاری کے انداز میں بتایا جارہا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ علم والے اور جاھل لوگ برابر ہو جائیں۔ تمام دانائی اور حکمت کی بنیاد خدا کا خوف اور اُس کی حیثیت ہے جس کے لیے قرآن مجید میں تقوٰی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہی وہ وصف ہ جو انسان کو گناہوں سے بچاتا اور اُسے نیکیوں کی طرف راغب کرتا ہے۔ قرآن مجید نے اس خوبی کا سرچشمہ بھی علم کو بتایا ہے؛

﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (۳۱)

"بے شک اللہ سے اس کے بندوں میں سے عالم ہی ڈرتے ہیں "

حضور علیہ السلام نے بھی حصولِ علم کی بہت زیادہ تلقین فرمائی:

(طلب العلم فريضة على كل مسلم ومسلمة) (۳۲)

"علم کی طلب کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔"

(اطلبوا العلم من المهد إلى اللحد) (۳۳)

---

(۲۹) العلق ۹۶:۱

(۳۰) الزمر ۳۹:۹

(۳۱) فاطر ۳۵:۲۸

(۳۲) ابن ماجہ السنن، رقم:۲۲۴، ۱/۸۱

(۳۳) حاجی خلیفہ، مصطفٰی بن عبداللہ الحنفی، کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ، ۱/۵۱

"گہوارے سے قبر تک علم حاصل کرتے رہو"

(اطلبوا العلم و لو بالصين)[٣٤]

"علم حاصل کرو اگرچہ تمہیں چین جانا پڑے۔"

مندرجہ بالا ارشادات سے واضح ہوتا ہے کہ علم کی تلاش اور جستجو میں رہنا ایک ایسا اعظیم الشان عمل ہے جسے عمر کے کسی بھی حصے میں اور کسی بھی حال میں ترک نہیں کیا جانا چاہئے۔ اس نکتے پر اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ ساری دنیا کو علم سکھانے والی ذاتِ مبارکہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآنِ مجید یں اپنے علم میں اضافہ کے لیے دعا کی تلقین کی جارہی ہے:

﴿وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا﴾ [٣٥]

"اور کہہ اے میرے رب مجھے اور زیادہ علم دے"

قرآنِ مجید کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ قرآنِ مجید کے نزدیک یہ علم سے بڑی فضیلت کوئی نہیں ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لیے یہاں چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔

ا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے جب حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور اُن کو منصبِ خلافت پر فائز کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تو اُنہوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا۔ اُن کا سوال تخلیق انسانی پر نہیں بلکہ بطورِ خاص منصبِ خلافت دیے جانے پر تھا جو فضیلت اور برتری انسان کو دی جارہی تھی اُس پر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مختصر جواب دے کر اُنہیں خاموش کرادیا۔ پھر قرآنِ مجید کے بقول:

﴿ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ [٣٦]

"اور اللہ نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھائے پھر ان سب چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا پھر فرمایا مجھے ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو"

---

[٣٤] بزار، ابو بکر احمد بن عمرو بن عبد الخالق بصری، المسند، موسسۃ علوم القرآن، بیروت، ۱۴۰۹ھ، رقم: ۹۵،۱/۱۷۵

[٣٥] طٰہٰ ۲۰: ۱۱۴

[٣٦] البقرہ ۲: ۳۱

حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء کے نام سکھائے گویا صرف علم نہیں دیا بلکہ جامع علم (Comprehensive knowledge) دیا۔ علم پر حاوی کیا۔ پھر جب فرشتوں کے سامنے پیش کیا تو اُنہیں اپنی لاعلمی کا احساس ہوا اور جب اُنہوں نے اس علمی فضیلت کا نظارہ کر لیا تو تب اُنہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہاں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو دیگر مخلوقات پر اور خود ایک انسان کو دوسرے انسانوں پر جو فضیلت علم کے ذریعے میسر آتی ہے وہ کسی اور ذریعہ سے نہیں مل سکتی۔ اگر علم کے علاوہ کوئی اور قدر زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی تو اُس کا مظاہرہ کرایا جاتا۔ لہٰذا جو تفوق اور برتری علم کی بدولت نصیب ہوئی ہے وہ کسی اور خوبی سے نہیں مل سکتی۔ بے شک مال و دولت اور عہدہ و منصب سے بھی عزت و تکریم حاصل ہوتی ہے۔ لیکن مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ اگر ایک شخص صحیح معنوں میں عالم ہو تو بڑے بڑے مالدار، پہلوان اور بادشاہ بھی اُس کے سامنے سر جھکائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

۲۔ حضرت سلمان علیہ السلام کا دربار لگا ہوہے اور آپ نے بلقیس کے آنے سے پہلے اُس کا تخت اپنے پاس منگوانا چاہا۔ اس سلسلے میں جو مکالمہ ہوا اُسے قرآن نے یوں بیان کیا ہے:

﴿قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِه قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَه عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ اَنَا اٰتِيْكَ بِه قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَه قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ﴾ [۳۷]

"اس شخص نے کہا جس کے پاس کتاب کا علم تھا کہ میں اسے تیری آنکھ جھپکنے سے پہلے لا دیتا ہوں، پھر جب اسے اپنے روبرور کھا دیکھا تو کہنے لگا یہ میرے رب کا ایک فضل ہے"

پہلی آفر طاقتور جن کی طرف سے آتی ہے جسے ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ پھر ایک علم والا اُٹھتا ہے اور وہ پلک جھپکنے سے پہلے تخت لانے ک پیشکش کرتا ہے۔ اب موازنہ طاقت اور علم کا ہو رہا ہے۔ پھر دیے گئے وقت میں تخت کا آجانا ظاہر کر رہا ہے کہ علم کی طاقت جنات کی طاقتوں سے بڑھ کر ہے۔ یہاں سے علم کی برکت اور تاثیر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پھر جب پوچھا جاتا ہے کہ تخت کیسے آیا؟ تو وہ اُسے اللہ کا فضل قرار دیتے ہوئے اپنے حوالے سے ہر کمال کی نفی کر دیتا ہے اور اُسے اللہ کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ یہاں سے حقیقی علم کا ایک پیمانہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ جہاں حقیقی علم ہوتا ہے تو وہاں تواضع عاجزی اور انکساری جیسے اوصاف آتے ہیں۔ اس کے برعکس جہاں تکبر، انانیت اور گھمنڈ کی سوچ ہو تو وہاں

---

[۳۷] النمل ۲۷ : ۳۹-۴۰

صحیح معنوں میں علم نہیں ہوتا۔ بہر حال اس واقعہ سے واضح ہو رہا ہے کہ طاقت اور علم میں مقابلہ ہو تو تفوق اور برتری علم کو حاصل ہوتی ہے۔

۳۔ ایک موقع پر بنی اسرائیل اپنے وقت کے نبی سے التجا کرتے ہیں کہ ہمارے لیے کوئی امیر مقرر کریں تاکہ ہم اُس کی قیادت میں جہاد کر کے دشمن سے اپنے مقبوضہ علاقے واپس لیں تو نبی کی طرف سے طالوت نام کے شخص کو اُن کا امیر مقرر کر دیا جاتا ہے۔ جب اُن کے انتخاب پر اس بنا پر اعتراض ہوتا ہے کہ وہ تو بہت زیادہ مال و دولت کا حامل نہیں ہے تو اُن کو جواب دیا جاتا ہے:

﴿قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَه مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ (۳۸)

"پیغمبر نے کہا بے شک اللہ نے اسے تم پر پسند فرمایا ہے اور اسے علم اور جسم میں زیادہ فراخی دی ہے، اور اللہ اپنا ملک جسے چاہے دیتا ہے، اور اللہ کشائش والا جاننے والا ہے"

یہاں مال و دولت کے مقابلے میں جن دو فضیلتوں کو لایا جارہا ہے اُن میں سے ایک علمی پختگی ہے اور دوسری جسمانی طاقت۔ مگر اُن میں بھی پہلے فضیلت علمی کا ذکر کر کے اُسے موخر الذکر کے مقابلے میں اولیت دی جارہی ہے۔

۴۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے وقت کے جلیل القدر رسول ہو کر حصول علم کے لیے ایک ایسے شخص (حضرت خضر علیہ السلام) کے پاس جاتے ہیں جن کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل ہے کہ وہ نبی تھے یا ولی۔ اُن کے پاس جا کر ان الفاظ میں التجا کرتے ہیں:

﴿قَالَ لَه مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا﴾ (۳۹)

"اسے موسیٰ نے کہا کیا میں تیرے ساتھ رہوں اس شرط پر کہ تو مجھے سکھائے اس میں سے جو تجھے ہدایت کا طریقہ سکھایا گیا ہے"

اور قرآن مجید خود اُن کی علمی فضیلت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

﴿فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ (۴۰)

---

(۳۸) البقرہ ۲:۲۴۷

(۳۹) الکہف ۱۸:۶۶

"پھر ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ کو پایا جسے ہم نے اپنے ہاں سے رحمت دی تھی اور اسے ہم نے اپنے پاس سے ایک علم سکھایا تھا"

۵۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کو قرآن مجید نے احسن القصص قرار دیا ہے۔ اس واقعہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات تفصیلاً بیان کیے گئے ہیں کہ وہ کن کن نشیب و فراز اور مصائب و آلام سے گزرے بالاخر تمام مراحل سے گزر کر وہ مصر کے بادشاہ بن گئے۔ ان تمام مراحل اور آزمائشوں کو سر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو طاقت عطا کی وہ یہی علم کی تھی:

﴿وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ﴾ (۴۱)

"اور اسی طرح تیرا رب تجھے برگزیدہ کرے گا اور تجھے خواب کی تعبیر سکھائے گا:

علم اس نوعیت کا عطا فرما رکھا تھا کہ جو بات سنتے اُس کی تہہ تک پہنچ کر اصل حقیقت کو پا لیتے۔ اور جب اُنہوں نے بادشاہِ مصر سے وزارتِ خزانہ کی عملداری (Supervision) طلب کی تو اُس منصب کے حوالے سے اپنی جو دو خوبیاں بیان کیں اُن میں ایک علم تھا:

﴿قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ﴾ (۴۲)

"کہا مجھے ملکی خزانوں پر مامور کر دو، بے شک میں خوب حفاظت کرنے والا جاننے والا ہوں"

۶۔ ابنیائے کرام تمام مخلوقات میں سے اللہ تعالیٰ کے منتخب افراد ہوتے ہیں۔ اُن کے حوالے سے قرآنِ مجید نے جو بات تواتر سے کہی ہے وہ یہ ہے کہ ہر نبی کو علم و حکمت عطا کیے گئے۔ دیگر فضائل میں مختلف ابنیائے کرام کی اپنی اپنی انفرادیت رہی ہے لیکن فضیلت علمی وہ اہم ترین خوبی ہے جو تمام انبیاء کرام کا مشترکہ اثاثہ رہی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بعض پیغمبروں کو مخصوص شعبوں کا علم بھی عطا فرمایا اور عمومی علم میں سے ہر ایک کو حصہ وافر عطا فرمایا۔ پھر جب حضور علیہ السلام کی باری آئی تو فضیلتِ علمی کو منتہائے کمال پر پہنچاتے ہوئے فرمایا:

﴿وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ (۴۳)

---

(۴۰) الکہف ۶۵:۱۸

(۴۱) یوسف ۶:۱۲

(۴۲) یوسف ۵۵:۱۲

"اور تجھے وہ باتیں سکھائی ہیں جو تو نہ جانتا تھا، اور اللہ کا تجھ پر بہت بڑا فضل ہے"

گویا آپؐ کی ذاتِ مبارکہ کو کسی خاص شعبے کا یا محدود علم عطا نہیں فرمایا بلکہ علم کے ہر شعبے میں کمال عطا فرمایا۔
اس بحث کو حضور علیہ السلام کے اُس فرمان پر ختم کرنا مناسب دکھائی دے رہا ہے جس میں آپؐ نے علماء کو انبیاء کرام کا ورثہ قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

(إن العلماء ورثة الأنبياء)(۴۴)

"بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں"

کون سا علم مراد ہے؟

علم کے حوالے سے آخری نکتہ جس کی وضاحت ضروری ہے یہ ہے کہ علم کی فضیلت کے ضمن میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے اس سے مراد کون سا علم ہے کیا محض قرآن و حدیث و فقہ وغیرہ کا علم مراد ہے یا سائنس ٹیکنالوجی اور دیگر دنیوی علوم بھی اس میں شامل ہیں؟ اس حوالے سے جاننا چاہئے کہ علم کی تقسیم در تقسیم کے نتیجے میں آج علم کی سینکڑوں شاخیں (Branches) معرضِ وجود میں آچکی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ ہر آنے والے دن میں علوم و فنون کے نئے نئے گوشے آشکار ہو رہے ہیں اور یوں علوم کی تعداد بڑھتی چلی جارہی ہے مگر اس سے قطع نظر اسلام علوم کو بنیادی طور صرف دو اقسام میں تقسیم کرتا ہے۔

۱۔ علمِ نافع ۲۔ علم غیر نافع

علم نافع (نفع دینے والا علم) سے مراد وہ علم ہے جو انسان کو فکری لغزشوں، گمراہیوں، توہم پرستیوں سے نکال کر حقیقت سے آشنا کر دے۔ اور غیر نافع (نفع نہ دینے والا علم) وہ ہے جو اُلٹا انسان کو شکوک و شبہات اور گمراہیوں کی دلدل میں ڈال کر حقیقت سے دور کر دے حضور علیہ السلام علمِ نافع کے حصول کے لیے دُعا کیا کرتے تھے:

(اللهم اني أسألك علما نافعا)(۴۵)

اور دوسری طرف علم غیر نافع سے پناہ مانگا کرتے تھے۔:

---

(۴۳)النساء۴:۱۱۳

(۴۴)ترمذی، السنن، رقم:۲۶۸۲، ۵/ ۴۸

(۴۵)نسائی، أحمد بن شعیب أبو عبدالرحمن، السنن الکبریٰ، دار الکتب العلمیة، بیروت، ۱۴۱۱ھ، رقم:۶، ۹۹۳۰/ ۳۱

(اللهم إنی أعوذبک من علم لا ينفع)[٤٦]

"اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتاہوں اُس علم سے جو نفع نہ دے"

اسلام جہاں بھی علم کی بات کرتا ہے اُس سے مراد یہی علم نافع ہی ہے جس میں قرآن وحدیث تو سرِ فہرست شامل ہیں تاہم سائنس و ٹیکنالوجی اور دیگر عصری علوم بھی درجہ بدرجہ شامل ہیں۔ اسلام کے نزدیک علمِ نافع وہ ہے جس کے ذریعے سے انسان اللہ تعالیٰ کی معرفت تک پہنچ جائے۔ زندگی کے اسرار ورموز سے آگاہ ہو جائے اور اُس علم کے مثبت اثرات خود اُس کی ذات اور کسی نہ کسی حد تک ماحول پر بھی دکھائی دیں۔ گویا اسلام کے نزدیک علم وہی ہے جو انسان کو خدا تک پہنچا دے، حقائق حیات سے آشنا کر دے زندگی کی راہوں کو روشن کر دے اور عمل کی جہتوں کو درست کر دے۔

جس علم میں مندرجہ ذیل میں سے کچھ بھی نہ ہو تو وہ محض معلومات کا انبار ہے جو زندگی کو بوجھل بنا دینے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔ ایسے علم کو غیر نافع قرار دے کر اس سے پناہ مانگی گئی ہے۔ پھر علم کا نفع بخش نہ ہونا دو جہتوں سے ہو سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ علم نظریاتی طور پر غلط ہو اور اُس کے نتیجے میں انسان فکری گمراہیوں کا شکار ہو جائے جن کا لازمی نتیجہ عملی گمراہیوں کی شکل میں نکلے گا کیونکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ "عمل تابع حال کے ہوتا ہے اور حال تبع علم ویقین کے"

علم کے غیر نفع بخش ہونے کی دوسری جہت یہ ہے کہ علم بذاتِ خود تو صحیح ہو لیکن وہ عمل کا روپ نہ دھار سکے۔

اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان کا علم نظری اعتبار سے بھی صحیح ہونا چاہیے۔اور اُسے انسانی شخصیت میں اس طرح رچ بس جانا چاہیے کہ انسان اُس کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہو جائے اور یہی وہ علم ہے جو اخلاقی انحطاط سے نجات میں بہت موثر کردار ادا کر سکتا ہے۔

۳۔ ذکر

ایمان اور علم کے بعد تیسری چیز جو برائی سے بچانے اور نیکی کی طرف راغب کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے وہ ذکر ہے۔ ذکر دین کی ایک وسیع اصطلاح ہے جس کے لغوی معنی یاد کرنا، نصیحت اور یاد دھانی وغیرہ کے ہیں تاہم اس کے مفہوم میں اس قدر وسعت پائی جاتی ہے کہ قرآنِ مجید کے بقول خود قرآن بھی ذکر ہے، رسول بھی ذکر ہے اور نماز

[٤٦] ابن ماجہ، السنن، رقم:۲۵۰، ۱/ ۹۲

بھی ذکر ہی کی ایک صورت ہے۔ مگر عام طور پر جب ذکر کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد اللہ کو یاد کرنا ہوتا ہے خواہ زبان سے ہو یا دل ودماغ سے۔

ذکر اور عبادات

اسلام کی فہرستِ عبادات میں ذکر کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے بلکہ اسے دیگر عبادات کی روح بھی کہا جا سکتا ہے۔ دیگر عبادات کی بجا آوری کا حکم دیتے ہوئے ذکر کی تاکید بھی اکثر وبیشتر جگہوں پر کی گئی ہے۔ بطورِ نمونہ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

ا- نماز اور ذکر

﴿وَاَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِیْ﴾ (۴۷)

"اور میری ہی یاد کے لیے نماز پڑھا کر"

﴿وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّه فَصَلّٰى﴾ (۴۸)

"اور اپنے رب کا نام یاد کیا پھر نماز پڑھی"

﴿فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ﴾ (۴۹)

"پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہونے کی حالت میں یاد کرو"

۲ - حج اور ذکر

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِىْ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ﴾ (۵۰)

"اور اللہ کو چند گنتی کے دنوں میں یاد کرو"

---

(۴۷) طٰہٰ۲۰:۱۴

(۴۸) الاعلیٰ۸۷:۱۵

(۴۹) النساء۴:۱۰۳

(۵۰) البقرۃ۲:۲۰۳

﴿لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ﴾ [۵۱]

"تاکہ اپنے فائدوں کے لیے آموجود ہوں اور تاکہ جو چارپائے اللہ نے انہیں دیے ہیں ان پر مقررہ دنوں میں اللہ کا نام یاد (قربانی) کریں"

﴿ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا﴾ [۵۲]

"پھر جب حج کے ارکان ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو جیسے تم اپنے باپ دادا کو یاد کیا کرتے تھے یا اس سے بھی بڑھ کر یاد کرنا"

۳ - جہاد اور ذکر

﴿يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ [۵۳]

"اے ایمان والو! جب کسی فوج سے ملو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم نجات پاؤ"

۴ - دعوتِ دین اور ذکر

﴿اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ﴾ [۵۴]

"تو اور تیرا بھائی میری نشانیاں لے کر جاؤ اور میری یاد میں کوتاہی نہ کرو"

درج بالا آیات سے واضح ہو رہا ہے کہ ہر عمل کے ساتھ اللہ کی یاد کا حکم دیا گیا ہے۔ گویا شریعت کے جتنے اعمال ہیں اُن کا مرکز و محور اللہ کی یاد ہے۔ علاوہ ازیں بعض احادیث میں ذکر کو تمام اعمال سے افضل قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً جب حضرت عبد اللہ بن یسر نے حضور علیہ السلام سے سوال یا کہ کون سا عمل بہتر ہے تو آپؐ نے فرمایا:

---

[۵۱] الحج ۲۲:۲۸

[۵۲] البقرہ ۲:۲۰۰

[۵۳] الانفال ۸:۴۵

[۵۴] طٰہٰ ۲۰:۴۲

(أن تفارق الدنيا ولسانك رطب من ذكر الله عز وجل)(٥٥)

"تو دنیا اس حال میں چھوڑے کہ تیری زبان اللہ کے ذکر سے تر ہو"

حضرت ابو سعید خدریؓ کے بقول حضور علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ قیامت کے دن کس بندے کا درجہ اللہ کے ہاں بہت بلند ہو گا تو آپؐ نے فرمایا:

الذاكرون الله كثيرا والذاكرات.(٥٦)

"اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور عورتیں"

یوں تو ذکر ہر عبادت کا حصہ ہے تاہم عمومی ذکر اور دیگر عبادات میں ایک اہم فرق یہ ہے کہ دیگر عبادات میں بالعموم وقت، جگہ، ہیئت وغیرہ میں سے کوئی نہ کوئی پابندی ملحوظِ خاطر رکھنا ہوتی ہے جب کہ ذکر کے سلسلے میں اس طرح کی کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی بلکہ اسے کھلا چھوڑ دیا گیا کہ اللہ کے بندے اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے اور کھاتے پیتے ہر حال میں جب اور جیسے چاہیں اللہ کا ذکر کرتے رہیں تاکہ انسان کو اللہ کی ذات اور اُس کی عظمت و رفعت کا استحضار اور اُس کے مقابلے میں اپنی حیثیت بھی یاد رہے کہ وہ کیا ہے اور اُس کی ذمہ داری کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ بھولنا انسان کی فطرت میں شامل ہے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ لفظ انسان کا مادہ ہی نسیان ہے۔ گویا انسان بھولنے والے فعل سے بچ نہیں سکتا۔ لیکن اگر وہ یہ بھی بھول جائے کہ اللہ اُس کا خالق و مالک اور اُس آقا ہے اور اُس کے مقابلے میں وہ اُس کا حقیر اور ذلیل بندہ ہے تو اُس کی دنیا و آخرت دونوں ہی برباد ہو جائیں گی اس لیے ذکر کرتے رہنے کا حکم دیا گیا۔

علم اور ذکر میں مناسبت

علم اور ذکر میں اللہ تعالیٰ نے ایک مناسبت رکھی ہے۔ جس کی وضاحت چند نکات کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔

علم و ذکر کی وجہ سے شقاوت سے حفاظت

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جو لوگ اللہ کے ذکر کی خاطر اکٹھے ہوتے ہیں تو اُن پر اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ فرشتے اُترتے ہیں اور اُن پر سکینہ نازل ہوتی ہے نیز اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرما دیتے ہیں۔ فرشتے کہتے ہیں کہ یا اللہ! فلاں بندہ تو ذکر کے لیے نہیں آیا تھا وہ تو محض گزرتے ہوئے وہاں ٹھہر گیا تو اللہ تعالیٰ جواب دیتے ہیں:

---

(٥٥) ابن جعد، علي بن الجعد بن عبيد أبو الحسن، مسند ابن الجعد، مؤسسة نادر، بيروت، ١٤١٠ھ / ١٩٩٠ء، رقم: ١، ٣٤٣١ / ٤٩٢،

(٥٦) ترمذی، السنن، رقم: ٣٣٧٦، ٥ / ٤٥٨

(هم الجلساء لا يشقي بهم جليسهم)[٥٧]

"وہ ایسے لوگ ہیں جن کے پاس بیٹھنے والا بدبخت نہیں رہ سکتا"

جو کچھ یہاں اہلِ ذکر کے حوالے سے کہا گیا ہے ہو بہو یہی الفاظ ایک دوسری حدیث میں اہل علم کے حوالے سے بھی کہے گئے ہیں کہ اُن کے پاس بیٹھنے والا بدبخت نہیں ہو سکتا۔ تو جو خوشخبری ذکر کی مجلس کے لیے ہے وہی خوشخبری علم کی مجلس کے لیے بھی ہے۔

ذکر اور اصلاحِ قلب

انسان کی شخصیت میں دل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جسے جسم کی سلطنت کا بادشاہ کہا جا سکتا ہے۔ تمام اعضاء وجوارح دل کے تابع ہیں۔ جتنی بھی حرکات وسکنات اور اعمال و افعال انسان سے سرزد ہوتے ہیں وہ سب دل کی اندرونی حالت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ جیسا دل کا حال ہو گا ویسے ہی اعمال و افعال ہوں گے۔ حضور علیہ السلام نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

(الآ إن فى الجسد لمضغة إذا صلحت صلح الجسد كله وإذا فسدت فسد الجسد كله ألا وهي القلب)[٥٨]

"آگاہ ہو جاؤ، انسانی جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ جب یہ سنور جائے تو پورا جسم سنور جاتا ہے اور جب یہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے۔ جان لو کہ یہ دل ہے"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان بیرونی دنیا میں جو کچھ بھی ہے وہ اندرونی دنیا کا عکس ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر انسان کے ظاہری اخلاق کو درست کرنا ہے تو اُسکے لیے اُس کی قلبی حالت کو درست کرنا ہو گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دل کو سنوارنے میں علم کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے لیکن اُس سے بڑھ کر کردار ذکر کا ہے۔ دل کی بیماریوں کی دوا ذکر ہے:

(إن هذه القلوب تصدأ كما يصدأ الحديد قيل يا رسول الله فما جلاؤها قال ذكر الموت وتلاوة القرآن)[٥٩]

---

[٥٧] بخاری، الصحیح، رقم:٦٠٤٥،٥ / ٢٣٥٣

[٥٨] ملا علی قاری، نورالدین بن سلطان محمد ہروی حنفی، مرقاۃ المفاتیح۔ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ١٤٢٢ھ، ٩ / ٧٥

[٥٩] شھاب، محمد بن سلامۃ بن جعفر أبو عبداللہ القضاعي، مسند الشھاب، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ١٤٠٧ھ، رقم:١١٧٨،٢ / ١٩٨

"بے شک دلوں کو بھی اُسی طرح زنگ لگ جاتا ہے جیسے لوہے کو زنگ لگ جاتا ہے۔ پوچھا گیا کہ اس کی صفائی کا ذریعہ کیا ہے؟ فرمایا موت کو یاد رکھنا اور قرآن کی تلاوت"

یہاں بتایا جارہا ہے کہ مختلف عوامل کی بنا پر دل زنگ آلودہ ہو جاتا ہے اُس میں میل کچیل اور گدلا پن آجاتا ہے جس کی بنا پر صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کی صلاحیت متاثر ہو جاتی ہے دل کے اس زنگ کو دور کر کے اسے اپنی فطری حالت میں لانے کیلئے مجرب نسخہ اللہ کا ذکر ہے۔ ایک اور مقام پر حضور ﷺ نے فرمایا:

(إن لكل شيء صقالة وصقاله القلب ذكر الله تعالى)[٦٠]

"بے شک ہر چیز کے لیے ایک ریگ مار (صفائی کا ذریعہ) ہوتا ہے اور دل کا ریگ مار اللہ کا ذکر ہے"

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ انسان کتنی ہی احتیاط کرلے پھر بھی کچھ نہ کچھ ایسے معاملات ہوتے ہیں جن کی بنا پر دل نے کسی نہ کسی درجے میں زنگ آلودہ ہو جانا ہوتا ہے لہٰذا ذکر کے ذریعے آئینہ دل پر بڑی ہوئی گردو غبار کو ساتھ ہی ساتھ صاف کرنے کا اہتمام کیا جانا بہت ضروری ہے۔ دل بیمار ہو یا صحت مند دونوں صورتوں میں ذکر ضروری ہے۔ فرق یہ ہے کہ جب دل روحانی بیماریوں کا شکار اور زنگ آلودہ ہوتا ہے تو ذکر کی حیثیت دوا کی ہوتی ہے۔ جس کے ذریعے دل کی صفائی ہوتی ہے۔ پھر جب مسلسل اور متواتر محنت سے دل صاف ہو جاتا ہے تو یہی ذکر دل کی غذا بن جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ روز بروز اللہ تعالیٰ کی محبت اور قرب کی کیفیات میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ گویا ابتداء میں ذکر ایک تلخ دوائی کی طرح ہوتا ہے جس کی طرف طبیعت راغب نہیں ہوتی، لیکن اگر طبعیت پر جبر کر کے کسی قاعدے اور ضابطے کے تحت ذکر کی پابندی کی جائے تو رفتہ رفتہ یہی ذکر ایک صحت مند نشے کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس سے طبعیت کو تسکین ملتی ہے۔

کثرتِ ذکر کی حکمت:

ذکر کے حوالے سے ایک اہم بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو فقط ذکر کا حکم نہیں دیا بلکہ کثرتِ ذکر کا حکم دیا ہے:

﴿يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا﴾ [٦١]

---

[٦٠] كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال، الباب الأول في الذكر وفضيلته، رقم:١٧٧٧، ١/ ٢١٤

[٦١] الاحزاب ٣٣:٤١

"اے ایمان والو اللہ کو بہت یاد کرو اور اس کی صبح وشام پاکی بیان کرو"

﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ﴾[٦٢]

"اور اپنے رب کو بہت یاد کر اور شام اور صبح تسبیح کر"

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ [٦٣]

"اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ"

پھر اس کثرت ذکر سے کیا مراد ہے؟ اس کی مقدار کتنی ہونی چاہیے؟ اس کی طرف اشارہ بعض دوسرے مقامات پر ملتا ہے:

﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ﴾ [٦٤]

"اور اپنے رب کو یاد کرلے جب بھول جائے"

﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ [٦٥]

"وہ جو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے یاد کرتے ہیں"

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ [٦٦]

"ایسے آدمی جنہیں سوداگری اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی"

[٦٢] آل عمران ٣:٤١

[٦٣] الجمعہ ٦٢:١٠

[٦٤] الکہف ١٨:٢٤

[٦٥] آل عمران ٣:١٩١

[٦٦] النور ٢٤:٣٧

اِن آیات سے آشکار ہو رہا ہے کہ ایک بندہ مومن کو ہر وقت اور ہر حال میں کسی نہ کسی رنگ میں ذکر میں مشغول رہنا چاہیے۔ احادیثِ مبارکہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ دنیوی زندگی کے اُمور کو سرانجام دیتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ اللہ کی یاد میں اپنے آپ کو مشغول رکھنا ایک پسندیدہ اور مطلوب کام ہے:

(كان النبي ﷺ يذكر الله تعالى على كل أحيانه) (٦٧)

"نبی ﷺ ہر وقت ذکرِ الٰہی کی کیفیت میں رہتے تھے"

(إن شرائع الاسلام قد كثرت علينا فمرنا بأمر جامع قال لا يزال لسانك رطبا من ذكر الله) (٦٨)

"بے شک اسلام میں بہت سی باتیں ہیں ہمیں کوئی ایک بات ایسی بتائیں جو سب کی جامع ہو، حضور ﷺ نے فرمایا !تیری زبان ہر وقت اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہیے"

(سبق المفردون قالوا وما المفردون يا رسول الله قال الذاكرون الله كثيرا والذاكرات) (٦٩)

"مفردون سبقت لے گئے۔ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ مفردون کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور عورتیں"

کثرت ذکر کے حکم میں راز یہ ہے کہ انسان کے دو بڑے دشمن نفس اور سیطان ہیں جو ہر وقت خواطر و وساوس کے ذریعے انسان کی فکر کو پراگندہ کرتے رہتے ہیں۔ ذکر کے ذریعے نفس کا بھی تزکیہ ہوتا ہے اور شیطان کے حملوں کے مقابلے میں بھی یہ ایک زبردست ہتھیار ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طَآئِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾ (٧٠)

---

(٦٧) نووی، أبوزكريا يحيى بن شرف بن مري، شرح صحيح مسلم، ار إحياء التراث العربي، بيروت، ١٣٩٢ھ. ٤/ ٦٨

(٦٨) مقدسی، أبو عبد الله محمد بن عبد الواحد بن أحمد الحنبلي، الأحاديث المختارة، مكتبة النهضة الحديثة، مكة المكرمة، ١٤١٠ھ (الطبعة الأولى)، رقم:٢٠،٩/ ٤٣

(٦٩) مسلم، ابن الحجاج أبو الحسين القشيري النيسابوري، صحيح مسلم، دار إحياء التراث العربي، بيروت، رقم:٢٦٧٦،٤/ ٢٠٦٢

(٧٠) الاعراف ٧:٢٠١

"بے شک جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں جب انہیں کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں پھر اچانک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں"

﴿اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَاَنْسَاهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ﴾ (۷۱)

"ان پر شیطان نے غلبہ پالیا ہے پس اس نے انہیں اللہ کا ذکر بھلا دیا ہے "

یہی بات ایک حدیث مبارکہ میں یوں فرمائی گئی ہے:

(الشيطان جاثم على قلب بن آدم فاذا سها وغفل وسوس وإذا ذكر الله خنس)(۷۲)

"شیطان انسان کے دل کے ساتھ چمٹا رہتا ہے۔ پس جب انسان اللہ کی یاد سے غافل ہوتا ہے تو وہ وسوسہ ڈالتا ہے اور جب بندہ اللہ کو یاد کرتا ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے"

ان نصوص سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیطان جو انسان کا ازلی دشمن ہے اُس کے حملوں سے بچاؤ کے لیے بندے کے پاس سب سے مؤثر ہتھیار ذکر ہی ہے۔ جونہی انسان اس سے غافل ہوتا ہے شیطان کو وار کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ چنانچہ شیطان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ انسان ذکر سے غافل رہے لہٰذا فکر کی پراگندگی کا علاج ذکر کی کثرت میں ہی ہے اور جب تک ذکر کثرت سے نہیں کیا جاتا نہ انسان کی فکر پاکیزہ ہو سکتی ہے اور نہ ہی دل کی بیماریوں سے مکمل شفایابی مل سکتی ہے۔ اسے ایک مثال کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک ڈاکٹر جب مریض کے لیے نسخہ تجویز کرتا ہے تو وہ دوا کی مقدار بھی بتاتا ہے اب اگر مریض اپنی مرضی سے مقدار میں بہت زیادہ کمی کر لے تو اُس کا صحت یاب ہونا بہت مشکل ہے۔ یہی معاملہ یہاں ہے یہ بات بھی ذہین میں رہنی چاہیے کہ ذکر صرف وہی نہیں جو زبان سے کیا جاتا ہے بلکہ دل اور سانس کے ذریعے بھی کیا جاتا ہے۔ نیز ہر وہ کام جو اللہ کی اطاعت میں بجالایا جائے تو وہ بھی ذکر میں ہی شمار کیا جاتا ہے۔

ذکر بطورِ معالجہ امراضِ نفس

اسلام میں تزکیہ نفس کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اسے نبوت کے بنیادی فرائض میں سے ایک اہم فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ تمام عبادات کا مقصد بھی تزکیہ نفس کا حصول ہے۔ تزکیہ نفس کا مطلب ہے نفس کا ہر قسم کی آلائشوں

---

(۷۱) المجادلہ ۱۹:۵۸

(۷۲) ابن ابی شیبہ، أبو بكر عبد الله بن محمد، الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار، كلام بن عباس رضي الله عنه، مكتبة الرشد، الرياض، ۱۴۰۹ھ (الطبعة الأولى)، رقم: ۷،۳۴۷۷۴ / ۱۳۵

، آلودگیوں اور معصیتوں سے پاک ہو کر اللہ کی بندگی اور اطاعت پر کاربند ہو جانا۔ دیکھنا یہ ہے کہ ذکر اس حوالے سے کیا کردار ادا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ بندگی اور اطاعت میں کوتاہی کی مندرجہ ذیل دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(ا) اعمالِ شریعت بجالانے میں کوتاہی اور کمی جیسے معصیت اور گناہ کہتے ہیں۔

(ب) اعمال کو کماحقہ یا اُن کی بہترین شکل میں انجام نہ دے پانا جسے عدمِ احسان کی حالت کہا جاتا ہے۔

اگر مذکورہ بالا دونوں حالتوں پر غور کیا جائے تو ان کا بڑا سبب ایک ہی دکھائی دیتا ہے اور وہ غفلت ہے۔ اگر ایک مسلمان کو ہر وقت یہ بات یاد رہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور اُسے اپنے آقا اور مالک کا ہر حکم ماننا ہے۔ نیز اُس کا آقا اُسے ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ نافرمانی کا نتیجہ سخت سزا ہے جس پر وہ آقا ہر وقت قادر ہے۔ تو اُس کی زمین میں رہتے ہوئے، اُس کے دیے ہوئے اعضاء کو استعمال کرتے ہوئے، اُس کے خوف سے لاپرواہ ہو کر وہ کیسے اُس کی حکم عدولی کر سکتا ہے؟ اسی طرح اگر ایک مسلمان کو یہ نکتہ بخوبی مستحضر رہے کہ اللہ کے جس حکم پر بھی وہ عمل کر رہا ہے، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے اور اس عمل کو بہترین طریقے سے انجام دینے کا نتیجہ اللہ کی رضا اور خوشنودی ہے تو وہ کیسے اس عمل کو غیر سنجیدگی اور لاپرواہی سے انجام دے سکتا ہے؟ اور ان اعلیٰ مراتب سے محرومی کا خدشہ کیسے گوارا کر سکتا ہے جن کا وہ بہت حریص ہے۔ گویا غفلت کا نتیجہ ہے معصیت اور غفلت ہی کا نتیجہ ہے مرتبہ احسان کا عدمِ حصول۔ غفلت کے اس مہلک مرض کا علاج کیا ہے۔؟ یاد کرنا اور یاد رکھنا۔ ہر وقت اللہ کے مقابلے میں اپنی حیثیت کو یاد رکھنا۔ اس یاد کرنے اور رکھنے کو عربی میں ذکر کہتے ہیں۔ گویا معصیت ترک کرنے کا نسخہ ہے ذکر اور حصولِ درجہ احسان کا ذریعہ بھی ذکر ہے۔ بالفاظِ دیگر اگر کوئی شخص اخلاقی امراض سے نجات پانا چاہتا ہے تو اُس کے لیے بھی کثرتِ ذکر ایک کارگر نسخہ ہے اور ایمان کے درجات میں ترقی کر کے مراتبِ عالیہ کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے بھی ذکرِ کثیر کی حکمتِ عملی اپنانا ہو گی۔

ذکر کی سائنسی توجیہ

کثرتِ ذکر کس طرح آدمی کو اخلاقِ رذیلہ سے نجات دلا کر اخلاقِ حسنہ کا خوگر بناتا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ جاننا ہو گا کہ ہماری ذات سے اعمال کس طرح صادر ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے ہمارے ذہین میں خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اُن خیالات کی پیدائش پر ہمارا کوئی کنٹرول نہیں۔ ایک لمحے میں سینکڑوں ہزاروں خیالات پیدا ہوتے ہیں اور قوت متخیلہ ایک سیکنڈ کے بھی بہت تھوڑے حصے میں لاکھوں میل کا فاصلہ طے کر لیتی ہے۔ انسانی خیالات و تصوارت (Imaginations) کی کوئی حد اور حساب نہیں ہے۔ ان کی حیثیت ایک سٹور کی طرح ہے جس میں مختلف چیزیں بھری ہوئی ہوں۔ خود قرآنِ مجید کے بقول انسان میں اچھے اور برے دونوں طرح کے میلانات رکھے گئے ہیں کچھ چیزیں

وہ غیر شعوری طور پر وراثت سے پاتا ہے۔ کچھ چیزیں ابتدائی عمر میں اُس کے والدین اور معاشرہ کی طرف سے منتقل ہوتی ہیں جب کہ اُس کی عقل میں پختگی نہیں ہوتی اور وہ یہ فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہوتا کہ چیزوں کی ماہیت کیا ہے اور اچھائی و برائی میں امتیاز کیسے کرنا ہے؟ پھر بالغ اور باشعور ہونے کے بعد بھی وہ بہت سی چیزیں اپنی مرضی سے کرتا، کہتا اور سوچتا ہے اور بہت سے معاملات اُس کی مرضی کے بغیر ہی اُس کے ساتھ پیش آتے رہتے ہیں مثلاً مختلف حادثات، سانحات تلخ و شیریں تجربات وغیرہ پھر ان سب سے متعلقہ خیالات ذہن کے کسی حصے میں منظم ہونا شروع ہوتے ہیں اور اُن کے مختلف اُسلوب اور سانچے بننا شروع ہوتے ہیں اور زندگی کے مختلف حقائق کے بارے میں ایک مرتب رائے بننے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ غرض طرح طرح کی سوچوں کے درمیان اور مختلف عوامل کے تحت انسان کی سوچ پختہ اور منظم ہو جاتی ہے اور کچھ عقائد کا روپ دھار لیتی ہے۔ پھر یہ عقائد یا پختہ سوچ نیت اور ارادے کو جنم دیتی ہے اور پھر اس ارادے میں عزم پیدا ہوتا ہے تو یہ اعضاء کو حرکت میں لاتا ہے اور یوں عمل وجود میں آتا ہے۔ اعمال کی تکرار عادات کو جنم دیتی ہے اور پھر اچھی یا بری جیسی بھی عادات پختہ ہو جاتی ہیں ویسی ہی شخصیت وجود میں آتی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سارے عمل میں ذکر کیا کردار ادا کر سکتا ہے۔ ذکر سے مراد ہے بعض تصورات کی مسلسل تکرار۔ اُوپر والی گفتگو کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے کہ ان تصوارت کی تکرار سے کیا نتیجہ نکلے گا۔ جو آدمی جس تصور کی تکرار زیادہ کرے گا وہ تصور پختہ ہو تا جائے گا اور اگر اُس کی تکرار جاری رہے گی تو وہ آہستہ آہستہ اُس کی نیت، ارادے اور عزم کے مرحلے کو طے کر کے عمل کی شکل اختیار کر لے گا اور پھر تکرار کے مزید جاری رہنے پر عمل کی پختگی عادات میں بدل جائے گی اور انسانی شخصیت انہی تصورات کے عین مطابق بن جائے گی جن کا تکرار تسلسل کے ساتھ جاری رہا۔ لیکن اس میں اہم شرط یہ ہے کہ جو بھی ذکر کیا جائے وہ پوری توجہ، انہاک اور یکسوئی سے کیا جائے۔ جس ذکر میں یہ چیزیں نہ ہوں اور دل و دماغ منتشر ہوں اس کے مطلوبہ نتائج ملنے بہت مشکل ہوتے ہیں۔

صحبت کا عمومی تصور

صحبت کا عمومی اور وسیع تصور یہ ہے کہ نیک اور اچھے لوگوں کے ساتھ میل جول رکھا جائے۔ دوست اچھے بنائے جائیں۔ بُرے لوگوں کی مصاحبت اور ہم نشینی سے سے گریز کیا جائے۔ اکابر صوفیاء میں سے بھی بعض نے صحبت کے اس وسیع تر مفہوم کو لیا ہے۔ مثلاً

حضرت علی ہجوری نے کشف المحجوب میں صحبت کو معاشرت کے وسیع تر معنوں میں لیا ہے اور چھوٹوں اور بڑوں کے آداب، سفر کے آداب وغیرہ کا ذکر کیا ہے: [۷۳]

---

[۷۳] ھجویری، حضرت علی، کشف المحجوب، مترجم: میاں طفیل محمد مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، بھارت، ۱۹۷۹ء ص ۳۳۶

امام قشیری نے بھی صحبت کو عمومی معنوں میں لیا ہے اور اس کے تین درجے بتائے ہیں۔ اپنے سے اُونچے درجے والے کی صحبت، اپنے سے کم درجے والے کی صحبت اور ہم پلہ لوگوں کی صحبت۔ (۷۴)

شہاب الدین سہروردی نے بھی صحبت کے وسیع تر معانی کو اختیار کیا ہے اور وہ صحبت کو عمومی ہم نشینی اور عام میل جول کے مفہوم میں لیتے ہیں۔ (۷۵)

صحبت کی اہمیت قرآن وحدیث کی روشنی میں

انسانی زندگی میں بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں لیکن انسان اُنہیں سرسری انداز میں لیتے ہوئے نظر انداز کرتا چلا جاتا ہے۔ اُن میں سے ایک صحبت ہے۔ انسانی شخصیت کو سنوارنے اور بگاڑنے میں صحبت کے اثرات مسلمہ ہیں اور ان کا ازکار ممکن نہیں۔ اچھی صحبت میں رہنے سے لامحالہ انسان کی شخصیت پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور بُری صحبت کے بُرے اثرات بھی یقینی ہیں۔ صحبت کے ان قطعی اثرات کی بنا پر قرآن و حدیث میں جابجا اچھی صحبت کو اپنانے اور بری صحبت سے اجتناب کرنے کی تلقین آئی ہے:

﴿يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ﴾ (۷۶)

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ رہو"

صحبت کے اثرات بذریعہ حواس خمسہ

یہ تو الفاظ کی طاقت تھی جو خیالات کو متاثر کرتی ہے اب اگلی بات یہ ہے کہ خیالات الفاظ کے بغیر بھی حواسوں کے ذریعے متاثر ہوتے ہیں مثلاً:

دیکھنے سے: ایک باپ بولے بغیر بھی اگر بیٹے کو اُس کی کسی غلط حرکت پر غضب ناک آنکھوں سے گھورے یا ایک محب محبوب کو پیار بھری نظروں سے دیکھے یا موسمِ بہار میں ایک شخص کسی خوبصورت باغ میں چلا جائے یا اُس کے سامنے اچانک شیر آجائے یا کوئی دشمن اُس پر سانپ پھینک دے تو ان سب صورتوں میں لفظ کے بغیر بھی خیالات متاثر ہو جائیں گے۔

---

(۷۴) القشیری، عبد الکریم بن ہوازن، رسالہ قشیریہ، مترجم: ڈاکٹر پیر محمد حسن ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۸۴ء، ص ۵۳

(۷۵) سہروردی، شہاب الدین، عوارف المعارف، مترجم: حافظ رشید احمد ارشد، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۲ء ص ۴۸۳

(۷۶) التوبہ ۹:۱۱۹

چھونے سے: ایک اُستاد اگر شاگرد کو غصے سے پکڑ کر جھنجھوڑے یا ایک نوجوان صنف مخالف کو جذبات سے چھوئے تو بھی فریق ثانی کے خیالات متاثر ہوتے ہیں۔

سننے سے: اگر کسی کے سامنے کوئی اچانک چیخنے لگے یا اُس کے سامنے راگ چھیڑ دیے جائیں یا آلات موسیقی بجنے سے سُر نکلنے لگیں تو آدمی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

سونگھنے سے: اگر ایک شخص کسی باغ یا پارک میں گلاب ویاسمین کی کیاریوں کے پاس جا بیٹھے یا کسی انتہائی بدبو دار جگہ سے اُسے گزرنا پڑے تو دونوں صورتوں میں اُس کے خیالات متاثر ہوں گے۔

چکھنے سے: کسی شخص کو خوش ذائقہ اور خوشبودار مشروب پینے کو دیا جائے یا کڑوی کسیلی دوا پینے کو دی جائے تو دونوں صورتوں میں وہ اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اُوپر بیان کردہ پانچوں اقسام کی مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کے خیالات الفاظ کے استعمال کیے بغیر محض حواس خمسہ سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ گویا الفاظ اور زبان ہی اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ ہمارے ہاتھ بھی بولتے ہیں (نابیناؤں کے لیے چھو کر بڑھنے کا طریقہ بریل اب دنیا بھر میں مروج ہے) اور ہماری آنکھیں بھی بولتی ہیں۔ نظر لگنا ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ بھی ہے اور صحیح احادیث سے بھی ثابت ہے۔

(العين حق)[٧٧]

"نظر (بد) لگنا حق ہے"

اسی طرح ہمارا مشاہدہ ہے کہ نظر بد زنا کا پیش خیمہ ہے اور آخرت میں تو ہمارے اکثر اعضاء بولیں گے:

﴿يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [٧٨]

"جس دن ان پر ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ پاؤں گواہی دیں گے جو کچھ وہ کیا کرتے تھے"

اس سے اگلی بات یہ ہے کہ الفاظ اور حواس کے بغیر بھی ایک انسان کے خیالات کی قوت دوسرے انسان کے خیالات کو متاثر کرتی ہے۔ اور یہ کوئی تصوراتی یا جادوئی بات نہیں بلکہ ہمارے مشاہدے اور تجربے کی بات بھی ہے اور سائنسی اکتشافات بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ آج کی میڈیکل سائنس یہ کہتی ہے کہ ہمارے بے شمار جسمانی امراض کا

---

[٧٧] بخاری، کتاب الطب، باب العین حق، رقم:۵۴۰۸، ۵/ ۲۱۶۷

[٧٨] النور۲۴:۲۴

سبب ہمارے ذہنی رویے ہیں۔اور نامور مسلم طبیب ابن سینا کے نزدیک طبیب کے تصورات وخیالات مریض کے علاج اور شفایابی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔(۷۹)

اور یہ بھی ہمارا روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ حواس خمسہ کے استعمال کے بغیر بھی اگر دو افراد کے درمیان مزاج و خیالات میں ہم آہنگی ہو یا خیالات میں شدت ہو تو خیالات دوسرے شخص تک پہنچ جاتے ہیں کیونکہ خیالات لہروں کی صورت میں سفر کرتے ہیں اور موجودہ سائنس نے ثابت کر دیاہے کہ فضاء میں ہر وقت ایتھر موجود ہوتا ہے ۔ لہٰذا خیالات کی لہریں ایتھر پر سوار ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتی ہیں۔خود ہمارے کان اور آنکھ اسی طرح کام کرتے ہیں کہ آواز کی سمعی لہریں یا آنکھوں کی بصری لہریں سفر کر کے ہمارے کان یا آنکھ تک پہنچ جاتی ہیں اور کان اور آنکھ دونوں میں ایسے پیغام وصول کرنے والے آلے(Receiving Sets)موجود ہیں جو انہیں وصول کر لیتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی بھی اسی اُصول پر کام کرتے ہیں جو آج اکثر و بیشتر ہر آدمی کے زیرِ مشاہدہ ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ریڈیو،ٹی وی کے لیے سمعی وبصری لہروں کو طاقت سے فضاء میں منتشر کر دیا جاتا ہے جہاں سے وہ ایتھر کے گھوڑے پر سوار ہو کر ہر جگہ پہنچ جاتی ہیں۔ اب جس شخص کے گھر میں ان سمعی یا بصری لہروں کو وصول کرنے کا آلہ ہو وہ ان لہروں کو سن یا دیکھ سکتا ہے۔ ایکسرے اور الٹراساؤند کی لہریں بھی اسی اُصول پر کام کرتی ہیں۔

اسی طرح اگر خیالات کی لہروں کو قوت سے پھیلایا جائے اور دوسری طرف ایسا شخص موجود ہو جو اُنہیں وصول کرنے کا مشتاق ہو یا اُس کے خیالات سے اس کی ہم آہنگی ہو تو وہ انہیں وصول کر سکتا ہے۔ اس طرح کا ابلاغ بھی ہماری روز مرہ کی زندگی میں موجود نظر آتا ہے۔ مثلاً بیٹا اگر شدید زخمی ہو جائے یا مر جائے تو ماں بغیر کسی اطلاع کے بھی بے چین ہو جاتی ہے اور یہ بھی ہمارے روز مرہ تجربے کی بات ہے کہ ہم جس کو چاہیں تصور میں اپنے پاس بلا سکتے ہیں اور جس کو چاہیں تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں ہمارے شعراء نے بھی ان کیفیتوں کو بیان کیاہے ۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (۸۰)

اور

دل کے آیئنے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

---

(79) Fazal-al-Rehman, Dr. , Avicenna's Psychology, oxford university press, London, 1952, P-480

(۸۰)مومن، مومن خاں، کلیات مومن، مجلس ترقی ادب،لاہور،۲۰۰۸ء، ص ۸۳

یہ بات جو کہی جارہی ہے کہ انسانی اعمال و افعال خیالات کی پیداوار ہوتے ہیں اور خیالات اکثر و بیشتر حواسِ خمسہ کے ذریعے وصول ہونے والی ان دیکھی لہروں کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں اور انہی کے ذریعے انہیں ارادی طور پر متاثر کیا جاسکتا ہے، کوئی قصہ کہانی یا محض فلسفیانہ بات نہیں بلکہ یہ وہ بات ہے جسے آج کی میڈیکل سائنس اور نیورو فیزیالوجی ثابت کرتی ہے۔ قرآن وحدیث کی نصوص اور دیگر مذکورہ بالا تصریحات سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ شخصیت کی تعمیر و تخریب میں صحبت بھی انتہائی موثر عامل کی حیثیت رکھتی ہے جسے کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اخلاقِ رذیلہ سے نجات پا کر اخلاق حسنہ پر کاربند ہونے کے خواہاں افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی دوستیوں اور سنگتوں کا جائزہ لیں کہ وہ کس نوعیت کی ہیں۔ پھر جو اچھی دکھائی دیں اُنہیں برقرار رکھیں اور جو اس کے برعکس ہوں اُن سے حکمت و تدبر کے ساتھ کنارہ کشی اختیار کی جائے یا اُن میں کمی لائی جائے۔

صحبت کی دو اقسام

اس حوالے سے ایک اور اہم بات یہ ہے کہ صحبت کو دو اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ا - اختیاری:- جو اپنے اختیار میں ہے اس میں وہ تمام دوستیاں اور تعلقات شامل ہیں جنہیں انسان اپنی مرضی اور آزاد ارادے کے تحت منتخب کرتا ہے۔

۲ - غیر اختیاری:- جو اپنے اختیار میں نہیں مثلاً خونی رشتے بھائی، بہن، اولاد، دیگر عزیز و اقارب وغیرہ، نوکری، کاروبار اور دیگر سماجی کاموں کے سلسلے میں مختلف لوگوں سے ملنا جلنا۔

اس حوالے سے جو کانٹ چھانٹ کرنی ہے وہ اول الذکر میں ہی ہے جہاں تک موخر الذکر کا تعلق ہے وہاں انسان مجبور ہے تاہم اس کو بھی جس حد تک ہوسکے نظم و ضبط میں لایا جاسکتا ہے۔ نیز اُن کے منفی اثرات کو کم کرنے کے لیے حتی الوسع خاموشی سے مدد لی جاسکتی ہے ان ملاقاتوں میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کو بھی وقتاً فوقتاً بات چیت کے دوران شامل کرنا بھی ان کی نحوست کو کم کرتا ہے۔ نیز اچھی صحبتوں کے التزام اور پابندی سے انکے منفی اثرات کو ختم کیا جاسکتا ہے۔

خلاصہ کلام

اخلاقی انحطاط کے تدارک کا جو لائحہ عمل اس فصل میں دیا گیا ہے وہ ہر شخص کے لیے ہے خواہ وہ کسی بھی زمانے میں اور کسی بھی قسم کے حالات میں رہ رہا ہو۔اس میں جو چار اُصول بیان کئے ہیں اُن کا تعلق کسی مخصوص زمانے یا حالات سے نہیں ہے بلکہ وہ ایسی بنیادی سچائیاں اور ابدی قوانین ہیں جن کے نتائج حتمی اور یقینی ہیں چنانچہ ہر وہ شخص جو اپنی بشری اور فطری کمزوریوں پر قابو پانا چاہتا ہو اخلاقِ رذائل سے نجات پا کر اخلاقِ حسنہ سے خود کو آراستہ و پیراستہ کرنا

چاہتا ہو وہ حکمت و تدبر کے ساتھ انہیں استعمال کرتے ہوئے مطلوبہ نتائج حاصل کر سکتا ہے۔ اس ریسرچ ورک کا اصل مقصد یہی ہے کہ جو لوگ زمانے کی ناہمواریوں میں چلتے ہوئے اپنے آپ کو راست روی پر قائم رکھنا چاہتے ہوں اور اندرونی و بیرونی رکاوٹوں پر قابو پا کر اخلاقی کمال کو پانا چاہتے ہوں تو اُن کے لیے کوئی روڈ میپ فراہم کیا جائے۔ تاہم یہ ایک عمومی حل ہے ابن مسکویہ اور امام غزالی کے نظریات کی روشنی میں سامنے آنے والا حل آگے چل کر اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔

مدارس دینیہ میں جدید علوم کا آغاز وارتقاء

(ایک تاریخی وتحقیقی جائزہ)

☆ محمد ابوبکر

☆☆ حنا مرزا

ABSTRACT

Madaris Deenia have played a rich role to spread modern eduation in all the era of subcontinent. The term madaris is used for those educational institutions where special religious education is imparted. Generally, the knowledge taught in madaris is divided into two parts. Traditionally acquired knowledge is called artificial science and intellectually acquired knowledge is called rational science. To fulfill the religious needs of Muslims as well as their intellectual and material needs in addition to many kinds of sciences were included in the curriculum of almost every age. In this study, the role of teaching and learning of modern sciences in madrassas has been historically clarified. From the beginning of Islam to the Middle Ages, the distribution of knowledge was not as deep and contradictory as it became clear and contradictory in the nineteenth and twentieth century under the influence of modernity. It is imperative that all these modern sciences be included in the syllabus of religious schools which are necessary for humanity in modern era.

Keywords: Madaris, Religious, Knowledge, Importance

ابتدائیہ

اللہ تعالی کی بنائی گئی تمام اشیاء میں سب سے اعلی و اَرفع حضرت انسان ہے۔ جس کے سر پر اللہ تعالی نے تاجِ تکریم پہنا کر کائناتِ انسانی کو مزین کیا۔ انسان کو اتنی اَقدار کے ساتھ نوازا کہ ہر شے اس کی ہستی و شخصیت سے ہیچ نظر آتی ہے۔ اس تکریم و احتشام کے پیچھے اگر ہم غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ ایک ایسی خوبی جو اللہ تعالی نے انسان میں رکھی ہے وہ خوبی "علم" ہے جس کے ساتھ وہ متّصف و مزین ہے۔ زیر نظر آرٹیکل پڑھنے سے بات مترشح ہوگی کہ مدارس دینیہ میں

☆ لائبریرین، فریدِ ملت ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، لاہور

☆☆ ایم۔ایس کلینیکل سائیکالوجی / لیکچرار منہاج یونیورسٹی، لاہور

جدید علوم کا آغاز کب ہوا اور آج جس طرز علوم وفنون مدارسِ دینیہ میں متداول ہیں اُن کی کیا حیثیت ہے اور ان سے عصرِ حاضر کے طلباء کو اجمالی واقفیت ہونی چاہیے تاکہ ان جدید علوم کی حقیقت سمجھنے کے بعد عصرِ حاضر کے معاملات کے بارے میں شرعی احکام کی تحقیق کی جاسکے۔ فقہائے کرام نے فرمایاہے کہ:

''من جهل بأهل زمانه فهو جاهل''[1]

''جو آدمی اپنے اہل زمانہ سے واقف نہ ہو (یعنی زمانہ کے طرز زندگی' ان کی معاشرت' ان کے معاشی معاملات اور ان کے مزاج ومذاق سے واقف نہ ہو) تو وہ جاہل ہے''

ایک عالم کیلئے جس طرح قرآن و سنت کے احکام سے واقف ہونا ضروری ہے اس طرح اس کیلئے زمانہ کے ''عرف'' اور زمانہ کے حالات سے واقف ہونا بھی ضروری ہے اس کے بغیر وہ شرعی مسائل میں صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتا۔ حضرت امام محمد بن الحسن شیبانی رحمتہ اللہ علیہ کے حالات میں یہ بات وضاحت کے ساتھ ملتی ہے کہ فقہ کی تدوین کے دوران وہ باقاعدہ بازاروں میں جاکر تاجروں کے پاس بیٹھتے' اور ان کے معاملات کو سمجھتے تھے اور یہ دیکھا کرتے تھے کہ کونسے طریقے بازار میں رائج ہیں' ظاہر ہے کہ ان کا مقصد خود تجارت کرنا نہیں تھا' وہ صرف یہ جاننے کیلئے ان تاجروں کے پاس بیٹھتے تھے کہ ان کے کیا طریقے ہیں اور ان کے درمیان آپس میں کیا عرف رائج ہے؟ اس لئے کہ ان چیزوں سے واقفیت ایک عالم اور بالخصوص ایک فقیہ اور مفتی کے فرائض میں داخل ہے کہ جب اس کے بارے میں اس کے پاس سوال آئے وہ اس سوال کے پس منظر سے اچھی طرح واقف ہو اس کے بغیر وہ صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتا بلکہ یہاں تک کہا گیاہے کہ جب کسی علاقے یا کسی معاشرے میں ناجائز کاروبار کی کثرت ہو تو چونکہ عالم اور مفتی صرف فتویٰ جاری کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک داعی بھی ہوتا ہے اس لیے اس کا کام اس حد پر جاکر ختم نہیں ہوجاتا کہ وہ صرف اتنا کہ دے کہ فلاں کام جانائز اور حرام ہے' بلکہ بحیثیت داعی اس کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ اس کام کا ناجائز اور حرام کہنے کے بعد یہ بھی بتائے کہ اس کا متبادل حلال طریقہ کیاہے؟ وہ متبادل قابل عمل بھی ہونا چاہیے اور شریعت کے احکام کے مطابق بھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ قرآن کریم میں مذکور ہے کہ جب ان کے پاس قید خانے میں بادشاہ کا پیغام پہنچا اور خواب کی تعبیر ان سے پوچھی گئی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر تو بعد میں بتلائی کہ سات سال کا قحط آنے والا ہے لیکن اس قحط سے نجات حاصل کرنے کا راستہ پہلے بتادیا چنانچہ فرمایا کہ

---

[1] ابنِ عابدین، محمد اٗمین بن عمر، (۲۰۰۰)، شرح المنظومہ المسماۃ بعقود رسم المفتی، سہیل اکادمی، پاکستان۔ ص:۹۸

﴿فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَأْكُلُونَ﴾[1]

"اسے اس کے خوشے میں رہنے دو، مگر تھوڑا ساوہ جو تم کھالو۔"

اس آیت سے یہ استنباط کیا گیا ہے کہ داعیٔ حق صرف حرام کام کو حرام کہہ دینے پر اکتفانہ کرے یا صرف کسی مصیبت کو بیان کرنے پر اکتفاء نہ کرے کہ یہ مصیبت آنے والی ہے بلکہ اپنے امکان کی حد تک اس سے نکلنے کا راستہ بھی بتائے اور یہ راستہ اسی وقت بتایا جا سکتا ہے جب آدمی معاملات اور حقائق سے واقف ہو' اسی وقت بتایا جا سکتا ہے جب آدمی معاملات اور حقائق سے واقف ہو' اسی بات کے پیش نظر یہ ضروری سمجھا گیا کہ معاملات جدیدہ کے متعلق ایک درس تخصص کے نصاب میں شامل ہو معاشیات، سیاسیات وغیرہ آج کل ایک مستقل فن بن چکے ہیں اور اس کے مختصص ماہرین ہوتے ہیں' اس وقت جدید علوم کو بتام وکمال پڑھانا پیش نظر نہیں ہے' بلکہ جدید علوم کے ان حصوں سے آپ کو متعارف کروانا ضروری ہے جن کی ضرورت ایک عالم اور فقیہ کو بحیثیت فقیہ پیش آتی ہے' اور جس کے بارے میں بکثرت سوالات بھی آتے ہیں' اور ان کا جواب تلاش کرنا ہوتا ہے۔ عموماً ہمارے علماء جدید علوم سے واقف نہیں ہوتے جن کی عالم کو تحقیقی مسائل میں ضرورت پیش آتی ہے۔

تاریخی پسِ منظر

سامراجی طاقت نے ہماری تعلیمی درسگاہوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے ایک وہ جس میں صرف دین و شرعی علوم پڑھائے جاتے ہیں ان میں باقاعدہ فن و جدید ٹیکنالوجیز کا کوئی مضمون شامل نہیں کیا گیا یہ کہہ کر کہ یہ غیر اسلامی علوم ہیں جبکہ دوسری وہ درسگاہیں ہیں جس میں صرف عصری علوم مثلاً (کامرس، ایف ایس سی، بی ایس سی، الغرض سائنس و جدید ٹیکنالوجیز) پڑھائے جاتے ہیں۔ ان میں نہ کوئی تربیت کا مضمون شامل نصاب کیا گیا ہے نہ ہی کوئی شرعی مضمون شامل کیا گیا ہے۔ ان تعلیمی درسگاہوں سے ڈاکٹر، انجینئر، ماہر نباتات، ماہر نفسیات، ماہر ماحولیات الغرض کمپیوٹر ماسٹر وغیرہ بن کر نکلتے ہیں۔ مگر وہ شعور کی اس سطح تک نہیں پہنچتے کہ معاشرہ میں جا کر معاشرہ کے رسوم ورواج کے مطابق زندگی گزار سکیں بلکہ وہ مکمل طور پر روشن خیال بن جاتے ہیں۔ وہ لوگ اخلاقیات سے عاری ہوتے ہیں۔ اسلامی تاریخ کے بارے میں انہیں کچھ

[1] سورۃ یوسف، ۱۲:۴۷

معلوم نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کے اندر انسانی ہمدردی کا کوئی جذبہ نظر آتا ہے بلکہ حقوق انسانی کا استحصال کرتے نظر آتے ہیں[1]۔

ماضی میں جب مسلمانوں کی تعلیمی درسگاہوں میں تقسیم نہ تھی بلکہ دینی و شرعی اور جدید ٹیکنالوجی اور سائنسی علوم بیک وقت پڑھائے جاتے تھے تو تب ابن الہیثم، ابن سینا، امام غزالی، امام فخر الدین رازی جیسی ہستیاں پیدا ہوئیں تھیں جو بیک وقت ڈاکٹر انجینئر اور ریاضی دان بھی تھیں اور طریقت و تصوف ان کے افعال و کردار سے نمایاں ہوتا ہے۔ وہ ایک مثالی انسان بن کر معاشرے میں آتے تھے مگر سقوط بغداد کے بعد مسلمانوں کے علمی مراکز کو تباہ و برباد کر دیا گیا اور مسلمانوں کو ایسا روشن خیال بنایا کہ وہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو بھی بھول گئے ہیں، اسی لیے علامہ اقبال نے فرمایا:

وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

آج ہماری بد قسمتی کہ ہماری تعلیمی درسگاہوں نے ہی ہماری اسلامی تہذیب و ثقافت کو رخصت کر دیا ہے جو جوان نسل جو کبھی اسلامی تہذیب و ثقافت کی دلدادہ تھی، آج مغربی ثقافت کو ہی اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھی ہے جس کی وجہ سے نوجوان بے راہ داری کا شکار وہ رہے ہیں۔ آج ہماری ان تعلیمی درسگاہوں سے فارغ التحصیل ہونے والا نوجوان مختلف نوعیت کی گھمبیرک برائیوں میں مبتلا ہوتا ہے جوا، شراب، قمار بازی، زناکاری، بدکاری، فحاشی و عریانی کو وہ رشن خیال کا نام دے کر اپنائے ہوئے ہیں۔[2]

برصغیر پاک وہند میں مذہبی مدارس کی تاریخ

لفظِ اِقْرَأْ کے ساتھ اِلہامی دینِ اسلام کی وحی کا آغاز تعلیم و تدریس کی ضرورت اور اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی حکمِ خداوندی کی پیروی میں حضور نبی کریم ﷺ نے جہاں مکی دور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دینی و دنیوی تعلیم وتربیت کا فریضہ سر انجام دیا، وہیں آپ ﷺ نے ہجرتِ مدینہ کے بعد اسلامی ریاست کا قیام عمل میں لانے کے بعد سب سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعلیم وتربیت کی غرض سے مسجدِ نبوی میں باقاعدہ تعلیمی ادارہ قائم فرمایا۔ پھر انسانی تاریخ نے وہ منظر بھی دیکھا کہ اس

---

[1] ناظر علی، (س۔ن)، نوجوان نسل کے اسلام سے دوری کے اسباب، (مقالہ) ص:۷۵

[2] ناظر علی، نوجوان نسل کے اسلام سے دوری کے اسباب، ص:۷۵

عظیم درس گاہ سے علومِ دینی ودنیوی حاصل کرنے والوں نے دنیا کی امامت کی اور شرق تا غرب علم کی روشنی کو خوب پھیلایا۔

مسجدِ نبوی سے علمی درس گاہ کے آغاز کے بعد اسی روایت کو جاری رکھتے ہوئے مابعد ادوار میں تسلسل کے ساتھ دینی مدارس قائم ہوتے رہے جو اُمتِ مسلمہ کو دین و دنیا کے علوم سے بیک وقت مستفید کرتے رہے۔ ان مدارسِ دینیہ نے عظیم مذہبی اسکالرز، علمائے دین، عظیم سائنس دان، ماہرینِ طبیعات اور ماہرینِ انتظام و انصرام پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔[1]

وقت تھا جب مدارس میں دینی و دنیوی دونوں علوم پڑھائے جاتے تھے۔ تاریخی پس منظر یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں نے دنیا کو علم کی لازوال دولت، اقتصادی ترقی اور تکنیکی مہارتوں سے مالامال کر دیا تھا۔ یہ وہ عظیم لوگ تھے جن کے پاس ایک طرف یونانی علوم وفنون پر دسترس تھی تو دوسری طرف قرآن حکیم کے ابدی علوم میں غوط زن تھے۔ جدید و قدیم علوم کے حسین امتزاج کے باعث انہوں نے جدیدی سائنسز متعارف کروائیں۔ وہ ترقی، خوشحالی اور روشنی کے عظیم مینار تھے۔ ان مدارس سے جابر بن حیان جیسے عظیم سائنس دان، امام غزالی جیسے فلاسفرز، امام جلال الدین سیوطی اور ابن العربی جیسے متصوف اور ابو علی سینا جیسے عظیم ڈاکٹر پیدا ہوئے۔ آنکھوں کو چندیا دینے والی سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی جس پر آج جدید انسانی تہذیب کو فخر ہے۔ یہ اہلِ یورپ نے مسلمانوں سے ورثہ میں لی اور اس میں مزید ترقیاں کیں۔ آکسفورڈ اور کیمرج یونیورسٹی جنہیں عالمی تعلیمی نظام میں نمایاں مقام حاصل ہے وہ مسلمانوں کے شاندار علمی عروج کے دور میں الازہر اور الزیتونہ (Al-Zaituna) یونی ورسٹی کی طرز پر بنائی گئی تھیں۔ الغرض) وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور معاشرتی و سیاسی ماحول میں تبدیلیوں کے باعث مذہبی مدارس مختلف تبدیلیوں سے گزرتے رہے۔[2]

مذہبی مدارس برصغیر پاک وہند میں قیام پاکستان سے بھی پہلے کے موجود ہیں۔ تقسیم سے قبل ہندوستان میں تمام مسلم طبقات کے بچوں کے لیے بطور تعلیمی مراکز ان کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ تعلیمی اداروں میں جدید و قدیم علوم کا امتزاج تھا جو طلباء میں شعور و آگہی، وسعت نظری اور وسیع عالمی نقطہ نظر پیدا کرتے تھے۔ تعلیمی ادارے ایسے علماء پیدا کرتے تھے جو بیک

---

[1] قاضی اطہر مبارک پوری، (۲۰۱۴)، خیر القرون کی درسگاہیں اوران کا نظامِ تعلیم وتربیت، کراچی، ادارہ اسلامیات، ص:۱۱

[2] حسین محی الدین، ڈاکٹر، (۲۰۱۷ء)، پاکستان کا نظام تعلیم متشدد رجحانات اور مدارسِ دینیہ، منہاج القرآن۔ ص ۴۱

وقت سرکاری دفاتر میں اور سماجی سطح پر اپنی خدمات سرانجام دیتے تھے۔ مسلمان اپنی مذہبی تعلیم مساجد سے حاصل کرتے تھے جبکہ پرائمری سکول ساتھ ہی منسلک ہوتے تھے۔ اس تعلیم کا بنیادی مقصد مذہبی رجال کار پیدا کرنا تھا۔ جس کے تحت عامتہ الناس کو بیک وقت دنیا و آخرت کے لیے تیار کرنا تھا گویا مذہب تمام تر علوم سیکھنے کا منبع تھا۔(۱)

برصغیر پاک وہند میں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اسلامی تعلیمی اداروں کا احیاء تعلیمی اور تاریخی اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس نے ہندوستانی ماحول میں مسلم معاشرے کی سماجی، سیاسی اور ثقافتی بحالی کی راہیں متعین کیں۔ اس مذہبی نظام تعلیم کے تحت ایک طرف مؤثر مذہبی رہنماؤں کی قیادت میں ہندوستانی مسلمانوں کی مسلسل کردار سازی کا عمل جاری تھا تو دوسری طرف ہندوؤں کے درمیان رہتے ہوئے نہایت منظم انداز میں مسلمانوں میں باہم اتحاد و یگانگت اور شعور بیدار کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس نظامِ تعلیم نے مسلمانوں کے اندر اسلامی طرزِ زندگی، اسلامی تاریخ، فلسفے اور تہذیب و ثقافت کا شعور بیدار کیا۔(۲)

انگریز کی آمد

جنگ آزادی(1857ء) کی ناکامی کا دور مسلمانوں کی ناامیدی و مایوسی کو ظاہر کرتا ہے۔ کیوں کہ برطانوی راج ان کے لیے نئے سیاسی نظام کا بھی پیش خیمہ تھا۔ مسلمان قوم جو صدیوں سے ہندوستان پر حکومت کر رہی تھی چند دہائیوں کے دورانیے ہی میں غلام اور محکوم ہو گئی اور اقتدار ہاتھوں سے نکل جانے کے بعد جمود اور اضمحلال کا شکار ہو گئی تھی۔ نئے حکمران ان کی وفاداری پر شک کرنے لگے اور جنگِ آزادی میں شامل ہونے کے پاداش میں ان کے لیے سزاؤں کے پیمانے مقرر کیے گئے۔ برطانوی سیکولر نظام تعلیم کے ذریعے روایتی اور صدیوں پرانے نظام تعلیم کی تبدیلی کی وجہ سے مسلمانوں کو زوال کی طرف دھکیل دیا گیا اور ان کے حریف ہندو برطانیہ کے دوست بن گئے اور نئے نظامِ تعلیم ان کی مذہبی اقدار اور خاص مذہبی و ثقافتی شناخت کو تباہ و برباد کر دے گا۔(۳)

---

[1] قاضی، معصوم الرحمانی، ڈاکٹر، (۲۰۱۵) پاکستان کے دینی مدارس، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ص:۹

[2] حسین محی الدین، ڈاکٹر (۲۰۱۷) پاکستان کا نظام تعلیم متشدد رجحانات اور مدارسِ دینیہ، ص:۴۱

[3] خالد، سلیم منصور، (۲۰۰۲)، دینی مدارس میں تعلیم، اسلام آباد، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز عالمی ادارہ فکری اسلامی، ص:۹۶

برصغیر پاک و ہند میں کئی صدیوں سے رائج تعلیمی نظام اُس وقت تنزلی کا شکار ہو گیا جب برطانیہ نے مسلمانوں سے اقتدار چھین کر اپنے قبضے میں کر لیا اور لبرل تعلیم کو متعارف کرایا۔ مشہور سرکاری مبصر (Civil Servant)۔ سر ولیم ہنٹر (Sir William Hunter) نے اپنی کتاب میں اُس وقت کے حالات کی کچھ اس طرح سے منظر کشی کی ہے:

ہندوستان میں اقتدار پر ہمارا قبضہ ہونے سے قبل ہندوستانی مسلمان صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ علمی طور پر بھی طاقت ور تھے۔ ان کا نظام تعلیم ہمارے قائم نظامِ تعلیم سے بہتر تھا۔ تاہم اس کی حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ وہ ایک علمی تربیت اور نکھار کے ایسے اصولوں پر مبنی تھا جو مکمل طور پر غیر معتبر نہیں تھے۔ لیکن انہیں فرسودہ طرز پر پیش کیا گیا تھا اور ہندوستان میں موجود دیگر نظام ہائے تعلیم کی نسبت یہ غیر معمولی طور پر اعلیٰ تھا۔ یہ ایک ایسا نظام تھا جس سے نہ صرف انہیں علمی فوائد میسر آئے تھے بلکہ دنیوی بالادستی کا حصول بھی ممکن ہو تھا۔[۱]

اپنے دورِ حکومت کے ۷۵ سال ہم نے اس نظام تعلیم سے فارغ التحصیل افراد کو انتظامی معاملات چلانے کی غرض سے استعمال کیا۔ لیکن اس دوران ہم نے اپنے طور پر ایسی منصوبہ بندی کی کہ جس کے تحت جب ہم نے ایک نسل کی ترتیب کر چکے ہوں گے تو ہم (مسلمانوں کے) پرانے نظامِ تعلیم کو ترک کر دیں گے اور برصغیر پاک و ہند میں ایک ایسی فضا قائم کر دیں گے جس میں (ان مدارس سے فارغ ہونے والے) مسلمان نوجوان اپنے لیے معاشی و معاشرتی زندگی میں ترقی کا ہر دروازہ بند پائیں گے۔[۲]

انگریز کے شاطر دماغ نے اپنی ریشہ دوانیوں سے ملتِ اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے سیکولر نظام تعلیم ملک بھر میں رائج کر دیا۔ ایسے نظامِ تعلیم سے عالمِ اسلام میں کوئی رومی، رازی، فارابی، جامی اور ابنِ رشد جیسا ہم جہت عالم، مفکر اور دانش ور کیسے پیدا ہو سکتا تھا؟

تاریخ اسلام کے زریں دور میں بغداد اور قاہرہ کی بڑی بڑی اسلامی درسگاہوں میں اکتسابِ علم کے لیے شرق و غرب سے کشاں کشاں لوگ آتے تھے۔ پھر تاریخ کا پہیہ گھوما اور صورت حال یہ ہو گئی کہ مسلمان طلباء اب مغرب سے حصول

---

[۱] حسین محی الدین، ڈاکٹر (۲۰۱۷ء)، پاکستان کا نظام تعلیم متشدد رجحانات اور مدارسِ دینیہ، منہاج القرآن۔ ص ۴۱

[۲] قاضی، معصوم الرحمانی، ڈاکٹر، (۲۰۱۵) پاکستان کے دینی مدارس، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ص:۱۱

علم کی بھیگ مانگتے نظر آتے ہیں۔ آج اپنی یہ زبوں حالی اور کم مائیگی دیکھ کر کوئی بھی درد مند مسلمان خون کے آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جنگِ آزادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات وواقعات نے مسلمانوں کے درمیان دو گروہوں کو جنم دیا۔ اس کڑے وقت میں مسلمانوں کے جدت پسند اور روایت پسند دونوں گروہوں نے مسلم کمیونٹی میں تعلیم کے احیاء کی ضرورت کو محسوس کیا۔ اس تعلیم کی نوعیت، اسلوب اور مقاصد کے حوالے سے مسلمانوں میں افتراق اور ثنویت نے جنم لیا۔ علماء کی قیادت میں روایت پسند گروہ اس نظریہ کا حامل تھا کہ مدارس میں دی جانے والی مذہبی بنیاد پرستی پر مبنی نظامِ تعلیم کے ذریعے ہی مقاصد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ یہ وہ مقصد تھا جس نے انہیں متحرک کیا کہ وہ نئے مدارس بنائیں اور پرانے مدارس کو بھی بحال کریں لیکن ان کی یہ کوشش غفلت اور عدم سرپرستی کا شکار رہی۔ علماء کا خیال تھا کہ (حالات کے پیشِ نظر) معاشی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کا حل (جدید تعلیم کو اختیار کرنے کی بجائے صرف) مدارس سے جڑے رہنے میں پوشیدہ ہے۔

دوسرا گروہ ان اِصلاح پسند جدت پسند (Modernists) رہنماؤں کا تھا جن کے نزدیک مسلمانوں کے زوال اور جمود کا توڑ اسلامی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید مغربی تعلیم کو اختیار کرنے میں تھا جو مسلمانوں کے لیے روشن خیالی اور ترقی کی ایک نئی دنیا آباد کر سکتی ہے۔ اس سوچ نے تعلیمی نظام میں ثنویت کو جنم دیا جو برصغیر میں رائج رہی (اور تاحال اس کے اثرات معاشرے میں پائے جاتے ہیں)۔ اس خلیج کو پُر کرنے اور دونوں میں باہمی مطابقت پیدا کرنے کی تمام کاوشوں کے باوجود دونوں ابھی تک ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ یہ (صورت حال) مسلم معاشرے کے درمیان دو واضح نظریاتی اور علمی مکاتب کی عکاسی کرتی ہے۔ [۱]

پاکستان کے مذہبی مدارس

1947ء میں پاکستان میں صرف 189 مدارس تھے جبکہ 2002ء میں ملک کے اندر غیر اندراج شدہ مذہبی مدارس کی تعداد 10,000 سے 13,000 ہو چکی تھی۔ ان مدارس می ایک اندازے کے مطابق 1.7 سے 1.9 ملین طلباء زیر

---

[۱] حسین محی الدین، ڈاکٹر، (۲۰۱۷)، پاکستان کا نظام تعلیم متشدد رجحانات اور مدارسِ دینیہ، ص ۴۷

تعلیم تھے، سال 2008ء میں یہ اعداد و شمار سے 40 ہزار سے بھی اوپر چلے گئے جب کہ آج یہ عدد 50 ہزار سے بھی تجاوز کر چکا ہے۔[۱]

یہ مدارس اپنے اپنے مکاتب فکر سے تعلق رکھتے ہوئے مختلف (Governing Bodies) کے تحت چل رہے ہیں۔ یہ bodies تنظیم المدارس (بریلوی)، وفاق المدارس (دیوبند)، وفاق المدارس (اہلِ تشیع)، وفاق المدارس (اہلِ حدیث) رابطۃ المدارس (جماعت اسلامی) اور منہاج القرآن (منہاج بورڈ) کے نام سے کام کر رہی ہیں۔ اپنے اجتماعی مفادات کے حصول کی خاطر مذہبی مدارس اور اداروں کی ان جماعتوں نے خود کو اتحادِ تنظیماتِ مدارس دینیہ کی چھتری کے نیچے متحد کر رکھا ہے۔

ان مدارس کے نظام اور نصاب میں اصلاحات کے حوالے سے وقتاً فوقتاً مختلف مطالبے ہوتے رہے ہیں۔ لیکن 9/11 کے واقعہ کے بعد اس رجحان میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ اس مقصد کے لیے پرویز مشرف کی حکومت نے دو قانون متعارف کروائے۔ پہلا قانون state-controlled مدارس کا قیام (2001ء)، جب کہ دوسرا پہلے سے موجود مدارس کا حکومتی سطح پر اندارج اور ان میں اصطلاحات سے متعلق تھا (2002ء)۔

پہلی قانون سازی کامیابی سے ہم کنار ہوئی اور اس قانون کے تحت پاکستان مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ مذہبی اداروں اور مذہبی جماعتوں نے مدارس میں اصطلاحات اور ان کی رجسٹریشن کے لیے کی جانے والی حکومتی کاوشوں کی بھرپور مزاحمت کی۔ انہوں نے حکومت کو غیر ملکی اثر و رسوخ کے تحت چلنے کا الزام لگایا۔[۲]

یہ مذہبی ادارے طلباء کو درس نظامی پڑھاتے ہیں۔ ان میں سے بعض مدارس نے انگلش، کمپیوٹر سائنس اور دیگر جدید مضامین کو بھی باقاعدہ نصاب کا حصہ بنا رکھا ہے۔ مذہبی مدارس کی اکثریت کورس کے ساتھ ساتھ شدید فرقہ وارانہ رجحانات بھی رکھتے ہے۔ یہاں پڑھائے جانے والے نصاب اور اس کے ذیلی اجزاء کا بغور تجزیہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہاں پڑھنے والے طلباء معاشرتی اور اقتصادی زندگی سے کٹ کے رہ جاتے ہیں۔ اِن مدارس سے فارغ ہونے والے طلباء کے پاس

---

[۱] نعیم الدین، (۲۰۰۷)، فروغ علم میں مدارس دینیہ کا کردار، مکتبہ المجاہد،، ص:۱۰۷

[۲] غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، (۲۰۰۹)، مسلمانوں کا دینی و عصری نظامِ تعلیم، اسلام آباد، الشریعہ اکیڈمی، ص:۲۵

بہت کم ایسے ہنر اور طریقے ہوتے ہیں جو اِنہیں عملی زندگی میں بہتر روزگار کے مواقع فراہم کر سکیں۔ ان کا عالمی نقطہ نظر بہت محدود ہوتا ہے اور وہ ہر معاملے کو تعصب کی عینک سے دیکھتے ہیں۔(۱)

جدید علوم

نصاب سازی ایک باقاعدہ سائنس ہے۔ اس میں جو عناصر لازماً تفصیل کے ساتھ شامل ہوتے ہیں ان میں: مقاصد تعلیم، شعبہ وار نفس مضمون کی تدریجی تفصیلات، سیرت و کردار کی تشکیل کے لیے سرگرمیاں، تدریسی اور ابلاغی حکمت عملی اور آخر میں جائزے کے لیے امتحانی طریق کار اور سندات کے اجرا کی شراط ہوتی ہیں۔ اس طرح شعبہ وار، نفس مضمون کے لیے مجوزہ درسی کتب کی فہرست بھی بعض اوقات دی جاتی ہے، تاکہ استاد اور طالب علم کو حصول علم میں سہولت حاصل ہوا۔ پھر نصاب سازی میں اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ: وہ جہاں طلبہ کی ذہنی سطح سے مطابقت رکھتا ہو، وہاں فرد اور معاشرے کی ضروریات کو بھی پورا کرے۔ نیز اس میں وسعت پذیری کی صلاحیت ہو۔ اس میں توازن اور تسلسل کا خیال رکھا جائے، اور وہ اپنی نظریاتی بنیاد پر قائم رہتے ہوئے عصر حاضر کے تقاضے پورے کرتا ہو۔

"اہلِ علم و فضل جمع ہو کر تعلیم کے اہداف متعین کریں، مراحل مقرر کریں، ان کے حصول کے لیے نصاب بنائیں، اور اس نصاب پر مشتمل کتب، تیار کرائی جائیں۔ علمی میدان میں ترقی کے لیے ضروری ہے کہ جدید سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی سے استفادہ وقت کی اہم ضرورت ہے اس کے بغیر علمی میدان میں ترقی ناممکن ہے۔"(۲)

اس ضمن میں سائنس اور سماجی علوم نیز انفرمیشن ٹیکنالوجی کے ابتدائی، تعارفی اور تنقیدی مطالعے کو موقع فراہم کیا جائے۔

- سائنسی علوم (خاص طور پر حیاتیات، طبیعیات، کیمیا، فلکیات) کا تعارفی اور تنقیدی مطالعہ اہم اصطلاحوں سے واقفیت اور مختلف مباحث سے تعارف (ریاضی و سائنس کے مبادیات کی تعلیم دی جائے۔ اس کے لیے مختصر اور معلوماتی مضامین تیار کیے جائیں۔ ریاضی کی تدریس میں روزمرہ ریاضی اور عملی ضروریات

---

[1] غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، (۲۰۰۹)، مسلمانوں کا دینی وعصری نظامِ تعلیم، ص:۲۵

[2] میاں، حافظ حقانی، (۲۰۱۴)، ماہنامہ تعمیر افکار، دینی مدارس، ضرورت، امتیاز، کراچی، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، ص:۱۳۵

کے لیے حسابی قواعد سکھائے جائیں۔ جبکہ طبعی اور حیاتیاتی سائنس کے مظاہر، تخلیقی حکمت کے جدید تصورات پر نقد و نظر کے ساتھ نئی کتب تیار کر کے نصاب میں شامل کی جائیں۔

- جدید سماجی علوم (سیاسیات، نفسیات، معاشیات، بین الاقوامی امور) کا تعارفی اور تنقیدی مطالعہ۔
- اگرچہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی (IT) ایک وسیع اور پیشہ ورانہ میدان ہے۔ تاہم اس کے بارے میں تین برسوں میں ابتدائی نوعیت کی معلومات اور خاص اصطلاحوں کا فہم دے دیا جائے، اور اسے دعوۃ اور دیگر دینی معمولات کے ابلاغ وغیرہ سے مربوط کر کے پڑھایا سمجھایا جائے تو یہ چیز طالب علم کے اعتماد میں وسعت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔[1]

فکری جمود

دینی مدارس میں پڑھنے والے اکثر طلباء فکری جمود کا شکار ہیں۔ جمود اور تعطل کی اس سطح پر تغیر احوال کا جائزہ لیتے ہوئے اگر از سرِ نو دینی افکار کی ترویج و احیاء کا کام نہ کیا جائے اور جدید دین کے حامل افراد کے سامنے وہی پرانے مذہبی تصورات ہوں جنہیں مرورزمانہ بے اثر اور ناقابل عمل کر چکا ہو تو لامحالہ وہ ذہنی التباس میں اور پڑاگندا خیالی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد طاہر القادری اپنی کتاب ''منہاج الافکار'' میں لکھتے ہیں:

> ''یہ افکار و نظریات کی بھیک دینی غلامی سے شروع ہو کر مادی و سیاسی احتیاج اور استفسار پر منتج ہوتی ہے۔ اس طرح قوم میں غلامی و محکومی کی ڈگر پر چل کر آزادی کی نعمت سے محروم ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی مدارس میں پڑھنے والے طلباء کو جدید اور عصری افکار و نظریات سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ عصر حاضر کی ضروریات کو کماحقہ سمجھ کر اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال سکیں۔ تاکہ دینی درسگاہوں سے نکلنے والے طلباء صرف ایک مسجد امام یا روایتی مُدرس کی سوچ

---

[1] خالد، سلیم منصور،(۲۰۰۲)، دینی مدارس میں تعلیم، اسلام آباد،انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز عالمی ادارہ فکری اسلامی ص:۳۵۴

نہ رکھتا ہو بلکہ وہ معاشرے کو حالات حاضرہ کے مطابق اسلام کا پیغام پہنچا سکے یہ تب ہی ممکن ہے جب طلباء عصری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے افکار و نظریات کی سمت کو متعین کر کے تعلیم حاصل کریں۔(۱)

مولانا قمر احمد عثمانی اپنی کتاب ''مذہبی جماعتوں کا فکرِی جائزہ'' میں لکھتے ہیں:

''عملی میدان میں تو یہ کچھ ہو رہا تھا۔ علمی میدان میں بھی ایک طرح کا نہایت ہی شدید جمہود طاری تھا۔ قرآن و سنت سے مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ علماء و فضلاء تک کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ کورانہ تقلید کا دور دورہ تھا۔ قرآن و مستند حدیث کا نام لینے والا کوئی نہیں تھا۔ مسائل و معاملات میں فقہ کی سند آخری تسلیم کی جاتی تھی۔ سب سے بڑی سند یہی تھی کہ کسی مسٔلہ میں فقہ کی کسی کتاب کو حوالہ دے دیا جائے۔ اجتہاد کرنا تو در کنار تحقیق و تدقیق اور کسی فقہی مسٔلہ ک خلاف لب کشائی کرنا بھی شدید ترین جرم تھا۔ برصغیر ہند و پاکستان ہی میں نہیں بلکہ تقریباً پورے عالم اسلام میں حالات کچھ اسی قسم کے تھے۔ بہر حال علمی اور فقہی میدان پر تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں جو پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں ان کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مسلمان ذہنی اعتبار سے نہایت ہی پستی میں جا گرے۔ نہ سیاسی طور پر انہیں اس کے بعد ابھرنا نصیب ہوا اور نہ علمی اور فکری طور پر وہ آگے بڑھ سکے۔ چار سو سال تک مسلمان اسی جمود کی حالت میں گرفتار رہے''(۲)

مدارس میں جدید علوم کی ضرورت واہمیت

عام طور پر یہ بات بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ مذہبی اداروں کے تعلیم یافتہ علماء کئی کئی گھنٹوں تک مختلف موضوعات مثلاً نور و بشر اور حاضر و ناظر کی بحث پر بآسانی تقاریر کر کے امت کو فروعی مسائل میں تو الجھائے رکھتے ہیں لیکن امت مسلمہ کو درپیش جدید مسائل مثلاً اسلامی اقتصادی نظام، اقوام عالم کے ساتھ بین الاقوامی تعلقات، جنگ اور امن کے حوالے سے قانونی طریقہ کار، اسلامی تہذیب و تمدن اور ثقافت، سیاسی پالیسیاں، اسلامک پینل کوڈ اور اسلامی طرزِ زندگی کے استحکام کا ضابطہ وغیرہ کے حوالے سے ان کی معلومات نہایت محدود ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ

---

[1] قادری، محمد طاہر، ڈاکٹر، (۱۹۹۲)، منہاج الافکار، لاہور، منہاج القرآن، ج:۱، ص:۳۹

[2] قمر احمد عثمانی، (۱۹۹۶)، مذہبی جماعتوں کا فکری جائزہ، دوست ایسوسی ایٹس، ص:۷۹

ہونے اور امت مسلمہ کو درپیش کثیر الجہتی مسائل کا حقیقت پسندانہ اور قابل عمل حل اسی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے جب علمائے دین قرآن و سنت کی روشنی میں جدید و قدیم علوم سے مکمل آشنا ہوں گے اور علم القانون اور دینی علوم پر کامل دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ بین المسالک(intra-fait)، بین المذاہب(interfaith) اور بین الاقوامی سطح پر پائی جانے والی عصری و تہذیبی مسائل کو address کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں گے۔[۱]

ڈاکٹر حسین محی الدین اپنی کتاب پاکستان میں نظامِ تعلیم میں راقمطراز ہیں:

> ”دینی مدارس میں جدید و قدیم علوم کا امتزاج ہونا چاہیے۔ یہ مذہبی اداروں کی Isolation کو ختم کرے گا اور پاکستان کے نظامِ تعلیم کے مرکزی دھارے کے ساتھ ہم آہنگ کرکے ترقی کی نئی رائیں کھولے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ یکساں نظامِ تعلیم ملک میں متعارف کرایا جائے۔ یہ ایک ایسا اقدام ہو گا جس کے ذریعے پاکستان پچھلی طبقاتی تقسیم کا خاتمہ ہو سکے گا اور خوابیدہ صلاحیتوں کے حامل طلباء کی کثیر تعداد ملک و قوم کی بہتری کے لیے میسر ہو گی۔ بین المسالک ہم آہنگی کی بحالی اور اسلام کے سیاسی نظام کو پہنچنے والے نقصان کی تلافی کے لیے ضروری ہے کہ ایسے تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں جو اہم تحقیقات کی حوصلہ افزائی کریں، جو آزادانہ سوچ کے حامل ہوں، جن کا مقصد موجودہ مسائل کا بصیرت پر مبنی حل تلاش کرنا ہو“[۲]

تقابل ادیان

اسلام بنیادی طور پر دعوت حق کا دین ہے۔ اس اعتبار سے ہر وہ فرد جو اسلام کا پیغام (یعنی کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت) سمجھے گا، وہ یقیناً اسے دوسروں تک پھیلانے کا عزم اور حوصلہ بھی پائے گا۔ اس صورت میں لازمی طور پر اسے نہ صرف نسلی مسلمانوں تک بلکہ دیگر مذاہب کے لوگوں تک بھی پہنچنا ہو گا۔ دینی مدرسے کے طالب علم کے لیے تو یہ بات اور بھی ضروری ہو جاتی ہے کہ وہ تمام بڑے مذاہب کی تاریخ، عقائد، عمل، اختلاف اور ان کی جدید حکمت عملی کے بارے میں معلومات اور فہم رکھے۔ اس مقصد کے لیے حسب ذیل مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا جائے:

- یہودیت، عیسائیت (تاریخ، فرقوں اور ان کے علم کلام کا مطالعہ)۔

---

[1] میاں، حافظ حقانی، (۲۰۱۴)، ماہنامہ تعمیر افکار، دینی مدارس، ضرورت، امتیاز، کراچی، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، ص:۱۰۳

[2] حسین محی الدین، ڈاکٹر، (۲۰۱۷)، پاکستان کا نظام تعلیم، لاہور، منہاج القرآن پرنٹرز، پاکستان۔ ص ۱۲۵

- غیر سامی مذاہب: ہندو مت، بدھ مت، سکھ مت، قادیانیت۔
- چونکہ عصر حاضر میں مختلف نظریات نے بھی جدید مذاہب کی شکل اختیار کر لی ہے، اس لیے انھیں بھی اس تقسیم میں زیر مطالعہ لایا جائے، مثلاً سیکولرزم، نسل پرستی، قوم پرستی، سرمایہ داری وغیرہ۔

تاریخ

موجودہ درسی نصاب میں امت مسلمہ کی تاریخ سے متعلق کوئی حصہ شامل نہیں ہے۔ اس لیے دینی مدارس کا طالب علم عموماً تاریخ کے تسلسل اور اہم واقعات کی ترتیب سے بے خبری کا شکار رہتا ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے:

- اسلام کا فلسفہ تاریخ اور مطالعہ تاریخ کا مقصد
- فلسفہ تاریخ کے مختلف نظریات۔
- مختلف ادوار کے مطالعہ، واقعات و حوادث کے تکرار کے بجائے ان واقعات کے محرکات پر بحث، حکمرانوں کی دینی، سماجی، معاشی حکمت عملی کے فہم اور مستقبل پر ان کے اثرات و مضمرات پر مشتمل ہو۔
- عام طور پر اسلامی تاریخ کا نصاب خلافت راشدہ سے شروع ہو کر خلافت عباسیہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ حالانکہ مسلم تاریخ کے حسب ذیل اور اپنی اہمیت کے اعتبار سے نہایت ضروری ہیں: خلافت عثمانیہ•، اندلس میں مسلمان•، وسطی ایشیا میں مسلم ریاستیں•، مشرقی یورپ میں مسلم تاریخ•، جنوب مشرقی ایشیا میں مسلم اقتدار•، مشرق بعید میں اسلام کا پھیلاؤ•، افریقی ممالک میں اسلام کی ترویج•، انیسویں اور بیسویں صدی میں مسلم دنیا کی شکست وریخت اور اس سے پیدا شدہ عبرت آموز اسباق وغیرہ۔
- تجدید واحیائے دین کی تحریکات۔
- مسلم دنیا کے مختلف حصوں پر مغربی استعمار کے غلبے کی تاریخ، حکمت عملی، اثرات اور نتائج۔
- مسلم دنیا کا نقشہ، جغرافیہ، معدنی و قدرتی مسائل اور وسائل پر معلومات اور فہم۔

انگریزی تعلیم:

دینی تعلیم کے حاملین کو بہر صورت انگریزی زبان پر اتنی دسترس ضرور حاصل ہونی چاہیے، جس کے تحت وہ انگریزی میں لکھی ہوئی کتاب آسانی سے پڑھ سکیں، اور اسے سمجھ کر اپنی زبان میں مطلب بیان کر سکیں۔ یہ ایک بے جا

قسم کا خوف ہے کہ اگر ان طلبہ کو انگریزی میں شدبد ہو گئی تو یہ دین کا راستہ چھوڑ کر دنیا کی منڈی مین غائب ہو جائیں گے۔ زبردستی کسی کو باندھا اور روکا نہیں جا سکتا۔ اس لیے کھلے دل کے ساتھ اس چیلنج کو قبول کرنا چاہیے۔

پہلے مرحلے میں میٹرک کی سطح تک رائج انگریزی درسی کتب اور گرامر سے شناسائی ضروری ہے اور پھر کم از کم انٹر میڈیٹ کا انگریزی نصاب پڑھانا چاہیے۔[۱]

دعوت و تربیت

دین اسلام کوئی نسلی پیغام نہیں ہے۔ یہ ہدایت سب زمانوں، قوموں اور نسلوں کے لیے ہے۔ دعوت حق کا دروازہ قیامت تک کھلا ہے۔ اس لیے اسلام ہر مسلمان پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے قول، فہم اور عمل سے دین اسلام کے دعوت کو پھیلانے والا بنے۔ افسوس کہ وقت گزرنے کے ساتھ جہاں دیگر بہت سی غلط فہمیاں اور آئی ہیں، اسی طرح دعوت دین کے بارے میں یہ باور کر لیا گیا ہے کہ یہ کام شاید صرف چند علماء کا ہے۔ بلاشبہ چند افراد تو اس ذمہ داری کے لیے ہم وقت مصروف رہیں گے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جمہور مسلمان مرد وزن اس فرض سے سبک دوش ہو گئے ہیں۔ اس حوالے سے دعوت دین کے اصول، طریق کار اور دیگر متعلقہ مباحث سے طالب علموں کو آگاہ حاصل ہونی چاہیے، اسی لیے دینی مدارس نے جہاں فہم قرآن اور فہم دین میں کمال کی ذمہ داریاں ادا کرنی ہیں، وہیں پر اس کے طلبہ و طالبات کو دعوت دین، اور اشاعت اسلام کی ترتیب بھی دینا ہے۔ اس عمل کے دو پہلو ہیں: پہلا دعوت اور دوسرا تربیت[۲]

دعوت کے ذیل میں:

- قرآن و سنت کے، اصول دعوت اور اسلوب دعوت کی تفہیم۔
- دعوت دین کی تاریخ سے حاصل کردہ اسباق سے شناسائی۔
- گفتگو، مکالمے، تقریر وغیرہ کی عملی تربیت۔

جبکہ تربیت کے ذیل میں:

- مختلف طبقوں، گروہوں وغیرہ میں دعوتی کام کی تربیت۔

---

[۱] محمد احمد، مفتی، (۲۰۱۸) مسلم معاشرے کا نظام تعلیم تحقیقی و تنقیدی جائزہ، لاہور، کتاب محل، ص:۲۰۹

[۲] ندوی، ابوالحسن علی، (س۔ن) مدارس اسلامیہ اہمیت وضرورت اور مقاصد، کراچی، مجلس نشریات اسلام، ص:۴۷

- اخلاق اور کردار کی تعمیر وتزکیہ کے لیے قرآن وسنت کے اصولوں کا فہم۔
- مسلمانوں میں اخلاقی تربیت کے دیگر طریقوں (تصوف، ذکر وغیرہ) کا مطالعہ اور تجزیہ۔[1]

جدید تحقیق پر مبنی تعلیم

تعلیمی زندگی کا ایک بڑا اہم حصہ تحقیق اور تجزیے کا ہے۔ جس میں طالب علم کس ایک موضوع پر اپنی توجہ مرتکز کر کے پہلے سے کیے گئے کام کا جائزہ لیتا ہے، پیدا شدہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مختلف ماخذ ومراجع سے استفادہ کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ عام یونیورسٹیوں میں اس مقصد کے لیے ٹرم پیپر، ریسرچ رپورٹ، ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالے لکھے جاتے ہیں۔ یقیناً امت مسلمہ کو راست فکر تحقیق کاروں کی ایک قیمتی ٹیم میسر آسکتی ہے۔

تحقیق کے ناگزیریت:

- جدید علوم اور ٹیکنالوجی سے استفادہ حاصل کرنا ضروری ہے۔
- تحقیق وتجزیے کے لیے، ابتدائی دور کے اسلامی محقیقن کی کاوشوں اور طریق کار سے واقفیت، پھر تحقیق وتجزیہ کے جدید اصولوں کا تعارف اور پھر تحقیق وتجریہ یا مخطوط (Manuscript) کی پرکھ کے لیے عملی تربیت ایم اے کی سطح کا تحقیقی مقالہ لکھنا لازمی قرار دیا جائے۔ جس کا جائزہ غیر جانب دار حضرات لیں۔
- ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح کی تحقیق کے لیے بھی پروگرام تجویز کیا جائے، جس کی منظوری کے لیے بین الاقوامی اسلامی اور قومی یونیورسٹیوں سے الحاق ممکن ہے۔

فقہ اور اصول فقہ

دینی مدارس میں فقہ (Ismaic jurisprudence) کی تعلیم کے بارے میں تاثر یہ ہے کہ: ”حدیث اور قرآن کی نسبت ان [علماء ودینی مدارس] کی توجہ فقہ کی طرف زیادہ رہتی ہے۔ لیکن اس میں زیادہ تر، بلکہ تمام تر جزئیات فقہ کی تفصیلات ہی توجہ کا مرکز رہتی ہیں۔ فقہ کی تاریخ، اس کا تدریجی ارتقا، اس کے مختلف اسکولوں کی امتیازی خصوصیات، ان

---

[1] ندوی، ابوالحسن علی، (س۔ن) مدارس اسلامیہ اہمیت وضرورت اور مقاصد، کراچی، مجلس نشریات اسلام، ص:۴۸

اسکولوں کے متفق علیہ اور مختلف فیہ اصول اور ائمہ مجتہدین کے طریق استنباط، جن کے جانے بغیر کوئی شخص حقیقت میں فقیہہ نہیں بن سکتا، ان کے درس سرے سے شامل ہی نہیں ہیں۔ بلکہ ان چیزوں پر شاگرد تو درکنار، استاد بھی کم ہی نگاہ رکھتے ہیں۔ رہیں اجتہادی صلاحیتیں تو ان کا پیدا کرنا سرے سے اس نظام تعلیم میں مقصود ہی نہیں، بلکہ شاید گناہ بھی ہے۔ اس لیے مجتہد تیار ہونے کا یہاں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"

اس لیے فقہ کی تعلیم میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ اسلامی فقہ کا پیش تر حصہ قرآن وسنت سے استنباط اور ان کی تعلیمات کے انطباق پر مشتمل ہے۔ اس لحاظ سے ماضی کی یہ کوششیں بڑی قیمتی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اس پر اپنے وقت کے حالات اور زمان ومکان کے احوال وظروف کا گہرا اثر ہے، جو بالکل فطری چیز ہے۔ ان میں آج کے بہت سے عصری مسائل کا حل موجود نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ عصری مسائل کے حل کے لیے قرآن کریم اور سنت رسول ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس غرض سے دینی مدارس کے طلبہ میں تخلیقی صلاحیت کی نشوونما کے لیے حسب حال فقہی نصاب ترتیب دیا جائے:

- اصول فقہ۔
- فقہی مسائل پر زیادہ زور صرف کرنے کے بجائے، زیادہ توجہ اصول فقہ پر دی جائے، تاکہ طالب علموں میں قرآن وسنت کی روشنی میں براہ راست فقہی مسائل حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔

علم تصوف:

اگر ہم دینی مدارس کے نصاب کا جائزہ لیں تو ہمارے ہاں اخلاق وتصوف کو بالکل بھی نصاب میں شامل نہیں کیا جاتا اگر ہم اپنی خانقاہوں کو دیکھیں تو وہ بھی الاماشاءاللہ علم تصوف واخلاق سے خالی دامن نظر آتے ہیں۔

۱. تصوف کی اہمیت کا اندازہ ہم اس قول سے لگا سکتے ہیں:
علم تصوف واخلاق کا جاننا اتنا ہی ضروری ہے کہ جتنا علم ظاہر کا جاننا۔

۲. امام مالکؒ نے فرمایا:

''من تفقه ولم يتصوف فقد تفسق ومن تصوف ولم يتفقه فقد تزندق ومن جمع بينهما فقد تحقق''(۱)

''جو فقہ میں ماہر ہوا اور تصوف سے بابلد رہا یقیناً فسق کا مرتکب ہوا اور جو تصوف ڈوب گیا اور فقہ سے بے بہرہ رہا وہ زندیق ہو گیا اور جس نے (فقہ و تصوف) دونوں کو اپنے اندر جمع کر لیا وہ حقیقت کر پا گیا۔''

امام مالکؒ کے اس قول سے پتہ چلتا ہے کہ علم و تصوف کی اہمیت کس قدر ہے تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ایسے نازک مواقع تاریخ اسلام میں کئی بار آئے۔ جب کفر والی داور فسق و مجود کی سیاہ گھٹلوں نے عالم اسلام کی فضا کو خوفناک حد تک گھمبیر کر دیا۔ لیکن اسلام چونکہ دین الہی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اپنے دین کی حفاظت کے انتظامات فرماتا ہے۔ حفاظت دین پر معمور ہونے والے خوش نصیب لوگوں میں سے اثریت طبقہ صوفیاء کی رہی ہے۔ جنہوں نے ہر باطل کو ہر سطح پر ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اسلام کی گرتی ہوئی ساکھ کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ یہ اتنی بڑی حقیقت ہے کہ دشمنانِ اسلام بھی اس سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتے۔ پروفیسر ایچ۔ آر۔ گب (H-R-Gibb) جیسے یورپی دانش ور کے یہ الفاظ اس سلسلے میں خاص طور پر قابل غور ہیں۔

''تاریخ اسلام میں بارہا ایسے مواقع آئے ہیں کہ اسلام کے کلچر کا شدت سے مقابلہ کیا گیا لیکن اسکے باوجود مغلوب نہ ہو سکا اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ صوفیا کا انداز فکر فوراً اس کی مدد کو آجاتا تھا اور اس کی اتنی قوت اتنی قوت و توانائی بخش دیتا کہ کوئی طاقت اس کو مقابلہ نہ کر سکی''(۲)۔

اسی طرح عصرِ حاضر کے معروف اور عظیم سائنس دان ڈاکٹر مارس بیوکائے کا یہ اعتراف بھی نا قابل فراموش ہے جو اس نے تہذیب مغرب کی تباہ کوریوں کے پیش نظر انسانیت کے مستقبل کے متعلق تنبیہ کرتے ہوئے اپنی مشہور کتاب ''بائبل'' قرآن اور سائنس میں کیا لکھتے ہیں:

''موجودہ سائنس کے تحت ہونے والی مادی ترقی نے انسانی دماغوں کو جس قدر ناپاک کر دیا ہے ان کو پاک کرنے کے لیے بڑی روحانی قوت کی ضرورت ہے اور وہ اسلام تعلیمات سے کیا حاصل ہو سکتی ہے۔''(۱)

[1] ملا علی قاری، علی بن سلطان محمد ہروی، (۲۰۰۱)، مرقاۃ المفاتیح، مکتبہ رحمانیہ، پاکستان۔ ج:۱، ص:۲۵۶

[2] H.A.R, Gibb, The influence of Islamic culture on Madieval Europe New york university 1955, page:265

مگر آج خانقاہیت ظواہر پرستی ارو نفس پرستی پر مبنی پیری مریدی نے اسلام کی روح کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اس کا ازالہ نہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ فطری اور عملی تصوف کو روحانی تربیت کے لیے دینی مدارس کے نصاب کا حصہ بنایا جائے تاکہ اس دور زوال میں امت مسلمہ کو پھر سے رازی، غزالی، رومی، جیلانی، ہجویری، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ جیسے مردان حق میسر آسکیں۔

علم سیاست

حضرت آدم علیہ السلام کرہ ارض پر انسانی سوسائٹی کے پہلے پیغمبر اور اللہ تعالی کے برگزیدہ رسول ہیں ان کی تخلیق کا قصہ اللہ تعالی نے یوں بیان فرمایا ہے

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾[۲]

"اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا نائب مقرر کرنے والا ہو"

اس سے صاف ظاہر ہے انسانیت کی تخلیق نظام کائنات کے چلانے کیلیے اور اللہ تعالی کے احکام کو نافذ کرنے کیلیے ہوئی ہے اس لیے انسانی سوسائٹی کے پہلے فرد کو اسکا ذمہ دار بنایا گیا ہے اور پھر اسکے بعد جس طرح اللہ کے خاص بندے انسانی معاشرے کی تربیت اور توحیدِ خداوندی کے کام میں رہے اسیطرح وہ انسانی وحدت اور اسکی ضروریات کے بہم پہنچانے کا کام بھی اللہ تعالی کیطرف سے نائب بن کر ادا کرتے رہے چنانچہ حضرت ابوھریرہ رض سے منقول ہے کہ نبی اکرمﷺ نے فرمایا:

''كانت بنوا إسرائيل تسوسهم الأنبياء''(۳)

"بنی اسرائیل کے سیاسی امور انبیاء کرام کے ہاتھوں میں ہوتے تھے"۔

علماء انبیاء کے وارث ہیں دین کو سمجھنے والے ہیں دینی اقدار اور اسلامی قوانین کا تحفظ سیاسی قوت میں ہے تو سیاست کے اصل حقدار علماء کرام ہیں۔کیونکہ علماء کے پاس قرآن وسنت کے علوم ہوتے ہیں اور وہ ان علوم کی روشنی میں قانون سازی کرسکتے ہیں بخلاف ان لیڈروں کی جن کے پاس دنیاوی ڈگریاں تو ہیں

[1] مارس بیوکائے،(۲۰۱۲)،بائبل، قرآن اور سائنس، سیالکوٹ، اداراۃ القرآن

[2] البقرہ،۲:۳۰

[3] البخاری، محمد بن اسماعیل،(۱۹۹۳)، الصحیح، دار لکتب العلمیہ بیروت، ج:۳، ص:۱۲۷۳، رقم:۳۲۶۸

لیکن دینی علوم سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں. اسلامی فلاسفر فلاسفر حضرت امام غزالی رح احیاءالعلوم میں سیاست کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں

''هي التاليف والتعاون والاجتماع على أسباب المعيشة وضبطها''(١)

"سیاست وہ تدبیر ہے جو زندگی کے وسائل اور انکے دائرے میں معاشرے کے افراد کے درمیان باہمی محبت، تعاون اور اتحاد پیدا کرے۔"

گویا کہ اصل مقصدِ سیاست، معاشرہ کا قیام و انتظام ، حقوق العباد کی ادائیگی کرنا اور کرانا ، لوگوں کے درمیان محبت و الفت اور خیر خواہی کی بنیاد پر بھائی چارگی اور امن قائم کرنا ہے جو اسلام کے مقاصد عالیہ میں سے ہے۔اسلام نہ صرف سیاست کے جواز کو مانتا ھے بلکہ اسکے اندر اپنے زرین اصول اور اس پر عمل کو بہت سارے انفرادی اعمال پر فضیلت دیتا ہے۔ دینی مدارس کے موجودہ نصاب میں سیاست کا کوئی حصہ بھی شامل نہیں کیا گیا اگر ہم سیاسی نظام پر نظر ڈالیں تو یہ بات اظہر من الشمس ہے آپ ﷺ نے ہی سیاسی نظام کی بنیاد رکھی آپ ﷺ نے یہ سب کچھ اس معاشرے می حقیقت بنایا جہاں اس سے قبل کسی باقدہ ریاست و مملکت، سیاسی نظام اور دستور و قانون کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے ایک ایسے انسانی معاشرے اور ریاست ک بنیاد رکھی جو علاقے، زبان اور نسل کی محدود وابستگیوں سے بالاتر تھی۔

اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے جو فطرت کے عین مطابق ہے۔ اسلام کے فطرت کے عین مطابق ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ نسل انسانی کی بقا اسلام کے اصول و ضوابط کی اتباع میں ہے اور ان اصولوں سے انحراف خودکشی کے مترادف ہے۔ تاریخ انسانی گواہ ہے کہ جس ملک و ملت نے بھی اسلام کا اقرار کرتے ہوئے یا بغیر اعلانیہ اقرار کے' اسلام کے آفاقی قوانین کی پابندی کی ہے ترقی و عروج اس کا مقدر رہا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا اسوہ حسنہ وہ واحد معیار ہے جو اسلام کے آفاقی اصولوں کی عملی تعبیر و تشریح ہے۔ سیرت نبوی ﷺ کا ہر گوشہ نسل انسانی کے لئے اپنے اندر رہنمائی کے ان گنت پہلو رکھتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے تحریک اسلام کے فروغ کے لئے دعوتی و تبلیغی' عسکری و جہادی' آئینی و دستوری اور سیاسی و معاہداتی مناہج کو اختیار فرمایا اور ان تمام تر اقدامات میں آپ کی جدوجہد کی غایت جو احقاق حق' ابطال باطل اور

---

[1] الغزالی، ابو محمد بن محمد، (١٩٨٨)، احیاء علوم الدین، دارالمعرفہ بیروت، لبنان۔ ١:١٣

غلبہ دین حق سے عبارت ہے موجود رہی۔ میثاق مدینہ آپ ﷺ کی سیاسی و معاہداتی اور آئینی و دستوری جدوجہد میں ایک نمایاں اور اساسی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

علمِ اقتصادیات

اسلام ایک دین فطرت ہے اس کے بنائے ہوئے اصول دائمی ہیں ان دائمی اصولوں کو اختیار کر کے انسان نمود نمائش سے پاک سادہ اور خوشحال زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اس کی نوعیت یہ ہے کہ زندگی سادہ گزرای جائے۔ نمود و نمائش سے پرہیز کیا جائے۔ دوسروں کے حقوق کا خیال رکھا جائے۔ دوسروں سے اخوت و تعاون کیا جائے۔ دوسروں کے حقوق کو پامال نہ کیا جائے۔ دولت سے اندھا دھند محبت نہ کی جائے۔ دولت کی تقسیم منصفانہ بنائی جائے۔ دوسروں پر صلہ رحمی کی جائے۔ حتیٰ کہ جانوروں پر ترس کھایا جائے مزدور کی اجرت پوری اور بروقت ادا کی جائے۔

> "اسلام کا معاشی نظام ایک ایسے ہمہ گیر فلسفہ پر قائم ہے جس کی بنیاد انصاف پر ہے جس کا مقصد حیات "ہم گیر انقلاب" ہے جس کا نظریہ عالمگیر اصلاح ہے جو صرف جسمانی نشوونما کا قائل نہیں بلکہ روحانی اخلاقی اقدار کے لیے کوشاں ہے جو صرف عبادات کو محض رسوم تک محدود نہیں کرتا بلکہ عملی نفاد کا قائل ہے جو صرف بدنی عبادات پر زور نہیں دیتا ہے بلکہ مالی عبادات کو ایک منظم' منضبط قانون پیش کرتا ہے یہ صرف عبادات کا ہی پابند نہیں بناتا بلکہ معاملات کی درستگی کا بھی حکم فرماتا ہے۔"[1]

آپ ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد سب سے پہلے وہاں کے معاشی نظام کو ٹھیک کیا کسی بھی ملک ادارے یا تنظیم کو چلانے کے لیے معاشیات کا جاننا ضروری ہے ہمارے مدارس میں پڑھنے والے طلبہ سود، تجارت، استراکیت، مضاربت، اجارہ داری یہ سب پڑھتے ہیں مگر عصر حاضر کے جدید تقاضوں کے مطابق نہیں پڑھایا جاتا ضرورت اس مدد کی ہے کہ طلبہ کو مختصراً بنیادی علم معاشیات (یعنی علم الفقہ کی وہ ابحاس جو معاشیات کے متعلق ہیں) ان کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق پڑھایا جائے تاکہ مدارس سے فارغ التحصیل طلبہ معاشرے میں جہاں کہیں تجارتی امور کو دیکھیں تو اس کو کہیں اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھال کر معاشرے کے سامنے پیش کر سکیں۔

[1] محمد جاوید اقبال، (۲۰۰۴)، اسلامی اقتصادیات، الائیڈ بک سنٹر، لاہور۔ ص:۴

نتیجہ

مدارس کے نظامِ تعلیم میں طلباء دینی علوم پر تو دسترس حاصل کر لیتے ہیں لیکن اس میں ایک کمی یہ ہے کہ زمانہ جدید کے علوم و مسائل کا یہ راہوراشعور نہ ہونے کی وجہ سے دور حاضر کے پیدا ہونے والے سوالات کا جواب مہیا کرنا اور اس کے لئے طریق استدلال اور طریق بیان کو وقت کے تقاضوں کے مطابق تشکیل دینا ممکن نہیں ہے۔

آج ہمارے ہاں تعلیم ایک باقاعدہ اور انتہائی نفع آور تجارت بن چکی ہے۔ اب استاد اور شاگرد کا رشتہ روحانی باپ اور بیٹے کا نہیں، بل کہ ایک دوکان دار اور خریدار، یا ایک صانع اور صارف کے رشتے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ آج بے مقصد اور بے جہت تعلیمی اداروں کا سیلاب ملک میں آیا ہوا ہے۔ ان اداروں کے فارغ التحصیل حضرات نہ معاشرے کے کسی کام کے ہیں اور نہ ملک و ملت کے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اسلامیات کی تعلیم کا کوئی ایسا نظام مرتب کریں کہ جس میں دو ضروریات کی تکمیل کا سامان پایا جاتا ہو۔ ایک تو مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ تعلیمی روایت کا تحفظ اور تسلسل، جس میں بر صغیر کے مسلمانوں نے بہت کچھ اضافہ کیا ہے، جس میں ایک طرف تعمق بھی ہے اور دوسری طرف وسعت بھی۔ جس میں یہ صلاحیت بھی موجود ہے کہ اسلامی ثقافتی اقدار کے تہذیبی و فکری وجود کو پوری طرح جلا بخشے اور اس کے ساتھ ساتھ اگر کوئی نئی چیز ملے تو اس کو اپنے مزاج کے مطابق اپنے نظام میں سمو لے۔ آج وسعت ظرفی کی اس روایت کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے اختصاص اور تعمق ضروری اور لازمی شرط ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ دوسری چیز جو ضروری ہے، وہ دور جدید کے تقاضوں کا صحیح اور متوازن احساس و ادارک اور اس کا مناسب جواب ہے۔ دور جدید کے جو تقاضے ہیں، دور جدید میں اسلام کو ایک کار فرما قوت بنانے کی جو مہم ہے، اس میں جہاں جہاں فکری صلاحیت اجاگر کرنے کی ضرورت ہے، وہ اس نئے مجوزہ اور منتظر نظام کے فارغ التحصیل حضرات میں ہونی چاہیے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے ہاں ایسے ماہرین معاشیات پیدا ہوں، جو دور جدید کے معاشی نظام کو اسلامی اصولوں کے مطابق استوار کر سکیں۔ ہمیں آج یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ایسے ماہرین ہمارے ہاں موجود نہیں ہیں۔ ہمیں ایسے قاضیوں اور ماہرین قانون کی ضرورت ہے، جو اسلامی فقہ میں گہری بصیرت کے ساتھ ساتھ جدید قانونی نزاکتوں اور آئینی پیچیدگیوں کو بھی خوب سمجھتے ہوں۔ آج ہمارے ہاں ہزاروں ایسے ماہرین پاکستان میں موجود ہیں، جو موجودہ نظام کو چلا

رہے ہیں، ان کے مقابلے میں شاید چند ماہرین قانون بھی ایسے نہیں ہیں، جو ایک طرف فکر اسلامی اور فقہ اسلامی میں کماحقہ تعمق رکھتے ہوں اور دوسری طرف جدید کے تقاضوں کو بھی یہ خوبی سمجھتے ہوں۔

ان سارے شعبوں میں، ان سارے کاموں کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایک نئے نظام کو وضع کریں اور وہ نیا نظام اساتذہ کرام بھی وضع کر سکتے ہیں، علما بھی وضع کر سکتے ہیں۔ میری دعا ہے، مجھے امید ہے کہ جس طرح تاریخ کے ایک دور میں اللہ تعالیٰ نے ملا نظام الدین سہالوی کو کھڑا کیا، پھر ایک دوسرے تاریخی مرحلے پر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو کھڑا کیا، پھر تیسرے مرحلے میں ندوہ کے بانی مولانا محمد علی مونگیریؒ کو کھڑا کیا، اور عصر حاضر میں شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کو کھڑا کیا جنہوں نے نہ صرف اُمتِ مسلمہ کو دینی تعلیم کا ایک ہمہ جہت نصاب تعلیم دیا بلکہ جامعہ اسلامیہ منہاج القرآن لاہور تیس برسوں سے اس نصاب تعلیم کا کامیابی سے چلا رہا ہے۔

تجاویز و سفارشات:

- تعلیمی منصوبہ بندی کا کام ایک مشن کا درجہ رکھتا ہے۔ جو صرف اصحاب فکر کے سپرد ہونا چاہیے۔
- بیوروکریسی ان تقاضوں کا ادراک نہیں کر سکتی۔ جو اس معاملے میں درپیش ہوتے ہیں۔
- اسی طرح نصاب سازی کا تدوین کتب اور دیگر انتظامی معاملات میں کلرکوں کی لسی سوچ خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔

خلاصہ بحث:

ہمارے ہاں تضادات پائے جاتے ہیں لہذا تعلیم کے معاملے میں بھی ابھی تک صحیح سمت دریافت نہیں ہو سکی۔ دیگر شعبوں کی مانند اس شعبے میں بھی ہم جذباتیت کی سطح سے اوپر نہیں جا سکے۔ شعبہ تعلیم پر جس قدر توجہ درکار ہے بدقسمتی سے ہم قومی سطح پر توجہ نہیں دے رہے جس حد تک توجہ دے رہے ہیں اس میں بھی کئی ذابیاں ہیں جن کا فوری تدراک ضروری ہے۔ یہ عہد سائنسی انکشیافات اور تکنیکی ایجادات کے باعث انسانی ذہن و تخیل کی میر العقول کرشمر سازیوں کا عہد ہے۔

ہم سائنس کے تخریبی عناصر کی ہزار خدمت کریں اور مہلک ہتھیایروں کی ایجاد کے سبب سائنسی علوم کو لاکھ برا کہیں لیکن ہم ان کے فروغ و ارتقا سے پیدا ہونے والی صورت حال سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ ہمیں تعلیمی حکمت عملی

میں ان کی روز افزوں اہمیت کو بہر حال ملحوظ رکھنا ہو گا اور اپنے آپ کو اس معیار سے قریب ترلانے کی سعی کرنا ہو گا۔ جو ان کے بے پناہ ترقی نے قائم کر دیا۔ ہماری مجموعی خوشحالی اور فارغ البالی کا دارومدار اسی سعی و جدوجہد پر ہے کہ ہم اپنی روحانی و دینی اساس کو برقرار رکھتے ہوئے سائنسی اور فنی میدان میں کس حد تک پیش قدمی کر سکتے ہیں حکمت و سائنس ہماری متاع گم گشتہ ہے۔ ہم ایک ایسی عظیم روایت کے امین ہیں جس میں جانب، کندی، مارابی، ابن سینا، رازی ہیں تو دوسری جانب امام غزالی، سید علی ہجویری، معین الدین چشتی اجمیری، رومی اور جامی وغیرہ ہیں۔

☆☆☆☆☆

تحفظِ جان۔ مقاصد شریعہ کے اطلاقی مطالعہ کے تناظر میں

Protection of life on perspective of applied study of objective of Shariah

☆ ڈاکٹر محمد ارشد

☆☆ حافظ احسن جاوید

ABSTRACT

Islamic Shariah has commanded the human beings on the basis of expediency and benefit. The expediency was based on protection of five things (Din, Life, Wisdom, Race and wealth). These called Maqasid-i-Shariah. Some new objectives were included in this indexing of objectives of Shariah. In Islam, many steps have taken to protect the life, therefor no life will be wasted. According to Quran-i-Haqeem "There is guarantee of life for you in retribution." Even in killing any Muslim by mistake, the blood money is imposed. Suicide is also prohibited in Islam. Islam also banned to kill children due to fear of poverty. Covid-19 is fatal disease which has caused more than 3 million people through the world. These numbers are increasing day by day. So several steps have been taken in the world and Pakistan to avoid Covid.

I. To use the masks, sanitizers, gloves
II. To provide the ventilators for effected peoples.
III.To stay in qrantina(isolation) of suspected or effected people.
IV. Vaccination to avoid the Covid.
V. To provide the food items during lockdown.
VI.To get these items from Non-Muslims.

In this article, the protection of life will be discussed in perspective of applied study of objectives of Shariah and Covid.

Keywords: Expediency, Objective of Shariah, Retaliation, Blood money, Isolation

مقاصد شریعت، مصالح مرسلہ، اسرار شریعت، معانی اور حِکم جیسے الفاظ سے تعبیر کیا جانے والا یہ تصور شروع ہی سے موجود رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جو احکام دیتے ہیں، ان سے انسان کی بھلائی مقصود ہے اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور ہم انسانوں سے کچھ غرض نہیں۔ انسانوں کے اخروی اور دنیوی مفادات سامنے کر انہیں جو احکام دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض کے بارے میں کتاب و سنت میں بتا دیا گیا کہ ان میں سے کیا فوائد ہوں گے۔ بعض احکامات کے فوائد تو بیان نہیں ہوئے مگر ان پر غور کرنے سے ان کے فوائد کو سمجھا جا سکتا ہے۔

☆ صدر شعبہ علوم اسلامیہ گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، منڈی بہاؤالدین

☆☆ ایم۔ فل اسکالر، شعبہ علوم اسلامیہ دی یونیورسٹی آف، لاہور

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی مطابق احکام شریعت کو موتیوں سے تعبیر کیا جائے تو مقاصد شریعت ان موتیوں کو پرو کر ہار بنانے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مقاصد شریعت کو جاننے سے ان کے مسائل میں حکم شریعت معلوم کرنے میں مدد ملتی ہے جن کے بارے میں کوئی حکم موجود نہیں ہے۔[۱]

مقاصد شریعت کی اصطلاح سب سے پہلے امام الحرمین جوینی (م ۴۷۸ھ) نے استعمال کی۔ اصول فقہ پر ان کی کتاب "البرھان" میں مقصد، مقاصد اور قصد کے الفاظ کثرت کے ساتھ کیے گئے۔ اجتہاد کے لیے مقاصد شریعت کا مؤثر استعمال ان کی دوسری کتاب "الغیاثی" میں کیا گیا۔ ان کے شاگرد امام غزالی (م ۵۰۵ھ) نے مقاصد شریعت کو باضابطہ شکل دے دی۔ مصلحت سے ہماری مراد مقصود شریعت کی حفاظت ہے اور شریعت مقصد خلق خدا کے سلسلہ میں پانچ چیزوں کی عبارت ہے وہ یہ ہیں ان کے حق جان، عقل، نسل اور مال کی حفاظت کرنے والی ہو وہ مصلحت شمار ہوگی اور یہ وہ چیز ہے جو ان بنیادوں کے لیے خطرہ ہو مفسدہ شمار ہوتی ہے۔ جیسے دور کرنا مصلحت قرار پائے گا۔[۲]

امام شاطبی نے "الموافقات" میں اس کو مزید صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور انہوں نے دوسری جلدی کا آغاز کتاب القاصد کے عنوان سے کیا ہے۔[۳]

اصولیین نے اپنی کتابوں میں مقاصد کی بحث بھی کی جیسے مذکورہ بالا سطور میں ذکر ہوا۔ مقاصد شریعت پر مستقل طور پر کتب لکھنے کا آغاز حَاکم ترمذی نے کتاب الصلاۃ و مقاصدھا، کتاب الحج و اسرارھا، اور کتاب العلل تحریر کر کے کیا۔ امام شاطبی نے "الموافقات" میں کتاب المقاصد کے نام سے باقاعدہ بحث کی تو مختلف اسکالرز نے ان کے نظریہ مقاصد کے حوالے سے اپنی تحقیقات کو پیش کیا۔ جیسے نظریۃ المقاصد عند الامام الشاطبی، قواعد المقاصد عند الامام الشاطبی، مقاصد شریعہ عند الامام الشاطبی، مقاصد الشریعۃ عند الشاطبی۔ عصر حاضر میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے مقاصد شریعت کے نام سے گراں قدر کتاب تحریر کی ہے۔

قواعدِ فقہیہ اور مقاصد شریعت

قواعد فقہیہ کو بھی علم مقاصد سے مناسبت ضروریہ ہے۔ اس فن میں امام قرافی (م ۶۸۴ھ)، امام جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) اور ابن نجیم (م ۹۷۱ھ) کا نام خاص طور پر لیا جاسکتا ہے۔ امام قرافی، عزالدین بن عبد السلام کے شاگرد تھے۔ اپنی کتاب "الفروق" میں انہوں نے مقاصد شریعت کا بھی ذکر کیا ہے۔[۱]

---

(۱) صدیقی، ڈاکٹر نجات اللہ، مقاصد شریعت: ۲

(۲) غزالی، ابو حامد محمد بن محمد، المستصفیٰ، دار الکتب العلمیۃ۔ ۱/ ۱۷۴

(۳) شاطبی، ابراہیم بن موسیٰ، الموافقات فی اصول الشریعۃ، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور۔ ۲/ ۹

پانچ بنیادی قواعد میں سے ایک الامور بمقاصدھا مقاصد کی اہمیت کو بیان کرتا ہے۔[۲]

اسی طرح للوسائل حکم المقاصد[۳] بھی مقاصد کی اہمیت کو بیان کرتا ہے

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے اضافے

شاہ ولی محدث دہلوی نے مقاصد شریعت کے باب میں کچھ نئے پہلو اجاگر کیے۔ان کے نزدیک حکم کی تعمیل کا ایک اعلیٰ اور ایک ادنیٰ معیار سامنے ہوتا ہے۔[۴]

مصارف کے باب میں بنیادی بات یہ ہے کہ چند مقاصد کو کلیدی اہمیت دی جائے گی جیسے لوگوں کی کفالت جو بڑھاپے میں، تنگ دستی یا اپنے مال سے دور ہونے کیوجہ سے ،کچھ کرنے سے معذور ہوں۔شہر کو کفار کے خطرے سے بچانے کے لیے کی حدود کی حفاظت،فوجیوں،اسلحے اور مدرگار اسٹاف کے اخراجات،شہر کے جملہ امور جیسے سیکورٹی،عدلیہ،شرعی حدود کا قیام ،بازار کی نگرانی ،انسانوں کے مشترکہ مفادات کا اہتمام جیسے دریاؤں کی درستگی اور پلوں کو درست کرنا۔[۵]

تیونس کے محمد طاہر بن العاشور نے عدل کو بھی مقاصد شریعت میں شامل کیا ہے۔[۶]

مراکش کے علال الفاسی کے مطابق عدل وانصاف، فکری آزادی اور نفسیاتی اطمینان وسکون کی ضمانت دینے کو مقاصد شریعت میں شمار کیا ہے۔[۷]

محمد مصطفیٰ زحیلی نے مقاصد شریعت کے تحت پانچ بنیادی مصالح کی فہرست میں نسل،نسب ،اور عزت وآبرو ایک خانے میں رکھ کر جزئیات خمسہ میں اخلاقیات کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔[۸]

---

(۱) قرافی، شہاب الدین احمد، الفروق، عالم کتب بیروت؛ علی احمد ندوی، القواعد الفقہیہ، دار القلم، دمشق

(۲) ۱. سبکی، تاج الدین، عبد الوہاب بن علی عبد الکافی، الاشباہ والنظائر، ۲/۴۷ دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، طبع ۲۰۰۱ء؛

۲. ابن نجیم، زین العابدین بن ابراہیم بن نجیم، الاشباہ والنظائر، ۲۷، ایچ۔ایم سعید کمپنی، کراچی

(۳) ملا علی قاری، علی بن سلطان، مرقاۃ المفاتیح، ۴/۱۲۹، مکتبہ امدادیہ، ملتان

(۴) شاہ ولی اللہ دہلوی، احمد بن عبد الرحیم، حجۃ اللہ البالغہ، دار المعرفۃ، بیروت لبنان، ۱/۹۵

(۵) حجۃ اللہ البالغۃ، ۲/۱۷۷

(۶) ابن عاشور، محمد الطاہر بن العاشور، مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ، تیونس، ۱۳۶۶ھ: ۱۸۸

(۷) مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ ومکارمھا، الدار البیضاء، ۱۹۸۳ء: ۷

(۸) صدیقی، ڈاکٹر نجات اللہ، مقاصد شریعت: ۲۰

مقاصد شریعت کی فہرست میں اضافے

ایک خیال کے مطابق مقاصد کی اور انہی فہرست نیچے کا نہ، دین، جان، عقل، نسل اور مال خود انہی وسعت ہے کہ بہت سے نئے مقاصد اس فہرست میں داخل سمجھے جاسکتے ہیں مثلاً عدل وانصاف دین میں، ازالہ غربت اور کفالت عامہ حفظِ جان میں شامل سمجھے جاسکتے ہیں نئے مقاصد جن کا ذکر ہوتا ہے۔(i)انسانی عزو شرف (ii)بنیادی آزادیاں (iii)عدل وانصاف(iv)ازالہ غربت وکفالت عامہ(v)سماجی مساوات اور دولت (vi)امن وامان(vii)بین اقوامی سطح پر باہم تعامل وتعاون[۱]

بہر حال اس آرٹیکل میں پانچ بنیادی مقاصد شریعت میں سے تحفظِ جان کے حوالے اسلامی تعلیمات میں ادویات اور پھر کرونا سے بچاؤ کے اقدامات کا جائزہ لیا جائے گا۔

احکام الٰہیہ۔۔۔بندوں کے مصالح کے لیے

اسلامی تعلیمات میں یہ بات واضح ہے کہ احکام الٰہیہ بندوں کے مصالح کے لیے وضع کیے گئے ہیں جیسے قرآن حکیم میں ہے:

(i)﴿رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾[۲]

ترجمہ:"رسولوں کو بشارت دینے والے اور ڈرانے والے بناکر آئے تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے لیے اللہ پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔"

اس مقام پر انبیاء کے تشریف لانے کے مقاصد کو بیان کیا گیا کہ انبیاء کی آمد کے بعد کسی شخص کو اللہ کی طرف سے دعوت کے نہ پہنچنے کا اعتراض باقی نہیں رہے گا۔

(ii) ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾[۳]

ترجمہ:"اور میں نے جن اور انسان کو اسی لیے پیدا کیا تاکہ وہ میری عبادت کریں۔"

---

(۱) صدیقی، ڈاکٹر نجات اللہ، (۲۰۰۹ء)، مقاصد شریعت، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔ ص ۲۱

(۲) النساء، ۴/ ۱۶۵

(۳) الذاریات، ۵۲/ ۵۶

اس آیت میں جنات اور انسانوں کی تخلیق کے مقصد کو بیان کیا گیا ہے اور مقصد عبادتِ الٰہی ہے۔

(iii)﴿ الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ﴾[1]

ترجمہ: "وہ ذات جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ وہ تمہیں آزمالے کہ تم میں سے کون اعمال کے اعتبار سے اچھا ہے۔ اس آیت میں زندگی اور موت کی تخلیق کا مقصد اچھے اعمال کے حوالے سے آزمائش ہے۔"

قرآن مجید نے کئی احکامات کی علتوں کو بیان کیا ہے جیسے

(vi)﴿مَايُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلَكِنْ يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ ﴾[2]

ترجمہ: "اللہ نہیں چاہتا کہ تمہارے اوپر کوئی تنگی ہو لیکن وہ تمہیں پاک صاف کرنا چاہتا ہے اور اپنی نعمت تمہارے اوپر پوری کرنا چاہتا ہے۔ اس آیت مبارکہ میں پانی کی عدم دستیابی کی صورت میں تیمم کی اجازت کی وجہ بیان فرمائی گئی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ تم پر تنگی نہیں چاہتا اور دوسری حکمت یہ ہے کہ تمہیں پاک صاف کرنا چاہتا ہے۔"

(v)﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾[3]

ترجمہ: "تمہارے اوپر روزے فرض کیے گئے جیسے تم سے پہلے لوگوں کو فرض کیے گئے تاکہ تم تقویٰ والے بن جاؤ۔ اس آیت میں روزوں کی فرضیت کا مقصد حصول تقویٰ بیان کیا گیا ہے۔"

(iv)﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ﴾[4]

ترجمہ: "بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔ اس آیت میں نماز کے مقصود برے کاموں سے روکنا ہے"۔ اسی طرح احادیث میں مقاصد کو بیان کیا ہے۔"

---

(۱) الملک،۶۷/۲

(۲) المائدہ،۵/۶

(۳) البقرۃ،۲/۱۸۳

(۴) العنکبوت،۲۹/۴۵

تحفظ جان اور اسلامی تعلیمات

اسلام میں تحفظِ جان کے حوالے سے بہت سے احکامات ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی اہمیت ہے۔

(ا)اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾ (۱)

"اور تمہارے لیے قصاص (خون کا بدلہ لینے)قصاص میں ہی زندگی اے عقل والو!تاکہ تم (خون ریزی سے)بچو۔"

اس آیت کی تفسیر میں قصاص کی حکمت اور فلسفہ کے بارے میں مختلف مفسرین کی آراء کا ذکر حسب ذیل ہے:

(i)امام رازی اس آیت مبارکہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ﴿أَمَّا فِي حَقِّ مَنْ يُرِيدُ أَنْ يَكُونَ قَاتِلًا فَلِأَنَّهُ إِذَا عَلِمَ أَنَّهُ لَوْ قَتَلَ قُتِلَ تَرَكَ الْقَتْلَ فَلَا يَقْتُلُ فَيَبْقَى حَيًّا، وَأَمَّا فِي حَقِّ مَنْ يُرَادُ جَعْلُهُ مَقْتُولًا فَلِأَنَّ مَنْ أَرَادَ قَتْلَهُ إِذَا خَافَ مِنَ الْقِصَاصِ تَرَكَ قَتْلَهُ فَيَبْقَى غَيْرَ مَقْتُولٍ، وَأَمَّا فِي حَقِّ غَيْرِهِمَا فَلِأَنَّ فِي شَرْعِ الْقِصَاصِ بَقَاءَ مَنْ هَمَّ بِالْقَتْلِ﴾(۲)

اور قاتل کے حق میں زندگی کے اعتبار سے ہے کہ جب اس کو علم ہے کہ اس نے قتل کیا تو اس کے بدلے اسے قتل کیا جائے گا سو وہ کسی کو قتل نہیں کرے گا سو وہ زندہ باقی رہے گا اور مقتول کے حق میں زندگی اس اعتبار سے ہے کہ جب کوئی اس کو قتل کرنے کا ارادہ کرے اور اس کو قصاص کا خوف ہو تو وہ اس قتل کو ترک کر دے گا سو نتیجۃً وہ قتل نہیں ہو گا اور دوسروں کے حق اس اعتبار سے کہ قصاص مشروع ہونے میں قتل کی ابتدائی ارادہ و سوچ رکھنے والے کی بقاء ہے۔

(ii)امام ابن کثیر اس آیت مبارکہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ﴿وَفِي شَرْعِ الْقِصَاصِ لَكُمْ وَهُوَ قَتْلُ الْقَاتِلِ حِكْمَةٌ عَظِيمَةٌ لَكُمْ، وَهِيَ بَقَاءُ المهَج وصَوْنها؛ لِأَنَّهُ إِذَا عَلِمَ القاتلُ أَنَّهُ يُقْتَلُ انْكَفَّ عَنْ صَنِيعِهِ، فَكَانَ فِي ذَلِكَ حَيَاةُ النُّفُوسِ﴾(۳)

(۱) البقرۃ،۲/۱۷۹

(۲) رازی، محمد بن عمر الملقب بفخر الدین، مفاتیح الغیب، دار إحياء التراث العربي-بیروت، طبع سوم، ۱۴۲۰ھ، ۵/۲۲۹

(۳)ابن کثیر، اسماعیل بن عمر بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم دار طیبۃ للنشر والتوزیع، طبع سوم، ۱۴۲۰ھ، ۱/۴۹۲

اور تمہارے لیے قصاص کی مشروعیت میں اور وہ قاتل کو قتل کرنا ہے اس میں بڑی حکمت ہے اور وہ انسان کو باقی اور محفوظ رکھنا ہے کیونکہ جب قاتل کو علم ہوتا ہے کہ اسے قتل کیا جائے گا تو وہ اس لیے رکتا ہے کیونکہ جب قاتل کو علم ہوتا ہے کہ اس کو قتل کیا جائے گا تو وہ اس غلط کام سے رکے گا تو اس میں جانوں کے لیے زندگی ہے۔

(iii)امام قرطبی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ﴿فَلَمَّا شَرَعَ اللَّهُ الْقِصَاصَ قَنَعَ الْكُلُّ بِهِ وَتَرَكُوا الِاقْتِتَالَ، فَلَهُمْ فِي ذَلِكَ حَيَاةٌ﴾ (۱)

سو اللہ تعالیٰ نے قصاص کو مشروع کیا تو تمام لوگ اس پر مطمئن ہو گئے اور باہم قتل کو ترک کر دیا سو اس میں ان کے لیے زندگی ہے۔

(iv) قاضی ثناء اللہ پانی پتی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ﴿ولكم في القصاص حيوة للباقين- وايضا في القصاص حيوة للقاتل في الاخرة فانه إذا اقتص منه فى الدنيا لم يؤاخذ في الاخرة فيحيى هناك حيوة طيبة﴾(۲)

اور تمہارے لیے قصاص میں باقیوں کے لیے زندگی ہے اور قصاص میں آخرت میں بھی قاتل کی زندگی ہے کیونکہ جب وہ دنیا میں قصاصاً قتل ہوا تو آخرت میں مواخذہ نہ ہوگا تو اس کو وہاں پاکیزہ زندگی ملے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ قصاص میں زندگی پنہاں ہے۔ جب قاتل کو قصاص کے طور پر اپنے قتل ہونے کا یقین ہو تو وہ قتل کرنے سے گریز کرے گا۔ اس طرح مقتول قتل سے محفوظ رہا اور قاتل کی زندگی بھی محفوظ رہی۔

(۲)اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ﴾ (۳)

"اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کو قتل کر دے مگر غلطی سے اور جس نے کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کیا تو اس پر ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا اور خون بہا (کی ادائیگی لازم) ہے جو مقتول کے گھر والوں کے سپرد کیا جائے۔"

---

(۱) قرطبی، محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، دار الکتب المصریۃ، القاہرۃ، مصر، طبع دوم ۱۳۸۴ھ، ۲/۲۵۶

(۲) پانی پتی، قاضی ثناء اللہ، التفسیر المظہری، مکتبہ الرشیدیہ، طبع ۱۴۱۲ھ، ۱/۱۸۵

(۳) النساء، ۴/۹۲

اس آیت کی تفسیر میں قتل خطاء کے احکامات اور دیت کی حکمتوں کو مفسیرین نے بیان کیا ہے:

(i)امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ﴿وَالْمَعْنَى أَنَّهُ لَيْسَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا الْبَتَّةَ إِلَّا عِنْدَ الْخَطَأِ وَهُوَ مَا إِذَا رَأَى عَلَيْهِ شِعَارَ الْكُفَّارِ، أَوْ وَجَدَهُ فِي عَسْكَرِهِمْ فَظَنَّهُ مُشْرِكًا، فَهَهُنَا يَجُوزُ قَتْلُهُ، وَلَا شَكَّ أَنَّ هَذَا خَطَأٌ، فَإِنَّهُ ظَنَّ أَنَّهُ كَافِرٌ مَعَ أَنَّهُ ما كان كافر﴾[1]

اور اس کا معنٰی یہ کہ مومن کسی مومن کو یقینا قتل نہیں کر سکتا سوائے خطاء کے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اس نے اس پر کفار کی علامت دیکھی یا ان کی فوجوں میں پایا اس لیے اس کو مشرک گمان کیا تو اس صورت میں اس کا قتل جائز ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ خطاء ہے کیونکہ اس نے اس کو کافر گمان کیا حالانکہ وہ کافر نہیں تھا۔

(ii) قاضی ثناءاللہ پانی پتی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ﴿لانه قتل لم يجب فيه القصاص فوجب الدية تحرّزا عن اهدار دم معصوم وايضا حكم جميعها وجوب الكفارة على القاتل وحرمانه عن الإرث﴾[2]

کیونکہ اس نے قتل کیا تھا اس میں قصاص لازم نہیں ہے سو ایک معصوم خون کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے دیت لازم ہوتی اور اسی طرح قاتل پر کفارہ لازم ہونا اور دیت سے محروم ہونا۔

(iii) امام جلال الدین اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ﴿أَيْ مَا يَنْبَغِي أَنْ يَصْدُر مِنْهُ قَتْل لَهُ {إِلَّا خَطَأً} مُخْطِئًا فِي قَتْله مِنْ غَيْر قَصْد {وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً} بِأَنْ قَصَدَ رَمْي غَيْره كَصَيْدٍ أَوْ شَجَرَة فَأَصَابَهُ أَوْ ضَرَبَهُ بِمَا لَا يَقْتُل غَالِبًا﴾[3]

اس سے قتل سرزد نہ ہو مگر قتل میں خطاء کرنے والا اور ارادہ نہ کرنے والا ہو اور جب مومن کو خطاء کے ساتھ قتل کیا بایں طور کہ اس نے کسی پر تیر اندازہ کا ارادہ کیا جیسے شکار یا درخت پر سو کسی شخص کو آلات یا اس کو اس آلہ چاقو سے مارا جس سے عام طور پر قتل نہیں کیا جاتا۔

---

(۱)رازی، مفاتیح الغیب، ۱۰/ ۱۷۵

(۲)التفسیر المظہری، ۲/ ۱۸۴

(۳)سیوطی، جلال الدین، عبد الرحمن بن ابی بکر، جلالین، تاج کمپنی کراچی، ۱/ ۱۷۷

یعنی ایسا آلہ یا ڈنڈا مارا یا پتھر مارا اور اس سے وہ شخص ہلاک ہو گیا تو یہ قتل خطاء شمار ہو گا کیونکہ عمداً قتل میں اس انداز سے قتل نہیں کیا جاتا۔

اس معلوم ہوا کہ غلطی سے بھی کسی مسلمان کو قتل نہ کیا جائے۔ غلطی سے کسی مسلمان کو قتل کرنے پر انسان کو بالکل بری الذمہ قرار نہیں دیا گیا بلکہ اس پر خون بہا لازم ہے تاکہ وہ اپنے افعال میں مزید محتاط ہو جائے تاکہ کسی بھی صورت میں انسان کا قتل نہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ دیت پورے قبیلے پر لازم قرار دی تاکہ تمام لوگ ایک دوسرے کو محتاط رویہ اختیار کرنے کی تلقین کریں اور غلطی سے بھی انسانی جان کو ضائع ہونے سے بچائیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ﴾[۱]

"اور تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔"

اس آیت کی تفسیر میں مفسیرین کی آراء حسب ذیل ہیں:

(i) امام شوکانی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ﴿بِاقْتِرَافِ الْمَعَاصِي. أَوِ الْمُرَادُ: النَّهْيُ عَنْ أَنْ يَقْتُلَ الْإِنْسَانُ نَفْسَهُ حَقِيقَةً﴾[۲]

اپنے آپ کو گناہوں کے ارتکاب سے نہ قتل کرو اور اس میں انسان کو اپنے آپ کو حقیقۃ قتل کرنے کی ممانعت بھی ہے۔

(ii) علامہ آلوسی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ﴿المراد به النهي عن قتل الإنسان نفسه في حال غضب أو ضجر﴾[۳]

اس سے مراد انسان کا غضب اور بوریت کی حالت میں اپنے آپ کو قتل سے منع کرنا ہے۔

---

(۱) النساء، ۴/ ۲۹

(۲) شوکانی، محمد بن علی، فتح القدیر، دار ابن کثیر، دمشق، بیروت طبع، ۱۴۱۴ھ، ۱/ ۵۲۷

(۳) آلوسی، محمود بن عبد اللہ، روح المعانی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، طبع اول، ۱۴۱۵ھ، ۳/ ۱۷

(iii)علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ﴿قیل معناه لا یقتل أحدکم نفسه عن ثابت بن الضحاك ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال من قتل نفسه بشیء فی الدنیا عذب به یوم القیامة ﴾[1]

اس کا معنیٰ یہ ہے کہ کوئی اپنے آپ کو قتل نہ کرے،ثابت بن ضحاک سے روایت ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے دنیا میں کسی چیز کے ساتھ اپنے آپ کو قتل کیا اس کو قیامت کے دن اس طرح عذاب دیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کا اپنے آپ کو قتل کرنا منع ہے خواہ اس کی وجہ کوئی بھی ہو۔جیسے غصہ ،بوریت،غربت،مایوسی۔

(۴)اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا ﴾[2]

"اور تم اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل مت کرو، ہم ہی انہیں (بھی) روزی دیتے ہیں اور تمہیں، بے شک ان کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔"

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کی مختلف آراء درج ذیل ہیں:

(i)علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ﴿ولا تَقْتُلُوا أَوْلادَكُمْ یعنی البنات کما کانوا یفعلون خَشْيَةَ إِمْلاقٍ مخافة الفقر نهاهم عن القتل وضمن لهم أرزاقهم ﴾[3]

اور تم اپنی اولاد یعنی بیٹیوں کو قتل نہ کرو جیسے وہ فقر کے خوف کے باعث کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل سے منع فرمایا اور اس نے (اللہ) ان کے لیے رزق کی ضمانت دی ہے۔

(ii)امام زحیلی اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے: ﴿تحریم وأد البنات أو قتل الأولاد: وَلا تَقْتُلُوا أَوْلادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلاقٍ ﴾[1]

---

(۱)التفسیر المظہری،۲/۸۹

(۲)بنی اسرائیل،۱۷/۳۱

(۳)التفسیر المظہری،۵/۴۳۶

(اس آیت کے تفسیری نکات میں سے ایک) بچیوں کوزندہ دفن کرنایا اولاد کو قتل کرنا حرام قرار دیناہے۔اور تم اپنی اولاد کو غربت کے خدشہ سے قتل نہ کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اپنی اولاد کو فقر یا کسی غیرت کے نام پر قتل کرنا اور اسی طرح کسی جرم کو چھپانے کے لیے بچوں کا قتل حرام ہے۔

(5)اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ﴾[۲]

"اور شخص اپنے ایمان لانے کے بعد کفر کرے، سوائے اس کے جسے انتہائی مجبور کر دیا گیا مگر اس کا دل(بدستور)ایمان سے مطمئن ہے۔"

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کی مختلف آراء حسب ذیل ہیں:

(i)امام رازی اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

﴿يجب هاهنا بَيَانُ الْإِكْرَاهِ الَّذِي عِنْدَهُ يَجُوزُ التَّلَفُّظُ بِكَلِمَةِ الْكُفْرِ، وَهُوَ أَنْ يُعَذِّبَهُ بِعَذَابٍ لَا طَاقَةَ لَهُ بِهِ، مِثْلَ التَّخْوِيفِ بِالْقَتْلِ، وَمِثْلَ الضَّرْبِ الشَّدِيدِ وَالْإِيلَامَاتِ الْقَوِيَّةِ﴾[۳]

یہاں پر اکراہ کا بیان واجب ہے جن پر کلمہ کفر کا لفظ جائز ہے اور وہ اس کا اس طرح عذاب دیناہے کہ اس کی کوئی طاقت نہ ہو جیسے قتل کی دھمکی اور شدید مار پیٹ اور سخت دردیں۔

(ii)امام قرطبی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

﴿أَجْمَعَ أَهْلُ الْعِلْمِ عَلَى أَنَّ مَنْ أُكْرِهَ عَلَى الْكُفْرِ حَتَّى خَشِيَ عَلَى نَفْسِهِ الْقَتْلَ، أَنَّهُ لَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنْ كَفَرَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ، وَلَا تَبِينُ مِنْهُ زَوْجَتُهُ وَلَا يُحْكَمُ عَلَيْهِ بِحُكْمِ الْكُفْرِ﴾[۴]

---

(۱)زحیلی، ڈاکٹر وھبہ بن مصطفیٰ، التفسیر المنیر، دار الفکر المعاصر، دمشق، طبع دوم ۱۴۱۸ھ، ۱۵/ ۶۷

(۲)النحل، ۱۶/ ۱۰۶

(۳)رازی، مفاتیح الغیب، ۲۰/ ۲۷۴

(۴)قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۱۰/ ۱۸۲

اہل علم اس بات پر اجماع ہے کہ جن کو کفر پر مجبور کیا تھا یہاں تک کہ اسے اپنی جان کا خدشہ ہو اس پر کوئی گناہ نہیں اگر وہ کفر کا ارتکاب کرے درانحالیکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو اور اس کی بیوی اس سے جدا نہیں ہوتی اور اس پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جان کو بچانے کے لیے کلمہ کفر بھی زبان پر لانے کی اجازت ہے بشرط کہ دل میں ایمان ہو۔

(٦) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ﴾(١)

"اس نے تمہارے اوپر صرف مرداراور خون اور خنزیر کا گوشت اور وہ جانور جس پر بوقت ذبح غیر اللہ کا نام پکارا گیا حرام کیا سو جو شخص مجبور ہو جائے نہ تو نافرمانی کرنے والا اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر (زندگی بچانے کی حد تک کھالینے میں) کوئی گناہ نہیں"

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کی وضاحت حسب ذیل ہے:

(i) علامہ ثناء اللہ پانی پتی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

﴿كان الاضطرار لاجل المخمصة او الإكراه او غير ذلك حل له أكلها بالإجماع غَيْرَ باغٍ حال اى أكل غير باغ للذة وشهوة وَلا عادٍ اى متجاوز قدر الحاجة فالحاصل انه لايجوز للمضطر الاكل منه الا قدر سد الرمق﴾(٢)

مجبوری بھوک کے باعث ہو یا اکراہ اور کسی ایک وجہ سے اس کا کھانا بالاجماع حلال ہے، غَيْرَ باغٍ حال ہے یعنی اس حالت میں کہ لذت اور شہوت کے لیے نہ کھائے،اور وَلا عادٍ یعنی حاجت سے زائدہ تجاوز نہ کرنے والا ہو۔سو حاصل یہ ہے کہ مجبور شخص کے لیے زندگی کی رمق باقی رکھنے کی مقدار کھانا جائز ہے۔

---

(١) البقرہ،٢/١٧٣

(٢) التفسیر المظہری،١/١٧٧

(ii) امام نسفی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ﴾: یعنی جو شخص بھوک سے بے حال اور بے قرار ہو کر ان میں کسی چیز کو بقدر ضرورت کھالے جب کہ وہ اللہ کے احکام سے بغاوت کرنے والا نہ ہو اور نہ قدر ضرورت سے زیادہ کھانے والا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔[۱]

(iii) پیر محمد کرم شاہ الازہری اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: اس اگر کوئی شخص مجبور ہو جائے اور اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے تو ان حرام چیزوں سے وہ بقدر ضرورت استعمال کر سکتا ہے۔[۲]

مذکورہ بالا بحث سے معلوم ہوا کہ مقاصد شریعہ میں سے ایک اہم مقصد تحفظ جان ہے۔ اس لیے شریعت نے جان کے تحفظ کے لیے بہت سے اقدامات کیے ہیں۔ شریعت نے انسان کو خود اپنی جان کو ضائع کرنے سے منع فرمایا اور اسی طرح اس کو دوسروں کی جانوں کے ضیاع سے بھی منع فرمایا ہے بلکہ شریعت نے جان بچانے کے لیے کلمہ کفر کہنے اور حرام اشیاء ضرورت کے مطابق کھانے کی بھی اجازت دے دی۔

کرونا وبا ایک جان لیوا مرض ہے اور اس سے دنیا میں بہت سی ہلاکتیں ہوئیں، اسی طرح پاکستان میں بھی ہلاکتیں ہوئیں۔ ان ہلاکتوں کی تعداد ۳۰ لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ یہ سلسلہ جاری ہے لہذا دنیا اور پاکستان میں بھی انسانی جان کو بچانے کے لیے حتیٰ الامکان کیے گئے جیسے

(i) کرونا پھیلاؤ کو کم کرنے کی ابتدائی ہدایات جیسے ماسک، سینی ٹائزر، گلوز کا استعمال۔

(ii) کرونا کے تحفظ کے لیے ویکسین

(ii) انتہائی متاثرہ افراد کے لیے ونٹی لیٹرز کی فراہمی۔ پلازمہ۔

(iv) متاثرہ افراد کے لیے قرنطینہ میں جانے کا اہتمام تاکہ دوسروں کی زندگیاں بھی محفوظ رہیں۔

(v) لاک ڈاؤن کے دوران جان بچانے کے لیے خوارک کی فراہمی۔

(vi) جان بچانے کے لیے ویکسین، ونٹی لیٹرز اور خوارک وغیرہ کا غیر مسلموں سے حاصل کرنا۔

---

(۱) مدارک التنزیل، ۱/ ۱۵۲

(۲) الازہری، پیر محمد کرم شاہ، ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، طبع پنجم، ۱۴۰۲ھ، ۱/ ۱۱۷

کرونا سے بچاؤ کے لیے ویکسین کا استعمال دنیا بھر میں جارہی ہے۔اس حوالے سے مختلف افواہیں ہیں ایک تو یہ کہ ویکسین کے بہانے جسم میں کوئی چپ لگائی جارہی ہے دوسری یہ کہ اس کے استعمال کے بعد انسان صرف دو سال زندہ تک رہے گا تیسری یہ کہ اس ویکسین میں حرام اجزا شامل ہیں۔اس حوالے سے دیکھ جائے تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب تک یقین نہ ہو افواہوں اور غیر مصدقہ خبر کو آگے بیان کرنے سے منع کیا گیا ہے اسی طرح قواعد فقہیہ ہے کہ یقین شک سے زائل نہیں ہوتا۔دوسری بات حرام اجزا کے حوالے سے ہے محض اس میں بھی افواہ والا معاملہ نہیں ہونا چاہے۔اگر حرام اجزا شامل بھی ہوں تو الضرورات تبیح المحظورات (ابن نجیم، الاشباہ والنظائر:۳) کہ ضرورتیں ناجائز کو مباح کردیتی ہیں اس لیے جان بچانے کے لیے اس کا استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ہاں اگر حرام اجزا کے بغیر ویکسین مارکیٹ میں موجود ہو تو پھر اس کا استعمال ہی بہتر ہے۔

احتیاط کے نام پر علاج اور خدمت سے اعراض درست نہیں

تحفظِ جان کے اقدامات کی ضرورت کا ذکر مذکورہ بالا کتاب وسنت کے دلائل کی روشنی میں ہوا مگر اس میں اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ڈاکٹر کرونا کے مریضوں کے علاج سے اعراز کریں تو یہ ان کے قتل / موت کا سبب بنے گا۔ صرف یہ بات ہے کہ احتیاطی تدابیر کے ساتھ علاج کیا جائے کہ یہ علاج ان کی زندگی کا سبب ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا﴾[1]

اسی طرح اپنے والدین یا قریبی رشتہ داروں کو بیماری کی حالت میں اعراضی درست نہیں ہے۔احتیاطی تدابیر کے ساتھ ان کی بیماری پرستی اور خدمت کے لیے موجود رہنا ان کی تسلی کا سبب بنتی ہے۔ان کی طرف توجہ نہ دینا ان کی موت کا سبب بن سکتا ہے۔اور تحفظِ جان اپنی ضروری ہے اس لیے احتیاطی تدابیر اختیار کریں۔اور ان مریضوں علاج اور خدمت میں رہیں یہ ان مریضوں کی تحفظِ جان کے لیے ضروری ہے۔

نتائج بحث:

اس آرٹیکل سے درج ذیل نتائج ثابت ہوئے

---

(۱)المائدہ،۵/ ۳۲

- شریعت کے مقاصد کو سمجھا کیونکہ احکامات کی بنیاد ان مقاصد پر ہے یہی بندوں کے اصل مصالح ہیں۔
- اصولیین نے اپنی کتب میں مقاصد کی بحث کا ذکر کیا ہے اور بعد ازاں انہوں نے مستقل تحریر بھی کیں۔
- مقاصد شریعت (دین، جان، عقل، نسل ،مال) میں تحفظِ جان کی اہمیت کتاب وسنت کی روشنی میں ہمارے سامنے آئی کہ اس کے لیے کلمہ کفر کہنے اور لقمہ حرام کی بھی اجازت ہے۔
- کروناوبا کے دوران تحفظِ جان کے لیے ہر ممکن کوشش اور اقدامات کیے جائیں۔

ضرورت ناجائز امور کو جائز بنا دیتی ہے۔لہذاویکسین میں اگر کوئی ناجائز اشیاء کے اجزاء شامل بھی ہو تو اس کا استعمال جائز ہے۔ہاں اگر حرام اجزاء کے بغیر ویکسین موجود ہو تو اسے ہی استعمال کیا جائے۔

☆☆☆☆☆

مصادر و مراجع

۱. القرآن الحکیم
۲. آلوسی، محمود بن عبداللہ، روح المعانی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، طبع اول، ۱۴۱۵ھ
۳. پانی پتی، قاضی ثناءاللہ، التفسیر المظہری، مکتبہ الرشیدیہ، طبع ۱۴۱۲ھ
۴. پیر محمد کرم شاہ، ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، طبع پنجم، ۱۴۰۲ھ
۵. رازی، محمد بن عمر الملقب بفخر الدین، (۴۲۰ھ)، مفاتیح الغیب، دار إحیاء التراث العربي-بیروت
۶. زحیلی، ڈاکٹر وھبہ بن مصطفیٰ، التفسیر المنیر، دار الفکر المعاصر، دمشق، طبع دوم ۱۴۱۸ھ
۷. غزالی، ابو حامد محمد بن محمد، المستصفیٰ، دار الکتب العلمیۃ۔
۸. قرافی، شہاب الدین احمد، الفروق، عالم کتب بیروت؛ علی احمد ندوی، القواعد الفقھیہ، دار القلم، دمشق
۹. ابن نجیم، زین العابدین بن ابراہیم بن نجیم، الاشباہ والنظائر، ۲۷، ایچ۔ایم سعید کمپنی، کراچی
۱۰. ملا علی قاری، علی بن سلطان، مرقاۃ المفاتیح، ۱۲۹/۴، مکتبہ امدادیہ، ملتان
۱۱. سبکی، تاج الدین، عبد الوہاب بن علی عبد الکافی، الاشباہ والنظائر، ۲/۴۷ دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، طبع ۲۰۰۱ء

۱۲. سیوطی، جلال الدین، عبد الرحمن بن ابی بکر، جلالین، تاج کمپنی کراچی

۱۳. شاطبی، ابراہیم بن موسیٰ، الموافقات فی اصول الشریعۃ، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور

۱۴. شوکانی، محمد بن علی، فتح القدیر، دارابن کثیر، دمشق، بیروت طبع، ۱۴۱۴ھ

۱۵. شاہ ولی اللہ دہلوی، احمد بن عبد الرحیم، حجۃ اللہ البالغہ، دارالمعرفۃ، بیروت لبنان

۱۶. صدیقی، ڈاکٹر نجات اللہ، (۲۰۰۹ء)، مقاصد شریعت، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

۱۷. ابن عاشور، محمد الطاہر بن العاشور، مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ، تیونس، ۱۳۶۶

۱۸. قرطبی، محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، دار الکتب المصریۃ، القاہرۃ، مصر، طبع دوم ۱۳۸۴ھ

۱۹. ابن کثیر، اسماعیل بن عمر بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم دار طیبۃ للنشر والتوزیع، طبع سوم، ۱۴۲۰ھ

اندلس میں مسلمانوں کے تاریخی کتب خانے

(ایک تاریخی اور تحقیقی جائزہ)

Muslims Historical Libraries in Spain
[An historical and analytical study]

شیخ محمد عطاء المصطفیٰ ☆

فائزہ حسن ☆☆

ABSTRACT

Today Spain (Andulus) is known as a historical region of the Islamic world that has been ruled by Muslims for 800 years ago. It was conquered by Tariq ibn Ziyad in 92 AH. On that days Baghdad, known as the center of knowledge in the world. Similarly, Andalusia (Spain) was the center of knowledge in the West. Muslims and non-Muslims from all over the world used to come there for getting their higher studies including Jews and Christians and when they returned to their homeland after acquiring knowledge, they were called famous scientists of their time and hometown. That's why Andalusia (Spain) is known as a Golden Era of Muslims. Today, millions of books and manuscripts of Muslim scientists are preserved in every European country. This is the same treasure of knowledge that the Muslims gave to this land as a gift during their caliphate and introduced knowledge to the people here. This article sheds lights to prove that the Muslims of that times were great scholars and they made great contribution to spread education and left behind their great literature in the shape of manuscripts

Keywords: Muslim, Education, Manuscript, Spain, Science

اندلس (موجودہ سپین) مسلمانوں کی تاریخی کا وہ سنہری دور ہے جس کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اس دور کے عظیم مسلمانوں نے جہاں علمی میدان میں اہم انقلابی امور سر انجام دیئے وہیں پر فنی علوم و فنون میں بھی اہم کردارادا کیا۔ موجودہ سپین اسلامی دنیا کا وہ تاریخی خطہ ہے جس پر مسلمانوں نے ۸۰۰ سال حکومت کی۔ طارق بن زیادؒ نے اس کو۹۲ھ میں فتح کیا۔ اس سے پہلے یہاں مسیحی سلطنت قائم تھی۔ لیکن وقتاً فوقتاً مسلمانوں نے اس کو علم کا مرکز و محور بنا دیا۔ بغدادجو اس وقت دنیا میں علم کے مرکز کے طور پر جانا جاتا تھا۔ اسی طرح مغرب میں اندلس علم کا مرکز تھا۔ پوری دنیا سے مسلم اور غیر مسلم یہاں علم حاصل کرنے آتے جن میں

☆ M.Phil scholar in Islamic Banking & Finance, Minhaj University Lahore
☆☆ M.Phil scholar in Islamic Banking & Finance, Minhaj University Lahore

یہودی اور عیسائی بھی کثرت سے ہوتے اور جب وہ علم حاصل کر کے اپنے وطن لوٹتے تو اپنے وقت کے نامور سائنسدان کہلاتے۔اسی وجہ سے اندلس کے دور کو مسلمانوں کا GOLDEN ERA کہا جاتا ہے۔آج یورپ کے ہر ملک میں مسلم سائنسدانوں کی کتب اور مسودات لاکھوں کی تعداد میں محفوظ ہیں۔ یہ وہی علم کا خزانہ ہے جو مسلمانوں نے اپنے عہد خلافت میں اس سر زمین کو تحفے میں دیا اور یہاں کے باشندوں کو علم سے روشناس کروایا۔ اس آرٹیکل میں ہم اندلس میں مسلمانوں کے سنہری دور کے متعلق کچھ حقائق وواقعات پیش کریں گے اور ثابت کریں گے کہ کس طرح مسلمانوں نے اپنی ثقافت، کلچر،علوم وفنون کے ہر میدان میں ترقی کی اور بعد میں آنے والے لوگوں نے کس طرح ان کی کتب اور علم وفن سے سرقہ کیا۔

تاریخی اعتبار سے سے اسپین اور پرتگال ایک ہی علاقہ شمار ہوتا تھا اس جزیرہ نما کو آئی بیریا (IBeria) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اندلس یورپ کے مغربی جنوبی حصے کی طرف واقع ہے اس کے اور افریقہ کے درمیان صرف بارہ میل کا سمندر جو بحر ظلمات کو بحر متوسط سے ملاتا ہے۔ درمیان میں حائل ہے اور اس کے مشرق کی طرف بحرمتوسطہ Midternin اور شمال کی جانب جبل البرتات pereniz جو کہ فرانس کو اندلس سے جدا کرتا ہے جبکہ مغرب کی جانب پرتگال اور بحر ظلمات اور جنوب کی طرف آبنائے طارق اور ملک افریقہ اس کی حدود کو ختم کرتے ہیں۔[1]

"اندلس" کی وجہ تسمیہ

لفظ "اندلس" جرمنوں کے ایک قبیلہ و اندال کے نام سے اخذ کیا گیا تھا جو کہ پانچویں صدی کے شروع میں مغربی روم کی بادشاہت کے حصے بخرے ہونے کے بعد جنوبی اسپین میں آباد ہوئے کیونکہ ظہور اسلام سے قبل اندلس پرواندالوں اور ویزگوٹوں نے حملہ کرکے پیرنز کی پہاڑیوں کو عبور کیا تھا اور کئی سالوں کی خانہ جنگی کے بعد واندال قبیلہ مغرب پر جبکہ ویز گوٹ قبیلہ اندلس پر قابض ہوگیا۔

لہذا بعض عرب مورخین نے اندلس کو عربی اور اکثر نے عجمی لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یاقوت حموی اس کو عجمی لفظ گردانتے ہیں:

(1) نواب ذوالقدر جنگ بہادر، خلافت اندلس، ص ۶۳، ۶۴، مقبول اکیڈیمی لاہور، س ن۔

''الأندُلس يقال بضم الدال وفتحها وهى كلمة عجمية لم تستعملها العرب فى القديم و إنما عرفتها العرب فى الاسلام و قد جرى على الالسن ان تلزم الالف والام''(۲)

''اندلس دال پر پیش اور زبر دونوں طرح پڑھا جاتا ہے اور یہ عجمی لفظ ہے اسلام سے پہلے عرب اسے استعمال نہیں کرتے تھے۔اسلام میں یہ لفظ متعارف ہوا الف اور لام کے ساتھ بولا جاتا ہے۔''

علاوہ ازیں اندلس کی وجہ تسمیہ کی بابت بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے بعض متقدمین اسے حضرت نوح علیہ السلام کے نسب نامہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

''انما سميت بأندلس بن طوبال بن يافث بن نوح لانه نزلها كما أن أخاه سبت بن يافث نزل العدوة المقابلة لها واليه تنسب سبتة''(۳)

''اس خطے کو اندلس بن طوبال بن یافث بن نوح کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کیونکہ وہ یہاں اقامت پذیر ہوا جیسا کہ اس کا بھائی سبت بن ثافث اس کے بالمقابل علاقے میں آباد ہوا۔''

لیکن دور حاضر کے محققین نے عرب کے مورخین کی اس توجیہ کو قابل قبول نہیں سمجھا بلکہ لفظ اندلس کی اصل جرمن قوم کے نام واندلس یاواندال بیان کی ہے۔ جبکہ عرب میں اسے اندلش لکھا جاتا ہے لیکن واندالوں کا اسپین کے ساتھ جو تعلق ہے اسکے متعلق مورخین کا نکتۂ نظر یہ ہے کہ سلطنت روم کی تقسیم کے بعد اندلس کے جنوبی حصے پر جس کو اہل روم بیٹیکا (Baetica) پکارتے تھے قابض ہوگئی تھی اور یہ قبضہ ۴۱۱ء سے ۴۳۲ء تک رہا۔ لیکن اس تھوڑے سے عرصے کے قبضے کے دوران قیاس یہ کیا جاتا ہے کہ صوبہ بیٹیکا کا نام والندال کی قوم پر واندا لکیا واندلیسیہ ہوگیا تھا اور غالبا اندلس لفظ اسی سے ماخوذ ہے۔ جبکہ کچھ لوگوں کے خیال کے مطابق جس علاقہ کو واندالیکیہ یا واندلسیہ کے نام سے پکارتے تھے اس سے مراد صرف ایک بندرگاہ ہے جس کا پرانا نام ترادکتا یا ترانس دکتا تھا اور اسی جگہ سے واندال قوم تاخت و تاراج کرتی ہوئی جہازوں پر سوار ہو کر ساحل افریقہ کی طرف گامزن ہوئی۔ لہذا اس میں کوئی شک اور کلام نہیں کہ آئی بیریا یا ہسپانیہ کے لئے اندلس کا نام فتوحات عرب سے شروع ہوا۔

جبکہ یاقوت حموی اندلس کا حدود اربعہ بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

---

(۲) حموی، أبو عبد الله ياقوت بن عبد الله، معجم البلدان، ج ۱، ص ۲۶۲۔

(۳) المقری،احمد بن محمد التلمساني،(۱۹۶۸ء)،نفع الطيب من عضن الاندلس الرطيب،بيروت، لبنان، دار صادر۔ ج ۱، ص ۱۲۵

''هی جزيرة ذات ثلاثة أركان مثل شكل المثلث قد أحاطه بها البحران، المحيط والمتوسط وهو... والركن الثانی شرقی الاندلس بين مدينة اربونة ومدينة برديل''(۴)

''یہ جزیرہ مثلث کی شکل میں تین ارکان یا اضلاع پر مشتمل ہے اور اسے دو سمندروں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے جو کہ بحر محیط اور بحر متوسط ہیں اور دوسرا ضلع مشرقی اندلس ہے جو کہ سمندر کے ساتھ خلیج کی صورت میں ہے جو اربونہ شہر اور منورقہ کے درمیان ہے۔''

المختصر اندلس ایک جزیرہ نما ہے جس کے تینوں اطراف سمندر اور ایک طرف شمال میں جبل البرانس یا پیر نیز کا طویل پہاڑی سلسلہ ہے۔ اس سلسلے کو کہیں جبل البرتات، جبل البقات اور کسی جگہ جبل الابواب اور کہیں جبل الفاصل یا جبل الماجز تحریر کیا گیا ہے۔ اندلس کی جغرافیائی تقسیم کے اعتبار سے اگر ہم جغرافیہ دانوں کی تحریروں کو بنظرِ غائر دیکھیں تو علامہ مقری نے اسپین کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

''واعلم أن جزيرة الأندلس أعادها الله للإسلام مشتملة على موسطة وشرق وغرب.

فالموسطة فيها من القواعد .... قرطبة وطليطلة وجيان وغرناطة والمرية ومالقة.

وأما شرق الأندلس ففيه من القواعد مرسية وبلنسية ودانية والسهلة والثغر وسرقسطة.

وأما غرب الأندلس ففيه إشبيلية وماردة وأشبونة وشلب فمن أعمال إشبيلية شريش.''(۵)

''معلوم ہونا چاہئے کہ جزیرۂ اندلس جسے اللہ تعالی دوبارہ اہل اسلام کو لوٹا دے، یہ تین صوبوں پر مشتمل ہے:

مرکزی صوبہ: جس کے اہم قصبے قرطبہ، طلیطلہ، جیان، غرناطہ، مریہ اور مالقہ ہیں۔

مشرقی صوبہ: جس کے اہم علاقے مرسیہ، بلنسیہ، دانیہ،سہلہ،الثغراور سرقسطہ ہیں۔

مغربی صوبہ: جو اشبیلیہ، ماردہ، اشبونہ اور شلب وماردۃ اور شریش کے علاقوں پر مشتمل ہے''(۶)

---

(۴) حموی، ابو عبد اللہ یاقوت بن عبد اللہ، معجم البلدان، ج ۱، ص ۲۶۲، ۲۶۳۔

(۵) المقری، احمد بن محمد التلمساني،(۱۹۶۸ء)، نفع الطیب من غصن الاندلس الرطیب،بیروت، لبنان، دار صادر۔ ج ۱، ص ۱۶۵، ۱۶۷

(۶) المقری، احمد بن محمد التلمساني،(۱۹۶۸ء)، نفع الطیب من غصن الاندلس الرطیب،بیروت، لبنان، دار صادر۔ ج ۱، ص ۱۶۵، ۱۶۷

مسلمانوں سے قبل اندلس کی سیاسی، مذہبی اور رفاہی حالت

قبل از ولادت باسعادت حضرت عیسیٰ سے جو اقوام اسپین میں آکر متمکن ہوئیں جنھوں نے اسکے چمن زاروں کی آبیاری کی ان میں سے چند ایک نام تاریخ نے محفوظ کر لئے سوائے فینیقیوں کے جو شام کے گرد و نواح سے آئے تھے، باقی تمام اقوام اسپین کی ہی رہنے والی تھیں اور وہ بھی مشرقی یا وسطی یورپ سے اٹھ کر آئیں تھیں۔ تاریخ کے صفحات کو ٹٹولیں تو پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے سلٹ قوم نے ہی اندلس کو اپنا مسکن بنایا تھا اس کے بعد آئی بیری، لگوری، فنیقی قوموں کے نام ملتے ہیں۔ پھر قرطاجنہ والوں نے ۲۴۷ قبل مسیح میں دیگر اقوام کو مغلوب کرکے اسپین میں اپنی سلطنت و بادشاہت قائم کی اور غالبا اسی دوران یونانی بھی اس میدان میں سرگرم نظر آتے ہیں لیکن ان کی مادی ترقی و حکمرانی کے متعلق تاریخ کے صفحات خاموش ہیں تاہم اس کے بعد ہم رومنوں کو یہاں پاتے ہیں قرطاجنہ والوں نے رومنوں کی پیش قدمی کو بڑی پامردی سے روکنا چاہا لیکن یہ ان کے بس کا روگ نہ تھا لہذا پیونک کی تیسری اور آخری لڑائی میں جو ۱۴۹ قبل مسیح سے لے کر ۱۴۶ قبل مسیح تک لڑی گئی اس میں قرطاجنی بری طرح شکست سے دو چار ہوئے۔

تاریخی تناظر میں اگر ہم دیکھیں تو رومن کئی برس تک بڑی شان و شوکت سے حکمرانی کرتے نظر آتے ہیں۔ آگسٹس کے زمانہ میں ملکی تقسیم کے اعتبار سے اندلس تین صوبوں لوسی ٹینا، بیٹکا اور مٹراکونس میں تقسیم تھا۔ بالخصوص رومیوں کے دور میں بڑے بڑے نامور فلسفی، مکالمہ نگار اور شاعر پیدا ہوئے جن کے نام رومی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جاتے ہیں رومی سلطنت کے کمزور ہوتے ہی اندلس خود مختار اور نو آبادیاتی حصوں میں بٹ گیا چنانچہ پریڑاگونا میں ایک خود مختار حکومت نے رومیوں کا مقابلہ کیا۔ البتہ عرب مورخین کے بقول اشبان میں طیطس کا نام آتا ہے جس نے اسپین میں فوج جمع کرکے بیت المقدس پر حملہ کیا اور وہاں سے مائدہ سلیمان لایا۔ اس کا دار الحکومت اشبلیہ کے قریب اشبانیہ تھا۔ اس خاندان میں پچپیں سلاطین گزرے ہیں جن کے نام عرب مورخین نے گنوائے ہیں۔ پھر اس کے بعد ایک قوم یشتولیان آئی۔ طویش بن منبطہ اس کا پہلا فرماں روا تھا اس خاندان کے ستائیس فرماں رواؤں نے حکومت کی، ان کا دار الحکومت ماردہ تھا غالباً انہی قوموں کو مغربی مورخین شیوانی والانی یا سوایو اور الین کے ناموں سے یاد کرتے ہیں یہ وہ جرمن وحشی قومیں تھیں جنھوں نے اخیر زمانہ میں قوت پکڑ لی تھی یہ لوگ کبھی رومیوں کے باج گزار رہے اور کبھی خود سری سے حکومت کرتے رہے۔(۷)

---

(۷)ریاست علی ندوی، مولانا، تاریخ اندلس، ص ۵۸، ۵۹، علی فرید پرنٹر لاہور، ۲۰۰۳ء۔

علاوہ ازیں جرمن وحشی قوموں نے لاطینی اقوام سے مل جل کر رومی تمدن اختیار کیا اور لاطینی زبان کو اپناکر اور دیوتاؤں کو چھوڑ کر عیسائی مذہب قبول کر لیا اور حکومت کرنے لگے۔

پانچویں صدی عیسوی میں ایک نئی قوم گاتھ جس کو عرب مورخین قوطہ کہتے ہیں اندلس میں وارد ہوئی اور انہوں نے یہاں شیواہ اور الانی حکومتوں کو ۴۱۹ء میں ختم کرکے جنوبی اسپین سے لے کر فرانس میں دریائے لوئر Loir تک حکمران بن گئے گاتھک حکمرانوں کو اندلس میں زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ یورپ کے بحر بالٹک کے کناروں سے یعنی کہ جرمنی کے علاقوں سے ونڈال کی قوم اٹھ کر فرانس سے گزرتی ہوئی اسپین میں داخل ہوئی اور تقریباً بیس برس حکمرانی کرکے اپنے نام پر اس جنوبی حصہ کا نام واندالیکیہ مشہور کرکے افریقہ چلی گئی اور ادھر پورے اسپین میں گاتھک حکومت قائم ہوگئی۔

اگر ہم مذہبی حوالے سے اندلس کو چھٹی صدی عیسوی میں دیکھیں تو یہاں "کیتھولک مذہب کا دور دورہ نظر آتا ہے جس میں پادریوں کے اقتدار میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا اور وہ سیاہ و سفید کے مالک بن گئے اور کئی مواقع پر شاہ اندلس بھی ان کا دست نگر رہنے لگا اور اس صورتحال میں ایک نئی کشمکش شروع ہوگئی لیکن پادریوں کے اقتدار کو زوال نہ آیا۔ (۸)

کلیساء کے پادری جاہ پسند اور اقتدار کے بھوکے تھے ملکی اقتدار پر ان کا قبضہ تھا وہ تنگ نظر اور انتہائی متعصب تھے۔ دوسرے مذاہب کے لوگوں بالخصوص یہودیوں سے بڑا ظالمانہ سلوک کیا جاتا تھا ۶۱۴ھ میں ایک فرمان کے ذریعے یہودیوں کو نہ صرف مذہب چھوڑنے کی پاداش میں جلاوطنی دی گئی بلکہ ان کی جائیدادوں کو ضبط کرنے کا حکم بھی صادر کیا گیا۔ ان فرمان کے نتیجہ میں نوے ہزار یہودیوں نے اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائیت قبول کی۔ الغرض مذہبی تعصب اور تنگ نظری نے غیر عیسائی عوام اور مظلوم طبقات کو کسی نجات دہندہ کی تلاش پر مجبور کر دیا۔(۹)

جب مسلمان اندلس میں بطور فاتح وارد ہوئے تو اس سے قبل اندلس میں مذہبی حالت دگرگوں تھی۔ محمد احمد زبیری رقمطراز ہیں:

> "اسپین میں مسلمانون کے داخلہ سے پہلے تین مذاہب عیسائیت، بت پرستی اور یہودیت تھے، گاتھوں میں عیسائیت کی تبلیغ چوتھی صدی عیسوی میں ہوئی ان میں اور رومیوں میں جب پہلی، آویزش ہوئی اس

---

(۸)ریاست علی ندوی، مولانا، تاریخ اندلس، ص ۶۰۔

(۹) محمد طفیل، پروفیسر، تاریخ مسلم اندلس، ص ۱۶، مطبع ہاشم انٹرپرائز پرنٹرز لاہور ۲۰۰۳ء۔

وقت گوتہ مذہباً بت پرست تھے۔ چوتھی صدی میں گوتھک زبان میں بائبل کا ترجمہ کیا گیا اور چوتھی صدی کے ختم ہونے سے پہلی پوری قوم مسیحیت قبول کر چکی تھی۔"(۱۰)

اندلس میں اگرچہ مسلمانوں کے داخلہ سے قبل وہاں کے حکمرانوں کے درمیان جنگ و جدل اور باہمی مناقشت عام شیوہ زندگی تھا۔ اکثر اقوام کی جنگ میں کبھی غالب اور کبھی مغلوب ہوتی رہیں لیکن وہاں کی آبادی کی فلاح و بہبود کے لئے حکمرانوں کی کاوشیں تاریخ کے اوراق میں کم نظر آتیں ہیں۔

لیکن اندلس کی سرزمین کے متعلق جغرافیہ دانوں نے نہایت تعریفانہ کلمات تحریر کئے ہیں۔ وہاں کی آب و ہوا اور سرزمین نہایت معتدل ہے بحوالہ الرازی اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں نقل ہے:

"اندلس اقلیم چہارم کا مغربی سرا ہے اور یہ ملک پانی اس کے متعدد دریاؤں اور میٹھے پانی کے چشموں سے لبریز ہے اور مسلمانوں کے قبضے سے ذرا پہلے مغربی قوطیوں کے عہد میں اندلس کی آبادی ایک لاکھ تھی اور آبادی کا گنجان ہونا وہاں کے ارتفاع عام حالت آب و ہوا، زمین کی زرخیزی اور اس کی آب پاری کے ممکنات پر منحصر تھا۔"(۱۱)

اندلس میں رفاہی کاموں کے متعلق احسان الحق سلیمانی، "مسلمان یورپ میں" تحریر کرتے ہیں:

"رومن قوم کا یہ عہد شباب تھا جب انہوں نے پیونک کی تیسری اور آخری لڑائی میں قرطاجنوں کو شکست دی اور نظم و نسق سنبھالنے کے بعدانھوں نے ذرائع آمد و رفت کو بہتر بنایا اور زراعت و باغبانی کو ترقی دی ملک میں جگہ جگہ سیر گاہوں کا وجود، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر اور عبادت گاہوں کا قیام اس بات پر شاہد ہے کہ اس عہد کا اسپین فربہ حال اور دولت مند تھا ٹریجن اور تھیوڈوسس ایسے شاہان ذی شان نے جہاں اپنی تلوار سے ایک دنیا کو رام کیا وہاں علوم و فنون کی سرپرستی بھی کی، سنیکا (فلسفی) لوشٹن، (مکالمہ نگار) اور مارشل (شاعر) اس عہد کی ممتاز شخصیتیں ہیں جن پر اسپین بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔"(۱۲)

جبکہ اہل روما کی ترقی کے متعلق نواب ذوالقدر جنگ بہادر رقمطراز ہیں:

---

(۱۰) محمد احمد زبیری، اندلس میں علم حدیث کا ارتقاء، ص ۲۵، مطبع زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۷ء۔

(۱۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب، لاہور، ج ۱، ص ۳۲۸، ۳۳۲۔

(۱۲) احسان الحق شیخ، سلیمانی، ایم۔اے، مسلمان یورپ میں، ص ۲۲، لاہور، پاکستان، قومی کتب خانہ ۱۹۵۴ء۔

"اہل روما کے زمانہ میں جو فروغ اور رونق اس ملک کو حاصل ہوئی وہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ تمام ملک سر سبز و شاداب اور شہروں سے آباد تھا۔"(۱۳)

اندلس میں زرعی ترقی کے حوالے سے اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں تحریر ہے:

"آج کل کی طرح اس زمانے میں بھی سپین میں بارانی اور آب پاش شدہ اراضی میں فرق موجود تھا اول الذکر اناج کی کاشت کے لئے مخصوص تھیں اندلسی گیہوں کی بعض اقسام مثلا (طلیطلی گیہوں) خاص طور پر مشہور تھیں غلہ پیسنے والے یا تو گھوڑوں سے چلنے والی چکیاں استعمال کرتے تھے یا پن چکیاں۔ ملک کے وسیع خطے خصوصاً اندالوسیہ اور اقلیم الشرف کے علاقے زیتون کے درختوں سے ڈھکے ہوتے تھے اور روغن زیتون کی صنعت کی یہاں ہمیشہ گرم بازاری رہی دوسری بارانی فصلوں کی طرح انگور کی کاشت بھی بظاہر وسیع پیمانے پر ہوتی تھی اور آب پاری کی سادہ ترین صورت یہ تھی کہ چھوٹی چھوٹی نہروں کا ایک جال بچھا دیا گیا تھااندلس کے پھلوں میں شاہ دانے سیب، ناشپاتی، بادام، انار اور سب سے بڑھ کر انجیر کی بہت سی اقسام موجود تھیں اور ساحلی علاقوں میں گنے اور کیلے جیسی فصلوں کی کاشت بھی کی جاتی تھی۔ خوشبودار جڑی بوٹیوں کے ساتھ ساتھ ان پودوں کی کاشت بھی خاصے پیمانے پر ہوتی تھی جن سے کپڑے بنتے تھے یعنی ایک طرف زعفران معصفر، زیرہ، کشنیز، مجیٹھ اور حنا کی اور دوسری طرف سن اور کپاس کی، ریشم کی پیدوار کے لئے غرناطہ اور بجیرہ روم کے درمیان کا حصہ خصوصا معروف تھا۔ جغرافیہ نویسوں نے اپنے بیانات میں سواری بار برداری اور کھیتی باڑی کے جانوروں اور ان کی پرورش کے ذکر میں بڑے اختصار سے کام لیا ہے جن کا گوشت کھایا جاتا تھا، چراگاہوں کے قیام کے ساتھ ساتھ شہد کی مکھیاں پالنے کا بھی رواج تھا تاکہ شہد حاصل ہوسکے۔ علاوہ ازیں اندلس کے جنگلات سے شہری ضرورتیں پوری کی جاتی تھیں خصوصا کوئلے کی، صنوبر کے درخت جو مسیتہ کے کنارے پر بڑی تعداد میں تھے کاٹے جاتے تھے اور اس سے شہتیر اور جہازوں کے مستول بنائے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں اگر ہم اندلس کی معدنیات کو دیکھیں تو قدرت نے اس سرزمین میں بیش بہا خزانے چھپا رکھے تھے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش زمانہ قدیم سے جاری رہی۔"(۱۴)

---

(۱۳) نواب ذوالقدر جنگ بہادر، خلافت اندلس، ص ۶۴۔

(۱۴) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب لاہور، ص ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷۔

تاریخ کی کتب کی اگر ہم ورق گردانی کریں تو یہ بات واضح دکھائی دیتی ہے کہ رومیوں کے زوال کے بعد گاتھ قوم تخت شاہی پر متمکن ہوتی ہے یہ وہ قوم تھی کہ جب اندلس میں داخل ہوئی تو اس میں وحشی پن سے لبریز، خونخواریت، علم و دن سے نا آشنا اور آداب و مراسم سے ناواقف، طریق جہاں بانی سے نابلد کے علاوہ تدبیر سے کوسوں دور تھی اس کے متعلق احسان الحق سلیمانی رقمطراز ہیں:

تاریخ کا یہ معجزہ ہے کہ وہ قوم جس نے سیاست مدن کی پرخار وادی میں اب تک قدم بھی نہ رکھا تھا اندلس میں ایک نئے ضابطہ اخلاق، ایک جدید تمدن اور ایک مخصوص طرز تعمیر کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب ہوگئی گاتھ قوم میں چونکہ اخذ و جذب کی قوت موجود تھی اس لئے انہوں نے لاطینی قوموں سے بہت جلد استفادہ کیا انہوں نے جلد ہی علاقوں کو فتح کرکے وہاں کی زراعت و فلاحت کی طرف توجہ دی بنجر اور ویران زمینوں کو زیر کاشت لانے کے لئے آبپاشی کے نئے طریقے آزمائے جن سے زمین کی گود ہری ہوگئی۔ کاروان تمدن آگے بڑھا سیر گاہوں اور تھیٹروں کی بنیاد پڑی رہنے بسنے کے طریقے اور کھانے پینے کے ڈھب بدلے۔ میل جول کے آداب میں نفاست پیدا ہوئی اور رقص و سرود کی محفلیں منعقد ہونے لگیں۔(۱۵)

جبکہ گاتھ کے دور کی علمی و تمدنی ترقی کے حوالے سے ایک صاحب رقمطراز ہیں:

"وزی گاتھ کے زمانہ میں اندلس کی علمی، تمدنی و صنعتی ترقیاں اپنے دور کے لحاظ سے اوج کمال پر تھیں تعمیرات میں گاتھک طرز آج بھی شہرت رکھتا ہے مسلمان فاتحین کے بقول دولت کی فراوانی سے ان میں صرف دولت کے مختلف طریقے رائج تھے اور وہ عیش و تنعم کی اعلی زندگی گزارنے کے عادی تھے۔"(۱۶)

مسلمان جب اندلس کی سرزمین پر پہنچے تو اندلس کی تمدنی چکا چوند نے ان کو بہت متاثر کیا ایک سرکردہ فوجی افسر کے خیالات اس ملک بارے میں کچھ یوں ہیں:

"آسمان اور زمین کی خوبصورتی میں وہ ملک شام سے مشابہ ہے آب و ہوا کی لطافت میں یمن سے اور خوشبویات میں ہند سے وہ اپنی زرخیزی میں مصر کا ہمسر ہے اور بیش بہا فلزات میں چین کا۔"(۱۷)

---

(۱۵) احسان الحق سلیمانی، مسلمان یورپ میں، ص ۲۴۔

(۱۶) ریاست علی ندوی، مولانا، تاریخ اندلس، ص ۶۱۔

(۱۷) ا۔احسان الحق سلیمانی، مسلمان یورپ میں، ص ۲۴۔

علاوہ ازیں جب گاتھ سلطنت مستحکم ہوئی تو انہوں نے ملک میں صنعت و حرفت کی طرف توجہ دی تاکہ عوام الناس خوشحال ہو اور ملکی ترقی میں اضافہ ہو۔

"قوم گوتھ نے صنعت و حرفت اور جہاز سازی و سوداگری میں بھی ترقی کے زینے طے کئے اور رومیوں کے ہی فن تعمیر کو قائم رکھا بلکہ اس میں بھی ترقی کی۔"(۱۸)

اندلس میں فراہمی کتب اور تصنیف و تالیف کا انقلابی دور:

یہ دور عبد الرحمن الناصر کے جانشین الحکم ثانی سے شروع ہوتا ہے۔ جو عالم اسلام کے علماء میں سے بڑا عالم تھا۔ الحکم اور اس کے بھائی عبد اللہ نے اپنے والد کی زندگی میں لائبریریاں قائم کی تھیں۔ الحکم نے ان لائبریریوں کو شاہی لائبریری میں مدغم کر کے اس کے حجم میں بڑا اضافہ کر دیا۔ وہ کتابوں کا دلدادہ تھا اس کے کارندے دنیائے اسلام میں ہر کہیں مخطوطات یا ان کی نقلیں حاصل کرتے پھرتے تھے۔ قرطبہ کی ایک ادیب اور قاموس نگار محمد بن ابی الحسین فہری اور ایک دوسرے عالم محمد بن معمر کو حکم ثانی نے فراہمی مقطوطات اور نادر کتب کی نقول تیار کرنے پر مقرر کیا تھا۔(۱۹)

یوسف البلوطی، ابو الفضل بن ہارون، عباس بن عمرو اور ظفر بغدادی نقل نویسی پر معمور تھے۔ فراہمی کتب کیلئے بیرونی فضلا اور وراقین کی خدمات بھی حاصل کی گئی تھیں جن میں مصر کا ابن سابان، بغداد کا ابن یعقوب الکندی اور محمد بن طرحان حکم ثانی کی لائبریری کیلئے کتابیں فراہم کرتے تھے۔(۲۰)

مشرق میں جو کتابیں تصنیف ہوتی تھیں ان کا علم اسے فضلاء مشرق سے بھی پہلے ہو جاتا تھا اور وہ کتاب کا پہلا نسخہ حاصل کرنے کیلئے مصنفین کو گراں قدر انعامات دیا کرتا۔ اس زمانہ میں عراق میں ابو الفرج الاصبہانی اپنی تصنیف ”کتاب الآغانی“ مرتب کر رہے تھے جب الحکم کو معلوم ہوا تو اس نے کتاب کا پہلا نسخہ حاصل کرنے کیلئے الاصبہانی کے پاس ایک ہزار دینار بھیجے۔(۲۱)

۲۔کانڈے عرب اسپین میں، ج۱، ص ۵۲۔

(۱۸) سید محمد احمد، تاریخ سپین، ص ۸۵، لاہور، آر۔آر۔پرنٹرز بند روڈ، ۲۰۱۰ء۔

(۱۹) ابن الابار، التکملۃ لکتاب الصلۃ، نشر الثقافۃ الاسلامیۃ القاہرہ ۱۹۵۶ء، ۱:۱۰۶ الضبی احمد بن عمیرہ، بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال اھل الاندلس، طبع کودیرا اور ہپیرا، ۱۸۸۴، ص ۶۱

(۲۰) ۱. المقری، احمد بن محمد التلمسانی، (۱۹۶۸ء)، نفع الطیب من عضن الاندلس الرطیب، بیروت، لبنان، دار صادر۔ ۲:۷۶

۲. ابن الآبار، الحلۃ السیراء ۱:۲۰۲

(۲۱) ۱. المقری، احمد بن محمد التلمسانی، (۱۹۶۸ء)، نفع الطیب من عضن الاندلس الرطیب، بیروت، لبنان، دار صادر۔ ۱:۲۵

اس طریقے سے حکم کی لائبریری قرون وسطیٰ کی سب سے بڑی لائبریری بن گئی۔ اس کی لائبریری میں ۴ لاکھ کتابیں جمع ہو گئی تھیں۔ جن کی فہرست 44 جلدوں پر مشتمل تھی اور ہر جلد کے 50 صفحات صنعت شاعری کی کتابوں کیلئے مختص تھے۔(۲۲)

جبکہ مصر کے شاہی کتب کانے میں العزیز کے زمانے میں قرطبہ کے شاہی کتب خانے سے نصف یعنی ۲ لاکھ کتابیں تھیں۔ بغداد کے سرکاری کتب خانے میں کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ المستنصر باللہ (آخری دوسرا خلیفہ) کی لائبریری میں صرف ۸۰ ہزار کتابوں کا ذخیرہ تھا۔

جبکہ اس کے 400 سال بعد فرانس کے شاہ عاقل نے اپنے دار الحکومت میں ایک لائبریری قائم کی جس میں وہ صرف 900 کتابیں جمع کر سکا۔(۲۳)

خولیان ریبرا حکم ثانی کے کتب خانے کے بارے میں رقم طراز ہے:

"جس عمارت میں الحکم کا کتب خانہ تھا وہ کچھ عرصے کے بعد ناکافی ہو گئی تو الماریوں میں کتابیں ایک دوسرے کے اوپر رکھ دی گئیں یہاں تک کہ مزید گنجائش نہ رہی چناچہ کتب خانہ دوسری جگہ منتقل کرنا پڑا۔ اس کتب خانے کی عظمت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ اس کے منتقل کرنے میں چھ ماہ لگ گئے جب کہ خاصی تعداد میں لوگ مسلسل کام میں لگے رہے۔" (۲۴)

الحکم نے نہ صرف اتنی بڑی تعداد میں کتابیں جمع کی تھیں بلکہ ان کتابوں میں سے اکثر کا اس نے مطالعہ بھی کیا تھا اور ہر کتاب پر مصنف کی تاریخ ولادت اور وفات اور اس کی زندگی سے متعلق کسی عجیب واقعہ کے علاوہ جابجا حواشی بھی لکھے۔ جس کی وجہ سے بعد کے زمانے کے محققین کی نگاہ میں ان مخطوطات کی قیمت دوچند ہو گئی۔(۲۵)

۲۔ ابن الآبار، الحلۃ السیراء، ۱:۲۰۱

(۲۲) ا۔ المقری، احمد بن محمد التلمسانی، (۱۹۶۸ء)، نفع الطیب من غصن الاندلس الرطیب، بیروت، لبنان، دار صادر۔ ۱:۲۵

۲۔ ابن الآبار، الحلۃ السیراء، ۱:۲۰۱

(23) S.Imam Din, A political History of Muslim Spain, Dacca 1961, P.179

(24) Julian Ribera, Bibliography of muslim in spain, p: 20

(۲۵) گستاؤلیبان، تمدن عرب، مقبول اکیڈمی لاہور، ص ۳۹۹

قرطبہ میں علمی مراکز اور کتب خانے

الحکم نے قرطبہ کو ایک ایسی علمی مارکیٹ میں تبدیل کر دیا تھا جہاں ہر ملک کی علمی اور ادبی تخلیقات دستیاب تھیں۔ قرطبہ میں 20 ہزار کتب فروشی کی دکانیں تھیں۔ بیشتر کتب فروشی اپنے اہتمام سے کتابوں کی نقول تیار کرواتے تھے۔(۲۶)

ملک کے تمام اہم شہروں میں پبلک لائبریریاں قائم کی گئی تھیں جو سرکاری خرچ پر چلتی تھیں صرف قرطبہ شہر میں 70 پبلک لائبریریاں تھیں جن میں ابن فطیس کی لائبریری سب سے بڑی تھی جس میں ہر وقت چھ نساخ نقول تیار کرنے کا کام کرتے تھے۔ اس کتب خانے کے مہتمم شہر کے ایک بڑے عالم تھے۔ اس کتب خانے کی ضخامت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب یہ خاندان اسے فروخت کرنے پر ہوا تھا تو ۴۰ ہزار دینار میں یہ کتب خانہ فروخت ہوا۔
خواتین میں عائشہ بنت احمد بن محمد بن قادم، راضیہ نجم، خدیجہ بنت جعفر التیمی کے ذاتی کتب خانے تھے۔(۲۷)

عام لوگ اور کم آمدنی والے لوگ بھی اپنی آمدنی سے بچت کر کے کتابیں خریدتے تھے۔ امراء اور رؤساء بڑی بڑی لائبریریوں کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے تھے اور اس بات پر فخر کیا جاتا کہ فلاں شخص کے پاس فلاں نساخ کی لکھی ہوئی فلاں کتاب موجود ہے جو کسی دوسرے کے پاس نہیں ہے۔(۲۸)
قرطبہ کی شاہی اور نجی لائبریریوں کی بربادی کے بعد بھی بارہویں صدی میلادی تک قرطبہ میں اندلس کے دوسرے شہروں کی نسبت زیادہ کتابیں موجود تھیں۔ ابن رشد نے قرطبی اور اشبیلیہ کا باہمی تقابل کرتے ہوئے کہا ہے اگر اشبیلیہ میں کوئی عالم فوت ہو جائے تو اس کی کتابیں قرطبہ کی مارکیٹ میں فروخت کیلئے لائی جاتی ہیں اور اگر قرطبہ میں کوئی مغنی مر جائے تو اس کے آلات طرب اشبیلیہ کے بازاروں میں فروخت ہوتے ہیں۔(۲۹)
اسلامی عہد میں اندلس میں تعلیم عام ہو گئی تھی۔ تعلیم کے مختلف درجات تھے۔ پرائمری سطح پر قرآن حکیم، عربی زبان کے منتخب ادب پاروں، خطوط نویسی، انشاپردازی اور عربی گرائمر کی تعلیم دی جاتی تھی۔(۳۰)

---

(۲۶)۱. المقری، ۱:۲۵۶،

۲. ابن الابار، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ، (س-ن)، الحلۃ السیراء، دار المعارف، بیروت۔ ۱:۲۰۱

(27) Mc Cabe, Splendour of Moorish in Spain, London 1935 P.81

(۲۸) ابن بشکوال، خلف بن عبد الملک، الصلۃ فی تاریخ ائمۃ الاندلس، مکتب نشر الثقافۃ الاسلامیۃ القاہرہ ۱۹۵۵ء ۱:۲۹۷-۳۰۰، ۲:۶۵۴-۵

(۲۹) المقری، الحلۃ السیراء، ۱:۳۰۲

(۳۰) المقری، الحلۃ السیراء، ۱:۳۰۲

اندلس کی ہر بڑی بستی میں کئی مدارس تھے جن میں ثانوی تعلیم کا انتظام تھا۔ صرف قرطبہ میں حکم ثانی نے 27 ایسے مدارس قائم کیے جن میں مفت تعلیم کا انتظام تھا۔(۳۱)

قرطبہ(Córdoba) ،اشبیلیہ(Seville)،ملاغہ (Málaga)، سرقسطہ(Zaragoza) اور جیان (Jaén)میں اعلیٰ تعلیم کی یونیورسٹیاں تھی۔(۳۲)

جہاں بالعموم بلا معاوضہ تعلیم دی جاتی تھی۔ اکثر اساتذہ کو حکومت کی طرف سے مشاہرے ملتے تھے اور نادار طلبہ کی کفالت بھی حکومت کرتی تھی۔ ان جامعات میں حدیث، تفسیر، ادبیات، تاریخ، سائنس اور فلسفہ کے علوم پڑھائے جاتے تھے۔

حکم ثانی کے عہد میں جامعہ قرطبہ کو جو عبدالرحمن الناصر کی بنائی ہوئی مسجد میں قائم کی گئی تھی دنیا کے تعلیمی اداروں میں نمایاں مقام حاصل ہو گیا تھا۔ یہ جامعہ قاہرہ کی جامعۃ الازھر ار بغداد کی جامعہ نظامیہ دونوں سے شہرت میں سبقت لے گئی تھی۔ یہاں نہ صرف اندلس کے مسلمان طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے بلکہ یورپ، ایشیا اور افریقہ سے بھی تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھانے کیلئے یہاں آتے تھے۔(۳۳)

حکم ثانی کے عہد میں اندلس کا عام ثقافتی معیار اتنا بلندی پر پہنچ چکا تھا کہ ڈوزی لکھتا ہے۔

”اسپین کے تقریباً ہر آدمی کو لکھنا پڑھنا آتا تھا اور یہ اس زمانے کی بات ہے جب جن مسیحی یورپ بس علم مبادیات ہی جانتا تھا اور یہ مبادیات بھی بڑی حد تک گنتی کے اراکین کلیسا جانتے تھے۔“ (۳۴)

خلیفہ حکم ثانی کا کتب خانہ اور ذوق مطالعہ:

خلیفہ حکم ثانی کو مطالعہ کا اس قدر شوق تھا کہ اس کی رائل لائبریری میں 4 لاکھ کتب تھیں۔ اس لائبریری کے بک شیلف خوشبودار لکڑی کے تھے، اس کے کمروں کی چھت پر دیدہ زیب بیل بوٹے اور فرش سنگ مرمر کا تھا۔ ریڈنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں درجنوں کی تعداد میں کاتب، جلد ساز اور نقاش دن رات کام میں مصروف رہتے۔ قرطبہ میں 70 پبلک لائبریریاں بھی تھیں، کتابوں کے خاص بازار تھے، جہاں سناروں کی دکانوں سے زیادہ ہجوم رہتا تھا۔ معلمولی ملازم، غلام بلکہ ہجڑے بھی مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔

---

(31) Cambridge Medieval History, London 1942 III: 434 Dozy, Spanish Islam London 1931, 455.

(32)Ameer Ali, A short History of the Saracens London 1955 p.577.

(33) Hitti, P.K. History of the Arabs, Edinburgh 1968 p. 530.

(34) Spanish Islam, p.455.

اس زمانے میں کتابوں کا شوق جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ ہر پڑھا لکھا فرد کتابوں کو جمع کیا کرتا تھا۔ چناچہ پبلک لائبریریوں کے علاوہ لوگوں کے گھروں میں بے شمار نجی کتب خانے ہوتے تھے۔ قرطبہ کے متمول لوگوں کے عالی شان بنگلوں میں ذاتی کتب خانے ہوتے تھے۔ علماء وزرا، امرا اور سلاطین کی ذاتی لائبریریاں ان کے علاوہ تھی۔ اندلس کے ایک وزیر ابو جعفر احمد بن عباس نے تقریباً 4 لاکھ کتب جمع کی ے تھیں، خلفائے فاطمی کی لائبریری میں تقریباً 6 لاکھ کتب تھیں، اسی طرح عباسی خلیفہ کے محل میں بہت بڑی لائبریری تھیں جس میں کتابوں کی تعداد 4 لاکھ تھی۔(۳۵)

خلیفہ الحکم کے دور میں اہل علم کے وارے نیارے ہوئے۔ اندلس کا ہر فقیہ محدث فلسفی، عالم اور شاعر شاہی خزانے سے وظیفہ پاتا۔ الحکم نے بستی بستی درسگاہیں کھول دیں، تعلیم مفت تھی ہر درجہ کا شہری اعلیٰ تعلیم مفت حاصل کر سکتا تھا۔ تحقیقات کیلئے حکومت کی طرف سے مفت سہولیتیں مہیا کی جاتیں، تجرباہ گاہوں اور کتب خانوں کی وسیع پیمانے پر سہولت موجود تھی، اہل علم لوگوں کو بڑے بڑے انعام ملتے اور وظائف بھی مقرر تھے۔

اسکوریال کا کتب خانہ:

اندلس کے علوم وفنون کے متعلق مسلمانوں کا ایک عظیم کتب خانہ جو اسکوریال میں قائم تھا سقوط غرناطہ کے بعد اہل ہسپانیہ نے نہایت بے دردی سے اسلامی کتب کی توہین کی۔ عالم یہ تھا کہ جب وہ کُتب نظر آتش کی جارہی تھیں تو کچھ لالچی لوگوں نے اس سنہری کام کو آگ سے نکال لیا تھا جو ان کتب کی جلدوں پر کیا ہوا تھا کافی مدت کے بعد مراکش کے ایک صاحب علم و ذوق بادشاہ نے ملک شاہ سے ان کتابوں کو منگوایا جو تین جہازوں پر سمندر کے راستے لائی جارہی تھیں جنہیں سمندری قزاقوں نے لوٹ لیا اور بہت زیادہ کتب تباہ کر دیں جو باقی بچ گئی تھیں انہیں اسکوریال نامی ایک محل میں رکھوادیا گیا جو میڈرڈ سے تقریباً 25 میل کے فاصلے پر واقع تھا لیکن وہاں بھی آگ بھڑک اٹھی اور تین چوتھائی ذخیرہ کتب نذر ہوگئی جو محفوظ رہیں ان کو شمار کیا گیا تو وہ 1,850 کتب تھیں۔ جو آج تک وہاں موجود ہیں اور نادر و نایاب شمار ہوتی ہیں۔ اہل علم حضرات اسکوریال کے ذخیرہ کتب کو نہایت قیمتی گردانتے ہیں۔

اس کے برعکس مسلمانوں کے ہاتھ جو گاتھ قوم یا ہسپانیہ کی کتابیں اور آثار آئے، انہیں مسلمانوں نے اپنی جانوں سے زیادہ عزیز جان کر محفوظ کر لیا اور اہل ہسپانیہ کے حوالے کر دیا۔ ہسپانوی علم جو بھی ذخیرہ وہاں آج موجود ہے ،وہ مسلمانوں کی بدولت ہی موجود ہے جبکہ ہسپانیہ والوں نے مسلمانوں کے ذخیرہ کو صرف تعصب کی بناء پر تباہ کر دیا تھا۔

---

(۳۵) ارشد صدیقی، مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج، ص:۳۹

مسلمانوں کے اندلس پہنچتے ہی کاغذ کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا اور اندلس کے ہر علم کے عالم نے اپنی استعداد کے مطابق کتابیں لکھیں۔ غیر ممالک سے بھی خصوصاً اسلامی ممالک سے کتابیں اندلس پہنچنا شروع ہو گئیں جہاں سے یہ مشرقی علوم پورے یورپ سے بھجوائے گئے یہی وجہ ہے کہ یورپین عالم فاضل لوگ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اندلس کے جغرافیہ دان زمین کے گول ہونے پر زور دیتے رہے اور اندلس ہی کے لوگ کولمبس سے پہلے امریکہ جاتے رہتے تھے مگر وہ اپنے اس سفر کی تشہیر نہیں کرتے تھے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کولمبس نے اندلسی ملاّحوں کی رہنمائی میں امریکہ کا سفر کیا تھا۔(۳۶)

اندلس کے مسلمانوں کے علمی کارنامے:

جو علوم مسلمان عرب سے اپنے ساتھ لائے تھے ان سے اندلس کے لوگوں نے بہت فائدہ حاصل کیا اور ان کے علمی ذوق پر ہمیشہ عرب کی چھاپ قائم رہی۔ اندلس کے حکمران خاندان بنو امیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے پیش نظر حضور ﷺ کی یہ حدیث مبارکہ رہتی تھی کہ "علم دو ہیں، ا۔ علم الادیان ۲۔ علم الابدان" اسی وجہ وہ سب فروغ علم ور اشاعت تعلیم پر زیادہ توجہ دیتے تھے ابتداء میں جو مدارس قیم کئے گئے تھے وہ صرف مسلمانوں کیلئے مختص ہوتے تھے لیکن ہشام کے دور میں سرکاری خرچ پر یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے بھی مدارس قائم کئے گئے اور سرکاری مدارس میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم بھی علم حاصل کرتے تھے۔

ابتدائی دور میں جب بنو امیہ کی حکومت تھی تو صرف قرطبہ یونیورسٹی سے مدارس کا الحاق کیا جاتا تھا جسے بعد میں وسعت دے کر غرناطہ، اشبیلیہ اور طیطلہ جیسی مشہور یونیورسٹیوں تک بڑھا دیا گیا تھا۔ عبدالرحمن ثالث کے دور میں اتنی علمی ترقی ہو چکی تھی کہ صرف قرطبہ میں 70 لائبریریاں موجود تھیں۔ ہزاروں دکانیں صرف کتب فروشی کیلئے قائم ہو گئی تھیں اور کتب فروش کے پیشے سے منسلک افراد کی تعداد 20,000 سے تجاوز کر چکی تھی۔

علم کی توسیع و ترقی میں سب سے زیادہ سے کردار قرطبہ یونیورسٹی نے ادا کیا تھا اس کی تعمیر عبدالرحمن الداخل نے شروع کی تھی اور اس کی تکمیل ہشام کے دور میں ہوئی جبکہ عبدالرحمن ثالث کے علاوہ عبدالرحمن ثانی نے بھی اس کی توسیع کا فریضہ سرانجام دیا اس میں مندرجہ ذیل علوم کی تعلیم دی جاتی تھی قرآن پاک، حدیث شریف، طب و جراحت، ادویہ سازی، ہیت و نجوم، فلسفہ، ریاضی، تاریخ و جغرافیہ، ادب، زراعت اور صنعت و حرفت۔

ہر علم کیلئے الگ الگ شعبے قائم تھے جن میں بلند پایہ اور قابل ترین اساتذہ لیکچر دیتے تھے۔ یہاں کے فارغ و تحصیل طلباء کو اسناد دی جاتی تھیں یورپ نے اس یونیورسٹی سے بہت فائدہ حاصل کیا اس میں کام کرنے والے عملے کی

(۳۶) نعیم صدیقی، تاریخ اسلام، ص:۸۴۳

تعداد 11,000 تھی۔ طب و جراحت کے شعبے پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی آخری دور میں طلیطلہ یونیورسٹی کا درجہ کا بہت بڑھ گیا تھا۔(۳۷)

مشرق میں وسطی ایشیا سے لے کر مغرب میں اسپین تک جتنے بھی اسلامی شہر تھے وہ سب علم کے مرکز بن گئے تھے مثلاً بغدا، کوفہ، بصرہ، موصل، واسط، سامرہ، دمشق، حمص، سقلان، اصفہان، ہمدان، کرمان، نیشاپور، بلخ، طبرستان، سجستان، قزوین، خوارزم، جرجان، بحرین، بلاد یمن، مڈر، تیونس، ، مراکش، بلاد اسپین، قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ، طلیطلہ وغیرہ یہ علمی سرگرمیاں دینی اور سماجی کے ساتھ فطری علوم کے ساتھ بھی تھیں۔دینی علوم میں فقہ، حدیث، تفسیر، سیرت، علم الرجال، تاریخ، لغت نگاری اور صرف و نحو وغیرہ شامل تھے۔ فطری علوم میں کیمیا،طبیعات، حیاتیات ، ارضیات، ریاضی، فلکیات، میڈیسن،اور جغرافیہ وغیرہ۔

مسلمانوں کے دور میں درس و تدریس کا اس قدر زورو شور تھا کہ ہزاروں لوگ بیک وقت علماء کی مجالس میں شریک ہوتے ۔ طلبہ کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ بقول مشہور امریکی مورخ Will Durant جغرافیہ دانوں ، منجموں، فقہیوں، محدثوں، طبیبوں اور حکیموں کے ہجوم کے باعث سڑکوں پر چلنا مشکل تھا۔(۳۸)

پورے عالم اسلام میں ہر مسجد کے ساتھ مدرسہ تھا جہاں ہزاروں طلبہ ہر وقت علم حاصل کرنے میں مصروف رہتے یہ سلسلہ قرطبہ سے ثمرقند تک قائم تھا۔ خلیفہ الحکم ثانی نے قرطبہ میں 27 فری اسکول کھول رکھے تھے۔ اسلامی دنیا میں تقریباً ہر گاؤں میں مدرسہ قائم تھا۔ ایک انگریز مورخ مکس مولر کا بیان ہے کہ مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں صرف بنگال میں 80,000 سے زائد مدرسے تھے، یعنی اوسطاً چالیس افراد کے لئے ایک مدرسہ موجود تھا۔ان مدرسوں کے علاوہ بڑے شہروں میں یونیورسٹیاں قائم تھیں۔ جامعہ قرطبی عرب کی قدیم ترین یونیورسٹی تھی۔ اس کی بنیاد عبدالرحمن سوم نے ڈالی۔ اس میں یورپ افریقہ اورایشیا تک کے طلبہ آتے تھے۔ خلیفہ الحکم ثانی نے اس یونیورسٹی میں چیئرز قائم کی تھیں جن کے پروفیسر مشرق کے اسلامی ممالک سے لائے جاتے تھے۔پوری دنیا میں خصوصاً مغرب میں اس طرح کی کوئی یونیورسٹی نہیں جہاں تعلیم، قیام وطعام مفت ہو۔فری تعلیم کا تصور دنیا کو مسلمانوں نے دیا۔

قرطبہ کا اسقف الوارونویں صدی میں لکھتا ہے کہ وہ تمام عیسائی نوجوان جو ممتاز صلاحیت رکھتے تھے عربوں کی زبان و ادب سے واقف ہو جاتے تھے وہ ان کتابوں کو شوق سے پڑھتے تھے بہت دولت خرچ کر کے ان کی کتب مہیا کرتے اور بڑے بڑے کتب خانے قائم کرتے اور ببانگ دہل اعلان کرتے کہ ان عربوں کا ادب کس قدر لائق ستائش ہے۔

(۳۷) نعیم صدیقی، تاریخ اسلام، ص:۸۴۵۔۸۵۰

(۳۸) ول ڈیوراں، اسلامی تہذیب کی داستان، ص:۱۳۲

مسلم یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل طلبا مسلمانوں کی سائنس اور علمی ترقی سے مسحور ہو کر جب اپنے شہروں کو لوٹتے تھے تو ان کے دلوں میں مسیحی مغرب کی تاریخ کاربن کر کھٹکتی تھی۔

فرانس کا پیٹر آیبٹ لکھتا ہے:

"میں نے قیام ہسپانیہ کے دوران میں دیکھا کہ فرانس، جرمنی اور برطانیہ کے طلبہ جوق در جوق عربوں کے علمی مراکز میں جمع ہو رہے ہیں۔"

زمانہ وسطی میں مسلمانوں کو لکھنے پڑھنے کا جنون تھا ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب ہر سو مسلمانوں میں کم از کم پانچ اہل قلم ہوتے تھے۔ آٹھویں صدی سے لے کر گیارہویں صدی تک عالم اسلام میں ہر شخص کو کتابیں جمع کرنے کا شوق بلکہ جنون تھا۔ عالم اسلام کی شاہراہوں پر ہر طرف علمائے اسلام سیاح بن کر علم کی تلاش میں سفر کیا کرتے تھے۔ اسلامی ممالک میں مساجد اور مدارس کے ساتھ اکثر لائبریریاں قائم تھیں۔ میکسمیر ہاف کے مطابق قسطنطنیہ میں 8 0 سے زیادہ مسجدی کتب خانے موجود تھے۔

عالمی شہرت یافتہ فرانسیسی دانشور ڈاکٹر گستاؤلیبان تحریر کرتے ہیں:

"جس زمانے میں کتاب اور لائبریریاں یورپ والوں کیلئے کوئی مفہوم نہیں رکھتی تھی اور تمام کلیساؤں میں راہبوں کے 500 سے زیادہ کتابیں نہیں تھیں اور وہ بھی سب مذہبی تھیں، اس وقت اسلامی ممالک میں بڑی مقدار میں کتابیں اور لائبریریاں موجود تھیں۔ بغداد کی لائبریری "بیت الحکمۃ" میں 40لاکھ کتابیں، قاہرہ کی لائبریری میں 10 لاکھ کتابیں، طرابلس کی لائبریری میں 30 لاکھ کتابیں اور تنہا اسپین میں سالانہ 70 سے 80 ہزار کتابیں اکٹھی کی جاتی تھیں"

ایک دوسرے مغربی مورخین سارٹن لکھتے ہیں:

"سب سے زیادہ گراں قدر، سب سے زیادہ اوریجنل اور سب سے بڑھ کر پر مغز کتابیں عربی میں لکھی گئی۔"

دنیا کی پہلی پبلک لائبریری مسلمانون نے قائم کی۔ تمام بڑے شہروں میں عظیم الشان لائبریریاں موجود تھیں۔ قاہرہ اور طرابلس میں اس دور کی عظیم ترین لائبریریاں تھیں، قاہرہ کی لائبریری میں 10 لاکھ اور طرابلس کی لائبریری میں 30لاکھ کتابیں تھیں۔ مصر کے فاطمی خلیفہ الحاکم بامر اللہ نے قاہرہ میں ایک اکیڈمی دارالحکمہ قائم کی۔ اس کی لائبریری میں 16 لاکھ کتابیں تھیں۔ لوگ یا تو وہاں بیٹھ کر مطالعہ کرتے یا پھر کتب گھر لے جاتے تھے۔ جامعہ قرطبی کی لائبریری میں 6 لاکھ کتابیں تھیں۔

عیسائیوں اور مسلمانوں کے کتب خانوں کا موازنہ:

زمانہ وسطیٰ میں اسلامی دنیا میں لکھنا پڑھنا ہر خاص وعام کا اوڑھنا بچھونا ہوتا تھا۔ اس دور میں مسلمانوں میں شرح خواندگی دنیا میں سب سے زیادہ تقریباً 100 فیصد تک رہی۔ یونان میں علمی سرگرمیوں کا صدیوں تک سلسلہ ضرور رہا مگر وہ اتنا ہمہ گیر کبھی نہ ہوا۔ گنتی کے آٹھ دس شہروں تک محدود رہا۔ مگر اسلامی دنیا میں علمی سرگرمیاں وسطی ایشیا سے اسپین تک 100 سے زیادہ شہروں میں جاری رہیں۔ اب علماء و فضلاء کی تعداد کو لیجئے۔ یونان میں آٹھ صدیوں میں صرف ١٠٠ کے لگ بھگ علمی لوگ پیدا ہوئے۔ ان کے مقابلے میں اسلامی دنیا میں ابتدائی تین صدیوں میں ڈیڑھ ہزار سے زیادہ علماء وفضلا پیدا ہوئے۔ تین صدیوں کے بعد ان کی تعداد میں جو اضافے ہوتے گئے، ان کا شمار نہیں۔

دوسری طرف 1300ء میں عیسائیوں کی سب سے بڑی لائبریری کینٹر بری (انگلستان) میں تھی جس میں صرف 5 ہزار کتابیں تھیں۔ دوسری کلونی (فرانس) میں تھی جہاں صرف 570 کتابیں تھیں۔ ان کے علاوہ یورپ کے اکثر ممالک کی کسی لائبریری میں 100 سے زیادہ کتب نہیں تھیں، جبکہ صرف قرطبہ میں 7 لاکھ کتابیں تھیں۔

عیسائی یورپ نے 1200 برس میں اندازاً 200 کتابیں لکھیں اور مسلمانوں کی 60 لاکھ سے زیادہ کتب جلائیں، جب کہ ہمارے اسلاف نے تصانیف کے انبار لگا دئے تھے۔ کتنے ہی ایسے تھے جنھوں نے 100 یا اس سے زائد کتابیں لکھیں۔ امام غزالی نے 200 کتب لکھیں، ابن العربی نے 500 کے قریب کتب لکھیں، ابن تیمیہ نے 500 کتب لکھیں، جلال الدین سیوطی نے 550 کتب لکھیں اور ابن طولون دمشقی 750 کتابوں کے مصنف تھے۔(٣٩)

خلاصہ بحث:

مندرجہ ذیل تحقیق سے بخوبی عیاں ہوتا ہے کہ مسلمان کس طرح اپنے قیمتی ورثہ کی خاطر خود کو مصروفِ عمل رکھتے تھے۔ یہ ہمارے اسلاف کا ہی ورثہ ہے جس سے آج تک مسلمانوں کے علاوہ اہلِ مغرب بھی استفادہ کرنے میں مصروفِ عمل ہیں۔ ضرورت اس اَمر کی ہے کہ جو قلمی مخطوطات کی صورت میں قدیم نسخے یورپ کے مختلف شہروں کی لائبریریوں میں موجود ہیں، اُن کا تحقیق و تدوین کے ساتھ اِحیاء کیا جائے اور اَسلاف کی فکر کو مسلم اُمہ تک پہنچایا جائے۔ اس تحقیق کے ساتھ امتِ مسلمہ کے لیے علم و فکر کی نئی راہیں آشکار ہوں گی اور جس علم و تحقیق کا فقدان دورِ جدید کے مسلمانوں میں پایا جاتا ہے، ایک بار پھر اُسی اوج ثریا پر پہنچنے میں کامیاب وکامران ہو سکیں۔

---

(٣٩) پروفیسر ارشد جاوید، مسلمانون کا ہزار سالہ عروج، ص:٣٦-٤٠

نکاح مسیار کا تحقیقی وشرعی جائزہ

☆مظہر ساجد

☆☆عمر فاروق شاہ

☆☆☆سید ریحان الحسن گیلانی

Misyaar Marriage exists in Arab countries now a days. In this kind of marriage, man and woman give up some of their rights by mutual consent. For example, a woman's right to food and alimony, her right to live together, her right to night shifts, etc. It does not usually have a fixed time, but it is often seen that it ends after a short time. In this aspect, it has resemblance with Mut'ah marriage but this marriage is not Mut'ah. In Misyaar marriage, Man and woman often do not live together and they fulfill their needs in permissible way. Different scholars have different thoughts and opinios about Misyaar Marriage. This article sheds light about Misyaar marriage, it is permissible way or not permissible in Islam?

Keywords: Misyaar marriage, Islam, Alimony, permissible.

خاندان کے اجزائے ترکیبی میں ایک مرد، ایک عورت اور ان کے بچے شامل ہیں اور خاندان کی بقا کے لیے مرد و عورت کا باہمی تعلق ضروری ہے۔ اس تعلق کے لیے تقریباً تمام مذاہب نے مرد وزن کے درمیان شادی کے بندھن یعنی نکاح کو لازمی قرار دیا ہے۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ نکاح یا شادی بیاہ کا یہ ازدواجی تعلق اتنا ہی قدیم ہے جتنا انسان قدیم ہے۔ نسل انسانی کا پہلا شخص بھی ازدواجی تعلق سے سرشار تھا۔ شادی بیاہ کا یہ تعلق تقریباً دنیا کی تمام تہذیبوں میں کسی نہ

☆ M.Phil Islamic Studies, UMT, Lahore

☆☆ Lecturer, (SIEBF), Minhaj University Lahore.

☆☆☆ PhD scholar, Department of Islamic Studies, University of Lahore

کسی صورت میں پایا جاتا ہے۔ مرد و عورت کا یہ رشتہ حضرت آدم اور حضرت حوا کے ملاپ سے شروع ہوا اور ہر زمانے و تہذیب میں مختلف طریقوں سے رائج رہا۔

اسلام سے قبل نکاح کی صورت حال

عرب میں نکاح کے مختلف طریقے رائج تھے۔ جن میں سے بعض کو تو نکاح کہنا ہی درست نہیں کیونکہ وہ سراسر زنا سے مشابہ تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ کی ایک روایت میں ہے؛ عرب کے دور جاہلیت میں رائج نکاح کے طریقوں کا پتا چلتا ہے جو ان کی تہذیب کا حصہ تھے۔

آمدِ اسلام سے قبل بھی عربوں میں کئی قسم کے نکاح رائج تھے۔ جس کے نظائر ہمیں مختلف ذخیرۂ کتب سے ملتے ہیں۔ جیسا کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے نکاح ''شغار'' کو منع کیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمر بیان کرتے ہیں:

أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنْ الشِّغَارِ وَالشِّغَارُ أَنْ يُزَوِّجَ الرَّجُلُ ابْنَتَهُ عَلَى أَنْ يُزَوِّجَهُ ابْنَتَهُ وَلَيْسَ بَيْنَهُمَا صَدَاقٌ. (۱)

''کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے نکاحِ شغار سے منع فرمایا ہے۔ نکاح شغار یہ ہے کہ ایک شخص اپنی بیٹی کا نکاح دوسرے شخص سے اس کی بیٹی کے عوض کر دے (یعنی وہ بھی اپنی بیٹی کا نکاح پہلے شخص سے کر دے) اور ان کے درمیان مہر نہ ہو۔''

اسی طرح کے اور کئی نکاح کی اَقسام تھیں جو زمانۂ جاہلیت سے رائج تھیں اور جب حضور نبی اکرم ﷺ کی آمد ہوئی آپ نے جاہلیت کے تمام نکاحوں کو باطل قرار دے دیا صرف اس نکاح کو باقی رکھا جس کا آج کل رواج ہے۔ (۲)

مسیار کا لغوی معنی :

مسیار مفعال کے وزن پر ہے، جو کہ مبالغہ کا صیغہ ہے، سار، مسار، یسیر، سیرًا، مسیرا ایسے شخص کو مسیار اور سیار کہا جاتا ہے جو بہت زیاد چلنے والا ہو۔ (۳)

---

۱ مسلم، ابو الحسین مسلم بن الحجاج، (س۔ن)، الصحیح، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔ ۲/ ۱۰۳۴، رقم: ۱۴۱۵

۲ بخاری، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل، (۱۹۸۷ء)، الصحیح، دار ابن کثیر، بیروت، لبنان۔ ۵/ ۱۹۷۰، رقم: ۴۸۳۴

۳ ابن منظور، محمد بن مکرم، (دون السنہ)، لسان العرب، دار صادر، بیروت، لبنان۔ ۴/ ۳۸۹

بعض محققین کے نزدیک " مسیار" ایک عام کلمہ ہے جو کہ نجد کے علاقوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اس عرف میں اس لفظ کا مطلب "صبح کے وقت کی زیارت" ہے۔ نکاح کی اس خاص قسم کا نام مسیار اس وجہ سے رکھا گیا ہے کیوں کہ عام طور پر آدمی مسیار میں بیوی کو بھی دن میں ایسے ملنے جاتا ہے جیسے کوئی کسی کے ہاں مہمان بنتا ہے (یعنی کچھ وقت ملاقات کر کے واپس آجاتا ہے۔)

عرفی معنی: نکاح مسیار اگرچہ ایک قدیم رسم ہے مگر قدیم فقہاء نے نکاح مسیار کے معنی و مفہوم بیان کرنے کی طرف التفات نہیں کیا۔ قدیم عرف میں یہ نکاح "زواج النہارات" کے الفاظ اپنا مکمل معنی و مفہوم رکھتا تھا۔ جو کہ ایسا نکاح تھا جس میں شوہر نکاح کے وقت یہ شرط رکھتا تھا کہ وہ مذکور بیوی سے ازدواجی تعلق صرف دن کے وقت رکھے گا۔ اور ایسا کرنے کی وجہ پہلی بیوی سے رات کے تعلق کا قیام تھا۔

مسیار کا اصطلاحی مفہوم:

بعض دیگر معاصرین نے نکاح مسیار کا تعارف کراتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ یہ عام شرعی نکاح ہے۔ مگر عرفی نکاح سے کچھ مختلف ہے۔ اس نکاح میں مختلف یہ ہے کہ اس میں بیوی کے بعض سے دستبرداری ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ بیوی نفقہ کا مطالبہ نہیں کرے گی اور اگر شوہر کی کوئی منکوحہ پہلے سے موجود ہے تو رات گزاری کا مطالبہ بھی نہیں کرے گی۔ اور عام طور پر نکاح مسیار، دوسرا یا تیسرا نکاح ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ نکاح "تعدد ازدواج" پر منطبق کیا جائے گا۔[۱]

ڈاکٹر احمد الحجی الکردی نکاح مسیار کے بارے میں لکھتے ہیں: نکاح مسیار یہ ہے کہ عاقل بالغ شخص عاقل بالغ عورت سے نکاح کرے، چنانچہ یہ شرعاً مہر مسنون اور شرعی گواہوں کی موجودگی میں ان شرائط کے ساتھ بھی جائز ہوگا کہ شوہر بیوی کے پاس بہت کم راتیں گزارے گا اور اسے نفقہ بھینہیں دے گا۔ یہ شرائط خوا نکاح کی مجلس میں بیان کی جائیں یا قرائن کے ذریعے معلوم ہوں یا ان پر عرف شاہد ہو۔ اور جہاں تک میں نکاح مسیار کو سمجھا ہوں اسے میں یوں سمجھاؤں گا۔(۲)

نکاح مسیار یہ ہے کہ: ایسا نکاح جسے چھپایا جاتا ہے۔ ایجاب و قبول، گوا، مہر اور ولی کی موجودگی اس میں ہوتی ہے۔ عورت اپنے تمام حقوق یا بعض حقوق سے دستبرداری کا اعلان کرتی ہے۔ جیسا کہ رات گزاری، گھر اور نفقہ وغیر۔ عام طور پر یہ بیوی اس مرد کا دوسرا نکاح ہوتا ہے یا تیسرا، یا چوتھا۔

---

۱ الاشقر، اسامہ عمر سلیمان، (۱۹۸۴ء)، مستجدات فقہیہ فی قضایا الزواج والطلاق، دار النفائس۔ ص ۲۳۴

۲ ندوة تلفزيونية مفرغة على موقع الشيخ القرضاوي في شبكة الإنترنت، بتصرف.

نکاح مسیار کا پس منظر:

چند سال پہلے تک یہ نکاح ایجاد نہیں ہوا تھا۔کچھ عرصہ ہی گزرا ہے اس نکاح کا نام سننے میں آرہا ہے۔سب سے پہلے یہ نکاح "القصیم" مقام پر ظاہر ہوا قصیم سعودی عرب کا ایک علاقہ ہے۔بعد ازاں دیگر علاقوں میں یہ پھیل گیا۔عام مشہور بات یہ ہے کہ "فہد الطنیم"(۱) نامی تاجر اس نکاح موجد ہے۔اور اس کے یہ نکاح ایجاد کرنے کی وجہ ان عورتوں کو ازدواجی تعلق فراہم کرنا تھا جن کی شادی کی عمر گزر چکی ہوتی ہو یا ایسی مطلقہ عورتیں جن کا سابقہ ناکام ہو گیا ہو تا ہو۔(۲)

کیا نکاح مسیار کوئی نئی چیز ہے؟

ڈاکٹر یوسف القرضاوی لکھتے ہیں: نکاح مسیار کوئی نئی چیز نہیں ہے۔یہ ایک قدیم معاملہ ہو جسے لوگ جانتے ہیں۔یہ وہی نکاح ہے جس میں ایک شخص عورت سے نکاح کر لیتا تھا مگر اسے بیاہ کر اپنے گھر نہیں لے جاتا تھا۔(۳)

ڈاکٹر ابراہیم الخضری لکھتے ہیں: مملکت سعودی عربیہ میں یہ نکاح نیا نہیں ہے۔لوگ اسے قدیم زمانے سے جانتے ہیں۔نجد میں یہ نکاح "الضحویہ" کے نام سے مشہور ہے۔یعنی آدمی عورت سے نکاح کرلے اور اس کے پاس صرف تقریباً پانچ سو سال پرانی رسم ہے۔(۴)

فقہ کی کتب میں اس سے ملتے جلتے ت ایک نکاح کا تذکر ملتا ہے، جسے نکاح "مالنہاریات" کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ اور نکاح النہاریات کی تعریف یوں کی گئی ہے: یہ ایسا نکاح ہے جس میں زوجین میں سے کوئی ایک شرط عائد کرتا ہے کہ ان کا ازدوجی تعلق صرف دن کے وقت ہو گا۔اور ایسی شرط عائد کرنے کا مقصد پہلی بیوی کے پاس رات کا وقت گزارنا ہے۔ "منکاح النہاریات کا یہ وصف نکاي مسار میں اپنے پورے می اکے ساتھ موجود ہے۔(۵)

نکاح مسیار کے ایجاد ہونے کی وجوہات واسباب

اس نکاح کے ایجاد کے کئی اسباب ہیں جن میں سے کچھ کا تعلق شوہر کے ساتھ ہے اور کچھ کا تعلق بیوی کے ساتھ ہے:

---

۱ الاشقر، اسامہ عمر سلیمان، (۱۹۸۴ء)، مستجدات فقهیه فی قضایا الزواج والطلاق، دار النفائس۔ ص ۴۹۵

۲ . مستجدات فقهیه، ص۵۸

۳ نفس المرجع

۴ القرضاوي، یوسف، زواج المسیار، ص:۳

۵ المطلق، عبد الملک، زواج المسیار، ص:۸۸

وہ اسباب جن کا تعلق عورت سے ہے:

عورت کا عرصہ دراز تک مناسب رشتہ نہ ملنے کیوجہ سے کنوار رہنا، یا پھر بیوہ ہو جانا خلعہ یافتہ ہو جانا کسی بھی امر مجبوری، یا پھر مطلقہ یا خلعہ کی وجہ سے اور یہ عرب کی سرزمین پر بہت زیاد پائی جاتی ہے۔

اکثر عورتوں کا تعدد ازدواج کو ناپسند کرنا آدمیوں کو اس طرف لے گیا کہ وہ دوسرا نکاح پہلی بیوی سے پوشید رکھیں۔

بعض عورتوں کی شوہر کے گھر میں نہ رہنے کی مجبوری بھی اس نکاح سبا ہے: مثلاً ایک عورت پر بچوں کی تربیت کا بوجھ ہوتا ہے اور وانہیں چھوڑ کر ایک نئے گھر میں نہیں بس سکتی۔ چنانچہ وہ اس طرح کا نکاح رچالیتی ہے۔(۱)

وہ اسباب جن کا تعلق مردوں سے ہے:

ایک عام آدمی کی جبلی اور فطرتی خواہش ایک سے زائد شادیوں کی ہوتی ہے۔ مردوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن کی ضرورت ایک عورت سے پوری نہیں ہوتی۔ جماع کیر غبت ان میں بہت زیاد ہوتی ہے چنانچہ وہ دوسرے نکاح کی طرف مجبور ہوتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض آدمی عورت کے ساتھ زیاد وقت بتانا چاہتے ہیں مگر پہلی بیوی یا تو عمر کی بڑھوتری کے زمانے کو پہنچ چکی ہوتی ہے یا گھر داری اور بچوں کو سنبھالنے میں مصروف ہوتی ہے چنانچہ شوہر کو اس سے پریشانی محسوس ہوتی ہے اور و نکاح مسیار کی جانب راغب ہوتا ہے۔

بعض آدمی گھر داری کے مزید بوجھ اور تکالیف سے بچتے ہوئے یہ نکاح کرتے ہیں۔

بعض آدمی دوسرا نکاح ظاہر کرنے سے ڈرتے ہیں، پہلی بیوی دوسرے نکاح کی خبر پر ایک طوفان کھڑا کر دے گی اور گھر اجاڑ کر رکھ دے گی۔

وہ اسباب جن کا تعلق معاشرے کے ساتھ ہے

مہر میں بے جا زیادتی اور شادی کے اخراجات: یہی وجہ ہے کہ بہت سارے آدمی دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں مگر نکاح مسیار کے علاوانہیں دوسرا طریقہ نظر نہیں آتا۔ اسپر مزید یہ کہ معاشرے میں مطلقہ، بیوہ اور عمر ڈھلی خواتین کی ایک بڑی تعداد ایسی ہوتی ہے جو کسی بھی صورت ایک مرد سے تعلقات استوار کرنے پر تیار ہوتی ہے۔ خاص طور پر جب ایسے تعلق کو حلال ہونے کا سہارا مل جائے، یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک خاتون مالدار ہوتی ہے اور اس کا خاندان سمجھتا ہے کہ اگر وبیادی گئی تو مال بٹ جائے گا یا دوسرے گھر میں چلا جائے گا، چنانچہ اسے دوسرا نکاح کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور جب نکاح ي مسار جیسی صورت سامنے آتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا۔ کبھی ماشر ایک آدمی کو ایک

ا الدمشقاء، عرفان، (دون السنة)، نكاح المسيار وأحكام الأنكحة المحرمة، المكتبة العصرية، بيروت. ص: ٣

سے زائد نکاح کرنے پر ملامت کرتا ہے کہ فلاں شخص کو دیکھو ہر وقت ایک ہی کام میں لگا رہتا ہے، اسے دیکھو دو دو شادیاں رچا رکھی ہیں۔ چنانچہ ایسا شخص بھی نکاح ي مسار کی جانب راغب ہوتا ہے۔ تا کہ لوگوں کی باتوں سے دور رہ سکے۔(۱)

نکاح مسیار اور دیگر نکاحوں کے مابین فرق:

نکاح مسیار میں گواہوں کو تاکید کی جاتی ہے کہ وہ یہ نکاح چھپائیں گے جبکہ عام نکاح میں یہ تاکید نہیں ہوتی بلکہ نکاح کو خوب ظاہر کیا جاتا ہے۔ نکاح ي مسار میں بیوی اپنے تمام ان حقوق سے دستبرداری کا اعلان کرتی ہے جو اسے نکاح کی وجہ سے ملنے ہوتے ہیں جبکہ عام نکاح میں وہ تمام حقوق وصولے جاتے ہیں۔ نکاح ي مسار میں عام طور پر شوہر کا مذکور بیوی کے ساتھ رہنے کا قوی اراد نہیں ہوتا جبکہ عام نکاح میں گھر بسانے کا مکمل اراد ہوتا ہے۔ نکاح ي مسار میں عام طور پر بیوی دوسری تیسری یا چوتھی ہوتی ہے جبکہ عام نکاح میں عام طور پر بیوی پہلی ہوتی ہے۔(۲)

نکاح مسیار کا عام عرفی نکاح سے موازنہ:

موجود دور میں شادی کے دو مفہوم ہیں:

پہلا مفہوم: ایک جوڑا جو آپس میں نکاح کرنا چاہتا ہے وہ نکاح فارم پر نکاح کے بارے میں اپنے گھر والوں کی مرضی اور ان کی اجازت کے بغیر نکاح درج کر دیتا ہے اور عام طور پر اپنے قریبی دوتواں کو اس پر گوابنا دیا جاتا ہے۔

دوسرا مفہوم: نکاح شرعی تقاضوں کو مدنظر رکھ کر کیا جاتا ہے مگر نکاح فارم اور دیگر متعلقات کی رعایت نہیں کی جاتی۔

پہلی قسم کا نکاح مسیار سے موازنہ: نکاح مسیار پہلی قسم سے انتہائی مختلف ہے کیوں کہ اس میں کبھی گواہوں کا خیال رکھا جاتا ہے اور کبھی نہیں۔ جب کہ نکاح مسیار میں گواہوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اسی طرح پہلی قسم میں ولی کی اجازت بھی نہیں لی جاتی جب کہ نکاح مسار میں ولی موجود ہوتا ہے۔

نکاح مسیار کا دوسری قسم سے موازنہ:

اس میں صرف ایک فرق ہے اور وہ ہے کہ

---

۱ المطلق، عبد الملک، زواج المسیار، ص:۸۹

۲ المطلق، عبد الملک، زواج المسیار، ص:۸۹

وبالمقارنة بين النوع الثاني وزواج المسيار، فهو التوثيق فقط، فزواج المسيار غالباً ما يوثق، والنوع الثاني ليس فيه توثيق، لكن إن لم يوثق زواج المسيار كان زواجاً عرفيا ومسيار بآن واحد وقد بينت سابقاً أن التوثيق واجب حفظاً لحقوق المرأة والأطفال وطاعة أولي الأمر من المسلمين.(۱)

نکاح مسیار کا، نکاح خفیہ سے موازنہ:

گزشتہ صفحات میں نکاح سر (خفیہ نکاح) کا مفہوم بیان کیا جاچکا ہے۔ اسے دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلی قسم: جس میں گواہ اور اعلان نہ کیا جائے۔ جمہور کے نزدیک یہ نکاح باطل ہے۔

دوسری قسم: جس میں دو گواموجود ہوں، اور ان سے وعدہ لیا جائے کہ وہ نکاح کو ظاہر نہیں کریں گے۔ جمہور کے نزدیک یہ نکاح درست ہے۔ جبکہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک باطل ہے، اور دخول سے پہلے پہلے اس کا فسخ کیا جانا ضروری ہے۔(۲)

اس قسم کے مقابلے میں نکاح مسیار کو دیکھا جائے تو اگر وہ بغیر گواہوں اور بغیر اعلان کے ہو تو باطل ہو گا، جبکہ اگر گواہوں کو خفیہ رکھا جائے تو جمہور کے نزدیک جائز ہو گا۔ جبکہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک دخول سے پہلے پہلے فسخ کرنا ضروری ہو گا۔ اور عام طور پر نکاح مسیار اسی دوسری قسم کا ہوتا ہے۔

نکاح مسیار کا، نکاح متعہ سے موازنہ:

نکاح مسیار اور نکاح متعہ میں بہت بڑا اور واضح فرق ہے۔ متعہ ایک خاص وقت اور خاص اجرت کے بدلے کیا جانے والا نکاح ہوتا ہے۔ مدت کے ختم ہونے کے ساتھ ہی یہ نکاح ختم ہو جاتا ہے جبکہ نکاح مسیار میں مدت متعین نہیں ہوتی، اور اس کے ختم ہونے کے لیے طلاق یا خلع کی شرط ہوتی ہے۔

ڈاکٹر یوسف القرضاوی لکھتے ہیں: نکاح مسیار کے لوازمات میں "کتمان اور پوشیدہ رکھنا" نہیں ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایسا نکاح کرنے والے شرعی ضروریات کے پیش نظر اس نکاح کی آڈیو یا ویڈیو ریکارڈنگ محفوظ کر لیتے ہیں تاکہ بوقت

---

۱ الاشقر، اسامہ عمر سلیمان، (۱۹۸۴ء)، مستجدات فقہیہ فی قضایا الزواج والطلاق، دار النفائس۔ ص ۲۶۷

۲ القرضاوي، زواج المسيار، ص: ۷۲

ضرورت ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکے۔اور اس نکاح میں ولی یا اس کی اجازت کا بھی تذکر موجود ہوتا ہے جو کہ ""نکاح کے اعلان"" کا کم از کم درجہ ثابت کر دیتا ہے۔(۱)

بعض کے نزدیک ولی کی موجودگی یا ولی کی اجازت ""اعلان نکاح"" کے لیے کافی ثابت نہیں ہوگی بلکہ اس میں دو گواہوں کی موجودگی ضروری ہوگی۔(۲)

جمہور کے نزدیک اگر نکاح کی شرائط "یعنی ایجاب و قبول اور گواہ" پائی جائیں تو بہر صورت یہ نکاح درست ہوگا۔

امام مالک رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اگر بوقت نکاح گواہوں سے کہا گیا کہ اس نکاح کا اعلان نہ کیا جائے تو یہ نکاح درست نہ ہوگا جبکہ اگر نکاح کے بعد گواہوں کو نکاح کے چھپانے کی تلقین کی گئی تو نکاح درست ہوگا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس عقد کے وقت کوئی ناض عقد شرط موجود نہیں تھی۔ یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اگر نفس عقد میں کوئی شرط فاسد پائی گئی مگر نکاح فسخ نہ کیا گیا اور خول کے بعد دستوار کے مطابق میاں بیوی زندگی گزارنے لگے تو ان کا نکاح درست شمار کیا جائے گا۔کیوں کہ اب ان کے زوجین ہونے کا عرف گواہ بن چکا ہے۔مالکیہ کے نزدیک نکاح کی شرط یہ ہے کہ دو عادل آدمی جو کہ ولی کی قبیل سے نہ ہوں نکاح کے گواہ بن سکتے ہیں۔اور نفس عقد میں ان کا گواہ بننا بھی ضروری نہیں ہے۔ہاں مستحب ضرور ہے۔(۳)

علامہ دردیر رحمہ اللہ اپنی شرح کبیر میں لکھتے ہیں: نفس عقد میں گواہوں کی موجودگی صرف مستحب ہے۔جبکہ اکثر ائمہ کے نزدیک نفس عقد میں ہی گواہی ہے۔ ہمارے یہاں نکاح کا معاملہ بیع کی طرح ہے۔جس میں شہادت بعد میں بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر القرضاوی رحمہ اللہ امام دردیر رحمہ اللہ کے قول کی حمایت میں لکھتے ہیں: نکاح میں گواہوں کا موجود ہونا مستحب اور بہتر ہے تاکہ زنا کی تہمت اور دیگر غیر مناسب معاشرتی امور سے بچا جاسکے، مگر یہ ضروری نہیں ہے۔(۴)

---

۱ الكاساني، بدائع الصنائع:۵۸۔۴/کشاف القناع،۵/۷۷

۲ القرضاوي، زواج المسيار، ص:۲۱و۲۲

۳ الكاساني، بدائع الصنائع،۲/۵۲۳

۴ القرضاوي، زواج المسيار، ص:۲۱و۲۲

خطہ عرب میں نکاح کے چھپانے پر مختلف ردّ عمل اور آراء:

جامعہ کویت کے شرعی ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ ڈاکٹر عبد الغفار الشریف لکھتے ہیں: بعض فاکمء کے نزدیک نکاح کا چھپانا، نکاح کو باطل کر دیتا ہے۔ یہ ایسی بات کو چھپانا ہے جو انسان کو تہمت کی طرف لے جاتی ہے۔ لیکن بعض کمزور ایمان لوگوں کے لیے یہ نکاح ایک ہی چیز ہے، محرمات میں پڑ کر خدا کی نافرمانی سے بچنا اس کے ذریعے ممکن ہے۔(۱)

ڈاکٹر سلیمان اشقر لکھتے ہیں: ہمارے لیے یہی بات کافی ہے کہ نکاح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حمل اعلان کا ہے۔ اور نکاح مسیار کرنے والے اس کا اعلان نہیں کر رہے ہوتے بلکہ اسے چھپا رہے ہوتے ہیں۔ اور اسے ایسے پوشید رکھا جاتا ہے کہ قریبی لوگوں تک کو خبر نہیں ہوتی۔

بہن بھائی، والدین اور دوست و اقرباء اس عمل سے خوش نہیں ہوتے۔ چنانچہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا اصل مقصد نکاح ہے ہی نہیں، بلکہ محض شہوت کی غلامی اور اس کی تسکین ہے۔ ال ل کے لیے ضروری ہے کہ اس نکاح کی برایاں بیان کریں اور اس میں پوشید قباحتیں لوگوں کو بتائیں۔ اور اس کی اتنی مذمت کریں کہ نیک اور اچھے لوگ یہ نکاح کرنے کی طرف مائل نہ ہوں۔ اور خواہشات کے غلاموں کے لیے اس کا دروازہ نہ کھلے۔(۲)

عورت کے حقوق کے اسقاط کی جہت سے نکاح مسیار کا مطالعہ:

یہاں عورت کے نفقہ سے مراد، وتمام مالی حقوق ہیں جو بیوی ہونے کی حیثیت سے اسے شوہر کی طرف سے ملتے ہیں ،یعنی کھانا، کپڑے، گھر اور حفاظت وغیر۔(۳)

یہاں ایک سوال ہوتا ہے: نکاح مسیار میں ان حقوق کے اسقاط کی شرط شوہر کی طرف سے لگائی جاتی ہے یا بیوی خود اپنے ان حقوق سے دستبرداری کا اعلان کرتی ہے؟

جواب: جوبات تحقیق سے معلوم ہوئی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ دونوں باتیں ہو سکتی ہیں، کبھی عورت اپنا سارا یا کچھ حق اپنی مرضی سے چھوڑ دیتی ہے شوہر کی طرف سے نکاح میں کوئی ایسی شرط نہیں پائی گئی ہوتی، اور کبھی شوہر نفس عقد میں شرط عائد کرتا ہے کہ وہ یہ حقوق ادا نہیں کرے گا۔

---

۱ القرضاوي، زواج المسیار، ص:۲۱و۲۲

۲ الاشقر، اسامہ عمر سلیمان، (۱۹۸۴ء)، مستجدات فقہیہ فی قضایا الزواج والطلاق، دار النفائس۔ ص ۲۵۴

۳ نفس المرجع، ص ۱۹۲

بیوی کے حقوق اور مکان

کتاب وسنت سے بیوی کے خرچے کا ثبوت انتہائی واضح ہے: قرآن کریم میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿لِيُنْفِقْ ذُو سَعَةٍ مِنْ سَعَتِهِ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا﴾ (۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے:

ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف.(۲)

بیویوں کے لیے ان کا کھانا اور کپڑا دستوار کے مطابق مقرر ہے۔

اجماع امت سے بھی ان دونوں حقوق کا ثبوت ملتا ہے، عابدء امت کے نزدیک بیوی کے یہ دونوں حقوق اسے اس وقت تک ملتے رہیں گے جب تک شریعت کی اتباع میں وشوہر کے ساتھ رہے گی اور کوئی نافرمانی نہیں کرے گی۔

اسی طرح ایک سے زائد بیویوں کے مابین رات گزاری کا حق بھی کتاب وسنت سے ثابت ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَى فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَلِكَ أَدْنَى أَلَّا تَعُولُوا﴾(۳)

چونکہ اس آیت میں مختلف بیویوں کے مابین اس حق کی جہت سے اصاف طلب کیا گیا۔ چنانچہ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بیوی کے پاس رات گزارنا شوہر پر فرض ہے۔

رسول اللہ سے منقول احادیث میں بھی اس حق کا ثبوت ملتا ہے. حضرت ابو ھریرہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من كانت له امرأتان فمال إلا إحداهما جاء يوم القيامة وشقه مائل.(۴)

---

۱ سورۃ الطلاق،۶۵/۷

۲ مسلم،الصحیح،۲/۸۹۰،رقم:۱۲۱۸

۳ سورۃ النساء:۳

(۴) ابو داود، سلیمان بن اشعث،(س.ن)،السنن، دار الفکر، بیروت، لبنان۔ ۲/۲۴۲،رقم:۲۱۳۳

جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں سے ایک کی طرف مائل رہا تو قیامت کے دن ایسی حالت میں آئے گا کہ اس کی ایک طرف جھکی ہو گی۔

بیوی کے حقوق کے اسقاط کے جواز پر بحث:

بیوی جب اپنے حقوق یعنی کھانا اور رات گزاری سے دستبرداری کا اعلان کر دے تو یہ دست برداری تو اس کے یہ دونوں حقوق اس کے لیے ثابت رہیں گے۔ اس کے ساقط کرنے سے ساقط نہیں ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایسے حقوق میں سے ہے جو ذمہ میں ثابت نہیں ہوتے۔(۱)

یہاں امام القرافی رحمہ اللہ کے ایک فقہی تشریح کی رشنی میں اسے ثابت کیا جاسکتا ہے: چنانچہ امام القرافی سے جب پوچھا گیا؛ اگر کوئی سے دستبرداری کے بعد ان کا مطالبہ کرے تو اس کا کیا حمل ہے؟ آپ نے فرمایا

ہمارے فقہاء کے نزدیک اس کا ایسا کرنا درست ہے، وہ اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ آپ نے یہ بھی کہا:""اگر اس نے وطی کے حق سے دستبرداری کا اعلان کیا ہو تو وہ اسے بھی مانگ سکتی ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ سے منقول ہے؛ وہ رجوع اور مطالبہ کر سکتی ہے اور یہ اسکا حق ہے۔ کیوں کہ انسان کی فطرت ایسے معاملات میں صبر سے کام نہیں لیتی۔

ڈاکٹر وہبہ الزحیلی اپنی کتاب "الفقه الإسلامی وأدلته" میں لکھتے ہیں: اس معاملے میں ایسے حقوق بھی ہیں جو ساقط نہیں ہوسکتے۔ اور یہ وہ حقوق ہیں جو بعد میں ثابت نہیں ہوتے بلکہ یہ نفس عقد کا حصہ اور اس کا تقاضہ ہوتے ہیں؛ جیسا کہ عورت کا نفقہ، مبیت وغیرہ کا ہیں حق۔(۲)

شوہر کی طرف سے اسقاط حق کی شرط کی حیثیت اور اس کے عقد پر اثرات:

نفقہ اور مبیت (شب باشی) دو ایسے حقوق ہیں جو نفس عقد کے ساتھ ہی بیوی کے لیے ثابت ہو جاتے ہیں۔ جب عورت عاقلہ، بالغہ اور سمجھدار ہو، اس کا ولی اس کے ساتح ہو اور وہ محض اپنی مرضی اور رضا سے اپن مکمل حق یا بعض حق سے دستبرداری کا اعلان کرے تو کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اسے یہ کام کرنے سے روکے، اور اس کی یہ دستبرداری نفس عقد پر بالکل بحی اثر انداز نہیں ہو گی۔(۳)

۱ابن قدامہ، ابو محمد عبد اللہ بن احمد، (س.ن)، المغنی، دار عالم الکتب، الریاض. ۱۰/ ۲۳۵

۲ وہبہ زحیلی، الفقہ الاسلامی

۳ وہبہ زحیلی، الفقہ الاسلامی، ۴/ ۲۸۴۷

لیکن اگر شوہر دستبرداری کی شرط عائد کروانا چاہے تو کیا یہ نفس عقد پر اثر انداز ہوگا؟ اہل علم کا اس مالے میں اختلاف ہے۔ اور یہ وہی اختلاف ہے جو شرط فاسد کی نوع سے متعلق ہے۔ فقہاء کی یہ مفصل آراء یہاں ذکر کی جاتی ہیں:

حنفیہ کے نزدیک وشرائط جن سے نکاح باطل ہوتا ہے یہ وہی شرائط ہوتی ہیں جن سے عقد موقت و موبد ہوتا ہے۔ چنانچہ امام کاسانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: مونکاجس موبد جس میں وقت کی شرط نہ لگائی گئی ہو، شروط فاسد اسے فاسد نہیں کر سکتیں۔(۱)

اس جملے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شوہر کی طرف سے خرچے کے نادینے کی اور رات گزاری کے اسقاط کی شرط لگانے سے نفس عقد پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ہاں یہ شرائط فاسد ہو جائیں گی۔

مالکیہ کے نزدیک یہ شرائط عقد کے منافی ہیں، چنانچہ دخول سے پہلے پہلے یہ عقد کو باطل کرنے والی ہوں گی اور عقد کا فسخ ضروری ہوگا۔ مگر دخول کے بعد یہ عقد پر اثر انداز نہیں ہوں گی۔

رقم طراز ہیں: وہ شرائط اگر عائد کی جائیں جو کہ عقد کے منافی ہیں جیسا کہ رات کے قیام کے اسقاط کی شرط، نفقے کے سقوط کی شرط اور میراث میں حصہ نہ ملنے کی شرط یابچے کی پیدائش کے بعد اس کے ماں کے عدم تصرف کی شرط، یا عورت کو طلاق کا مالک بنانے شرط دخول سے پہلے پہلے ان شرائط کی وجہ سے عقد کا فسخ کرنا ضروری ہوگا۔ بعد میں نہیں جیسا کہ ہمارا مشہور فتوی ہے۔(۲)

شافعیہ کے نزدیک یہ شرائط عقد پر اثر انداز نہیں ہوں گی۔ امام نووی رحمہ اللہ ایسی شرائط کا ضابطہ اور قائد کلیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: جو شرائط جو مقصود نکاح میں حائل ہوں، نکاح کو باطل نہیں کریں گی۔ جیسا کہ شوہر بیوی کو طلاق دے دے گا یا اس سے وطی نہیں کرے گا۔(۳)

حنابلہ کے نزدیک یہ شرائط نفس عقد پر اثر انداز نہیں ہوں گی۔ ان کے نزدیک ابن قدامہ کی تصریح کے مطابق وہی شرائط نفس عقد کو باطل کرتی ہیں جو نفس عقد کے منافی ہوں۔

فقہاء کے چاروں مسالک کی شرط فاسد میں غور خوض سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نکاح مسیار کو عدم نفقہ اور عدم بیت کی شرط فاسد نہیں کرتی۔ البتہ مالکیہ کے نزدیک دخول سے پہلے اس عقد کا فسخ ضروری ہوگا۔

---

۱ القرافي، الفروق: ۱ /۳۴۶

۲ القرضاوي، زواج المسيار، ص: ۱۲

۳ الكاساني، بدائع الصنائع: ۲/ ۵۷۶

عصر حاضر کے فقہاء کی آراء کی روشنی میں نکاح مسیار:

عصر حاضر کے فقہاء کے تین قسم کے اقوال اس مسئلہ میں ملتے ہیں :

پہلا قول: جائز ہے مگر غیر مناسب و مکروہ ہے۔

دوسرا قول: یہ نکاح جائز نہیں ہے۔ حرام ہے۔

تیسرا قول: اس معاملے میں توقف اختیار کرنا چاہیئے۔

نکاح مسیار کے جواز کے قائلین اور ان کے دلائل:

علماء اور فقہاء کی ایک جماعت اس شادی کی بھرپور تائید کرتی ہے اس کے نزدیک موجودہ دور کے پیش آمدہ مسائل کا حل اس میں پوشیدہ ہے۔ یہ شادی لوگوں کی مشکلات میں کمی کرتی ہے اور اس میں لوگوں کے لیے سہولت ہے اور لوگ اس کے ذریعے پاکیزہ زندگی گزار سکتے ہیں۔ اس جماعت میں درج ذیل فقہاء و علماء شامل ہیں۔

شیخ یوسف القرضاوی، شیخ وہبہ زحیلی، سید طنطاوی، عبد اللہ منیع، شیخ سعود الشریم (امام و خطیب مسجد الحرام) یوسف البدری (مصری شیخ اور رکن سپریم کونسل آف اسلامک افیئر) شیخ نصر وصل، عارف علی عارف (پروفیسر فقہ و اصول فقہ، بین الاقوامی اسلامک یونیورسٹی، مائشیا) پروفیسر ڈاکٹر محمد زوہدی عبد الماجد (پروفیسر فقہ و اصول فقہ، بین الاقوامی اسلامک یونیورسٹی، مائشیا) کے علاوہ بھی کوئی دیگر شخصیات اس کے قائلین میں سے ہیں۔(۱)

شیخ نصر فرید کہتے ہیں:

وأما أنه زواج صحيح، فهذا حق، لأنه فعلا زواج صحيح مئة بالمئة، وأركانه مكتملة شرعا.

"یہ شادی بالکل درست ہے۔ یہ سو فیصد صحیح ہے اور اس کے ارکان شرعی طور پر مکمل ہیں۔"(۲)

شیخ صالح سدلان کہتے ہیں:

فهو متحمس ويرى فيه زواجا شرعيا لا حرج فيه، طالما أنه ثم بولي وشهود ومهر ورضا من طرفين.

---

(۱) مجلہ الاسرۃ، (۱۴۱۸ھ)، العدد: ۴۶، ص ۱۵

(۲) نفس المرجع

”یہ شادی شرعی ہی دکھائی دیتی ہے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں ولی، گواہ، مہر اور دونوں طرفوں سے رضامندی ہوتی ہے۔“(۱)

شیخ منصور الرفاعی عبید کہتے ہیں:

زواج المسيار لا بأس به إذا تم وفقا للشروط التي وضعها الإسلام كأسس للعلاقة الزوجية المشروعية.

”زواجِ مسیار میں کوئی حرج نہیں ہے جب اس میں وہ تمام شرائط پائی جائیں جن کو اسلام نے شرعی شادی کے متعلق بنیاد قرار دیا ہے۔“(۲)

شیخ ابن باز نکاح مسیار کے متعلق لکھتے ہیں:

لا حرج في ذلك إذا استوفى في العقد الشروط المعتبرة شرعا، وهي وجود الولي ورضا الزوجين، وحضور شاهدين عدلين على إجراء العقد.

”اس نکاح میں معتبر شرعی شروط پائی جائیں: وہ شرائط ولی کی موجوگی، زوجین کی رضامندی، نکاح کے موقع پر دو عادل گواہوں کا ہونا اور زوجین کا موانع (نکاح) سے محفوظ ہونا ہے۔“(۳)

ڈاکٹر یوسف القرضاوی لکھتے ہیں: میں نکاح مسیار کے عدم جواز کا قائل نہیں ہوں۔ آپ یہ بھی لکھتے ہیں: جو لوگ مجھ سے مناقشہ کرکے کہتے ہیں کہ یہ نکاح مکروہ ہے

تو میں بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ بہت غلط طریقے سے معاملہ کیا جارہا ہے مگر اس کا طریقہ کار اگرچہ مکروہ ہے مگر نفس عقد ثابت ہو جاتا ہے۔ آپ اپنے دلائل میں لکھتے ہیں: جب اس نکاح میں مطلوبہ تمام شرائط پائی گئی ہیں تو کوئی فقیہ اسے کیوں ناجائز کہے گا؟(۴)

---

(۱) مجلہ الاسرۃ، (۱۴۱۸ھ)، العدد: ۴۶، ص ۱۵

(۲) نفس المرجع

(3) https://ar.islamway.net/fatwa/78870/%D8%B2%D9%88%D8%A7%D8%AC-%D8%A7%D9%84%D9%85%D8%B3%D9%8A%D8%A7%D8%B1-%D8%AA%D8%B9%D8%B1%D9%8A%D9%81%D9%87-%D9%88%D8%AD%D9%83%D9%85%D9%87

۴ التاج والاکلیل، ۵ / ۸۱

ڈاکٹر وہبہ الزحیلی لکھتے ہیں: شریعت کی نظر میں نکاح کا یہ طریقہ غیر مناسب ہے کیوں کہ نکاح سے مقصود شریعت گھر کا بسانا اور اولاد کی تربیت کے ذریعے ایک بہترین معاشرے کا قیام ہے۔

آپ اس کے جواز کے دلائل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: عورت کی پاکدامنی بھی شریعت کے مقاصد میں شامل ہے۔ اور جب کوئی شخص کسی عورت کو یہ مقصد دلانے کی کوشش کرے گا تو اس کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

نکاح مسیار کے عدم جواز کے قائلین اور ان کے دائل:

ڈاکٹر محمد الزحیلی لکھتے ہیں: مدو وجوہات کی بناء پر میں اس کے عدم جواز کا قائل ہوتا ہوں اور اس نکاح سے رواب ہوں۔

پہلی وجہ: اس میں بعض ایسی شائط موجود ہیں جو مقتضاء عقد کے منافی ہیں، اور مقاصد شریعت کو ختم کرتی ہیں جیسا کہ اولاد کی تربیت، میاں کا بیویوں کے مابین عدل، اور اس کے علاو دیگر ایسی شرائط اس نکاح میں موجود ہیں۔

وہ بیوی جس نے آج اپنے حقوق سے دستبرداری کا اعلان کیا ہے اکثر کل اس کی رائے بدل جاتی ہے بدل جاتی ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب وہ ایک بیوی کی حیثیت سے زندگی گزارتی ہے۔ اور اسے اپنی رائے بدلنے پر اولاد کے حقوق اور تن تنہا ان کی تربیت سے عاجز و مجبور کرتی ہے۔

نکاح مسیار بہت ساری معاشرتی برایاں لیے ہوتا ہے۔ جو نہ صرف یہ کہ مقتضاء شریعت کے منافی ہیں بلکہ لوگوں کو بھی اپنی جکڑ میں بند کر لیتی ہیں۔ مثلاً گھر داری، میاں بیوی کا آپس میں ایک دوسرے سے محبت اور سلوک اواد کی تربیت، وغیر یہ تمام امور حقوق الناس میں سے ہیں اور نکاح ي مسار ان سب امور کے منافی ہے۔ اسی طرح اہل محلہ یا علاقے کے لوگ اس شخص کی اس گھر میں آمد کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور وبد ظنی میں مبتلاء ہو جاتے ہیں جو کہ ایک مستقل گناہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میں سد اًرارا نکاح مسیار کی حرمت کا قائل ہوں۔ کیوں کی اصل یہ ہے کہ جو چیز حرام کا سبا بن رہی ہو وہ بھی حرام ہوتی ہے۔ نکاح مسیار کے یہ تمام نتائج صرف خام خیالی یا زبانی جمع و خرچ نہیں ہیں بلکہ یہ زمینی حقائق ہیں۔(۱)

---

۱ ندوة تلفزيونية مدونة على الإنترنت، في موقع باسم الدكتور يوسف القرضاوي.

اسی طرح ڈاکٹر عمر سلیمان الاشقر کی رائے میں بھی نکاح مسیار شرعی غیر مقبول ہے، جہاں تک اس کے عدم مقبول ہونے کا تعلق ہے تو وہ اشیاء درج ذیل ہیں:

پہلی دلیل: مشریعت اسلامیہ نے ازدواج و نکاح کا جو طریقہ وضع کیا ہے، نکاح مسیار اس طریقے کے سراسر مخالف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نکاح کے کرنے والوں کے پیش نظر شرعی مقاصد نہیں ہوتے، شریوت اسلامیہ نے نکاح کے مقاصد محبت، رحمت، تربیۃ اوادبیان کیے ہیں جب کہ اس نکاح کے کرنے والوں کے ذہن کے کسی کونے میں بھی ان مقاصد میں سے کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس نکاح کے کرنے والوں ان واجبات کو بھی ادا نہیں کرتے جو نکاح کے بعد لازم ہوتے ہیں۔ اس نکاح میں مبیت یعنی عورت کے پاس رات گزاری کا حق چھین لیا جاتا ہے اسی طرح عورت کو اس کا حق نفقہ بھی نہی دیا جاتا وغیرہ وغیرہ چنانچہ یہ نکاح جائز نہیں ہوگا(۱)

پانچویں دلیل: نکاح میں عدم انفاق، عدم سکنی اور عدم مبیت کی شرط لگانا باطل ہے۔ بعض ال لم کی رائے یہ ہے کہ یہ شرائط نفس عقد کو باطل کر دیتی ہیں۔ جبکہ دیگر بعضاء فاکم کے نزدیک شرائط باطل ہو جاتی ہیں اور عقد باقی رہتا ہے۔ چنانچہ اس قول کے مطابق عورت اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکتی ہے جس میں وحق بجانب ہوگی۔

وهذا سيجعل الذين سيقدمون عليه الزوج يعزفون عنه لعلهم ببطلان هذه الشروط.

چھٹی دلیل: میہ نکاح نہ صرف یہ کہ بنفسہ خود فساد ہے بلکہ دیگر فسادات کا ذرعہ بھی ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ یہ نکاح زنا کا بھی سا بن جائے کیوں کہ اس میں مہر سے بھی تسال برتا جاتا ہے۔ اسی طرح شوہر سے اس نکاح میں کسی قسم کی پوچھ گچھ نہیں ہوتی اور اسی انتہائی راز داری سے سر انجام دیا جاتا ہے، اور کبھی اس نکا حکو ولی سے بھی پوشید رکھا جاتا ہے، چنانچہ جب اتنی زیاد قباحتوں کی طرف نظر کی جائے تو یہی لگتا ہے کہ یہ نکاح محض خوہش پر تواں کا یک کھیل ہے۔

ساتویں دلیل: ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک ایسا فعل ہے جو ایک قسم کا کھیل تماشہ ہے(۲)

السابع وقد علمنا أنه فعلا اتخذ لعبة، فاخذت مكاتب تقوم لمثل هذ الزوج، وعند ذالك سيصح كنكاح المتعة بل هو أقبح.(۱)

۱المرجع السابق

۲ الاشقر، اسامہ عمر سلیمان، (۱۹۸۴ء)، مستجدات فقہیہ فی قضایا الزواج والطلاق، دار النفائس۔ ص ۲۶۰

اور وہ علماء جو نکاح مسیار کی حرمت کے قائل ہیں ان میں سے ڈاکٹر عبد اللہ الجبوری،ڈاکٹر ابراہیم فاضل اورڈاکٹر جبر الفضیلات وغیرہ شامل ہیں۔(۲)

وہ علماء جن کا موقف توقف کا ہے،دلائل یا حرام میں سے کسی کے بھی قائل نہیں ہیں :

بعض علماء نے نکاح کی اس قسم کے بارے میں توقف اختیار کیا ہے۔ان علماء کا توقف اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس نکاح کا حمل ان پر ظاہر نہیں ہوا،اور مزید نظر ثانی کے محتاج ہیں۔

ان علماء میں سے فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح بن عثیمین ،ڈاکٹر عمر بن سعود العید،استاد اصول الدین کالج جامعہ محمد بن سعود،وغیرہ شامل ہیں۔(۳)

نکاح مسیار کے بارے میں راجح رائے:

سچی بات تو یہ ہے کہ نکاح مسیار کی تحقیق اور اس کا حمل ظاہر کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے ، بلکہ اس کام کے لیے شریعت اور معاشرے کا انتہائی گہرا علم ،شریعت کے جوز اور منہیات پر مضبوط گرفت درکار ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ علماء جو اس کے جواز کے قائل ہیں انہوں نے اس کی محض بناوٹ پر غور کیا ہے۔اور ارکان پورے دیکھتے ہوئے اسکے جواز کا فتوی دے دیا ہے۔ جبکہ اس نکاح کے یوجہ سے ماشرے میں پیش آنے والی برائیوں کی طرف انہوں نے نظر نہیں کہ جب کہ وبھی مقاصد شریعت میں سے ایک اہم مقصد ہے۔

اور وہ علماء جنہوں نے اسکے حرمت کا فتوی دیا ہے انہوں نے محض اس کی ماہیت میں غور کر کے یہ دیکھ لیا کہ اس نکاح کو باطل کرنے والی کون کون سی چیزیں ہیں۔ چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ اس میں عورت کے حقوق غصب ہورے ہیں تو انہوں نے اس کے عدم جواز کا فتوی دے دیا۔ جیسا کہ مالکیہ کا فتوی ہے۔

جیسا کہ انہوں نے دیکھا کہ اس نکاح میں مقاصد شرعہ جو کہ نکاح سے مقصود ہیں وفوت ہورہے ہیں مثلاً سکون، محبت زوجین، صالح اواد اور خاندانی نظام وغیر ہ۔

اور جیسا کہ انہوں نے دیکھا کہ یہ نکاح فساد اور افساد کا ذرعہ ہے، کیوں کہ یہ آدمی کے لیے آسان کر دیتا ہے وہ نکاح مسیار کر لے اور جب چاہی آسانی طلاق دے دے، بلکہ کبھی کبھی اس نکاح کا مقصد عورت کا مال ہتھیانا ہوتا ہے اور جب اس کا مال ہتھیالیا جاتا ہے تو طلاق میں بالکل بھی دیر نہیں کی جاتی ہے۔

---

۱ المرجع السابق

۲ الاشقر، اسامہ عمر سلیمان،(۱۹۸۴ء)، مستجدات فقہیہ فی قضایا الزواج والطلاق، دار النفائس۔ ص۲۴۹-۲۵۰

۳ نفس المرجع، ص۲۴۶

حاصل بحث

ہماری مکمل بحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک حد تک یہ نکاح درست ہے۔ جبکہ خاندان کے لوگوں کو اس میں شامل کیا جائے تاکہ اس نکاح کے ضمن میں جو فسادات اپنا اندیشہ قائم کیے ہوتے ہیں وباقی نہ رہے۔ آدمی اور عورت میں سے ہر ایک اپنی عزت کی حفاظت اور شرعی حدود میں رہتے ہوئے خواہش کو پورا کر سکے۔اور دیگر یہ کہ یہ نکاح کرتے ہوئے عورت کے حقوق کے اسقاط کی بات نہ کی جائے۔ گواہوں کا بطور خاص انتظام کیا جائے اور میاں بیوی میں سے ہر ایک اپنی نیت کو درست رکھے۔

حوالہ جات

١. القرآن الکریم

٢. الاشقر، اسامہ عمر سلیمان، (١٩٨٤ء)، مستجدات فقہیہ فی قضایا الزواج والطلاق، دار النفائس

٣. بخاری، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل، (١٩٨٧ء)، الصحیح، دار ابن کثیر، بیروت، لبنان

٤. بہوتی، منصور بن یونس، (١٤٠٢ھ)، کشاف القناع، دار الفکر، بیروت، لبنان۔

۵. عارف، علی، (١٩٩٧ء)، زواج المسیار، رؤیاہ الاسلامیہ، العدد:٤٦۔

٦. العنزی، سعد، (١٩٨٨ء)، احکام الزواج فی الشریعہ الاسلامیہ، مکتبہ الصحوۃ، الکویت۔

٧. القرضاوي، یوسف، زواج المسیار

٨. القرضاوی، یوسف، (١٩٩٨ء)، حول زواج المسیار، مجلۃ الشریعہ، الاردن۔ العدد:٣٩٢

٩. کاسانی، علاء الدین، (١٩٨٢ء)، بدائع الصنائع، دار الکتاب العربی، بیروت۔

١٠. الکاساني، بدائع الصنائع:٥٨.٤/کشاف القناع

١١. ابو داود، سلیمان بن اشعث، (س.ن)، السنن، دار الفکر، بیروت، لبنان۔

١٢. ابن قدامہ، ابو محمد عبد اللہ بن احمد، (س.ن)، المغنی، دار عالم الکتب، الریاض

١٣. مجلہ الاسرۃ، (١٤١٨ھ)، العدد:٤٦

١٤. ابن منظور، محمد بن مکرم، (دون السنہ)، لسان العرب، دار صادر، بیروت، لبنان.

١۵. مسلم، ابو الحسین مسلم بن الحجاج، (س.ن)، الصحیح، دار احیاء التراث العربی، بیروت

الوصف في شعر محسن النقوي

(دراسة نقدية أدبية)

☆ محمد أنوار الحسنين

☆☆ الدكتور مسعود أحمد مجاهد

ABSTRACT

Al-wasf (the description) has great worth and status in Arabic Language and Literature. This art is one of the famous arts of poetry which is used by eminent poets from the pre-Islamic era till our modern age. There was no time in which this art was in abundance. All poetry revolves, whatever it is in Arabic, Urdu and English, even in Persian languages. This art is used in all ages in all modern and ancient languages. As this art was famous in Arabic and Persian languages, it started in Urdu language. This article sheds lights on this art which was adopted by renowned Pakistan poet Mohsin Naqvi. He was a prominent poet and pioneer of Urdu literature and is still remembered as a major contribution to the spread of Urdu literature in the subcontinent. He used this art is his poetry to express his inner different emotions in different dimensions.

Keywords: Mohsin Naqvi, Urdu, Thought, Islam

إن الوصف له مكانة علمية في الأدب العربي، ولا شك في هذا بأن الوصف هو فن من فنون الشعر الذي يستخدمه الشعراء منذ العصر الجاهلي إلى العصر الحديث، ولم يخل أي زمن من الأزمنه فيه إلا يوجد فيه هذا الفن بالكثرة. وتدور الأبيات مهما تكون في اللغة العربية والأردية والإنجليزية حتى في اللغة الفارسية وغير ذلك في جميع اللغات الحديثة والقديمة.

لا شك في هذا أن الشعر العربي له الأساليب العالية والبلاغة الرائعة، علوم البلاغة منها علم البديع الذي يتضمن المحسنات اللفظية كما ذكر عنه الخطيب القزويني قائلا:

☆ الباحث بمرحلة الدكتوراة بجامعة المنهاج، لاهور

☆☆ الأستاذ المساعد، بالقسم العربي، جامعة المنهاج، لاهور

''وعلم البديع هو علم البديع وهو علم يعرف به أحوال اللفظ العربي التي بها يطابق مقتضى الحال''(١)

والوصف هو أيضا من المحسنات اللفظية وقد ذكر كثير من الشعراء شعر الوصف. نذكر الآن معنى الوصف لغة واصطلاحا، وتعارف الوصف هي ما يلي.

معنى الوصف لغةً:

يذكر الأزهري عن الوصف قائلا:

''قال الليث الوَصفُ وصفُك الشيءَ بحليتهِ ونَعْتِه، قال ويقال للمُهْر إذا تَوجَّه لشيءٍ من حُسن السِّيرَة قد وَصَف معناه أنه قد وَصَف المشي يقال هذا مُهر حين وَصف''(٢)

الوصف عند ابن الفارس:

يقول الإمام اللغوي ابن فارس عن الوصف قائلا:

''الواو والصاد والفاء أصل واحد هو تحلية الشيء ووصفته أصفه وصفا والصفة الأمارة اللازمة للشيء كما يقال وزنته وزنا والزنة قدر الشيء يقال اتصف الشىء في عين الناظر احتمل أن يوصف وأما قولهم وصفت الناقة وصوفا إذا أجادت السير فهو من قولهم للخادم وصيف وللخادمة وصيفة ويقال أوصفت الجارية لأنهما يوصفان عند البيع''(٣)

تعريف الوصف عند ابن رشيق القيرواني:

يذكر القيرواني تعريف الوصف قائلا:

---

(١) الخطيب القزويني،(١٤٢٩هـ). الإيضاح في علوم البلاغة،ص١٦

(٢) أبو منصور الأزهري، تهذيب اللغة، ١٧٤/١٢

(٣) ابن فارس، مقاييس اللغة، ١١٥/٦

''أصل الوصف الكشف والإظهار، يقال: وصف الثوب الجسم، إذا نمَّ عليه، ولم يستره''(٤)

معنى الوصف اصطلاحًا:

يذكر أحمد الهاشمي عن الوصف اصطلاحا:

''هو شرح حال الشيء وهيئته على ما هو عليه في الواقع لإحضاره سامع كأنه يراه أو يشعر به.''(٥)

يقول الدكتور عمر فروخ عن الوصف:

''الوصف في كل شيء نوعان: خيالي وحسي فالوصف الخيالي يعتمد التشبيه والاستعارة ويحاول أن يستحضر الموصوف من الذاكرة. أما الوصف الحسي فهو تصوير للموصوف''(٦)

ويقول الرافعي عن الوصف اصطلاحا:

''الوصف جزء طبيعي من منطق الإنسان لأن النفس محتاجة من أصل الفطرة إلى ما يكشف لها من الموجودات وما يكشف للموجودات منها، ولا يكون ذلك إلا بتمثيل الحقيقة وتأديتها إلى التصور في طريق من طرق السمع والبصر والفؤاد، أي الحس المعنوي، ثم ذكر: كان الشاعر منهم لا يتعاطى إلا ما يحسن من ذلك ضرورة، وقد يشارك في أوصاف كثيرة ولكنه ينفرد بالشهرة في بعضها، من جهة العلم لا من جهة الصناعة''(٧)

ويذكر جبور عبد النور عن الوصف:

---

(٤) القيرواني، ابن رشيق، العمدة في محاسن الشعر، (١٩٧٢م)، دار الجيل، بيروت. ج١، ص٢٩٥

(٥) هاشمي، جواهر الأدب، ص٣٨٣

(٦) عمر فروخ، تاريخ الأدب العربي، ص٨١

(٧) رافعي، تاريخ آداب العرب، ص٨٠-٨١

''الوصف هو نقل صورة العالم الخارجي أو العالم الداخلي من خلال الألفاظ، والعبارات والتشابيه والاستعارات التي تقوم لدى الأديب مقام الألوان لدى الرسّام، والنّغم لدى الموسيقى، ويلازم الوصف طبيعة النفس البشرية، خاصة في طور البداوة حيث تستبدّ بها نزعة التقليد''(٨)

إن الوصف له مكانة مرموقة في الأدب العربي والأردي، وقد نظموا الشعراء الكبار أبياتا كثيرة عن الوصف في اللغة العربية واللغة الأردية كما أنهم أسهموا إسهامات كثيرة لنشر اللغة الأردية وفنونها وموضوعاتها.

خلفية اللغة الأردية:

إن اللغة الأردية هي لغة حية وهي تعبر المشاعر والأحاسيين لأهلها الذين يعيشون في شبه القارة، تعتبر اللغة الأردية من اللغات الحديثة التي نشأت في شبه القارة الهندية الباكستانية، إنها مرّت بالمراحل التي يجب أن تمر بها لغةٌ ما لكي تصبح لغة، واللغة– أيُّ لغةٍ كانت –كما يتحدث عن تكوينها الدكتور المولوي عبد الحق في مقدمة كتابه الأردي ''قواعد اللغة الأردية''.

''أنها ليست باختراع، ولا يمكن لأحد أن يخترع لغة ما، بل إنَّ مراحل تكوينها مثل مراحل تكوين البذرة حتى تصبح شجرة مثمرة''.(٩)

يقول الدكتور جميل جالبي عن اللغة الأردية:

''اللغة الأردية إحدى لغات الفرع الآري للغات الهندو أوروبية''.(١٠)

وأكبر لغات شبه القارة الهندو باكستانية التي يزيد تعدادها عن المليار نسمة يتحدث منهم باللغة الأردية ويفهمها ما لا يقل عن ثمانمائة مليون من أهل هذه البلاد (الهند– باكستان– نيبال– بنجلاديش) ما بين مسلمين ومسيحيين وهندوس وسيخ وغيرهم من أصحاب الديانات المنتشرة في تلك الرقعة من العالم.

---

(٨) جبور عبد النور، الوصف في الأدب العربي، ص ٢١

(٩) مولوي عبد الحق، (١٩٦١م). قواعد اللغة الأردية، كراتشي، باكستان. ص١

(١٠) جالبي، جميل، تاريخ الأدب الأردي (١٩٨٢م). ايجوكيشنل ببلك هاؤس، دهلي، الهند. ص١٢٣

الاسم ''أُردو'' والاختلاف في معانيه وأصله اللغوي:

قد اختُلفَ في معنى الكلمة ''أردو'' كما اختلف في محل نشأة اللغة ذاتها، وسنتناول هذا الاختلاف بعد أن ننقل الاختلاف في مسميات ومعنى كلمة ''أردو'':

> ''تتناول كتب التاريخ أن ملوك المغول في عهد جنكيز خان وأولاده كان يطلق على مستقر حكومتهم ''أُردو''، وكذلك حين كانوا يقيمون في مقامٍ ما مع عسكرهم كانوا يسمون ذلك المقام ''أُردو''، ويقال: أن الخيم الذهبية التي كانوا ينزلون فيها كانت تسمى ''الأردو المطلَّى'' وقد انتشر الاسم آنذاك في شبه القارة الهندية فكانوا يستعملونه في معنى المعسكر''(١١)

في قاموس اللغة الأردية المسمى بجامع فيروز اللغات نجد تحت الكلمة أردو صفحة ٨٢ ما ترجمته: كلمة أُردو تركية الأصل، وتعني الجيش أو المعسكر، أو مكان إقامة المعسكر، وهي اللغة المشتركة بين باكستان والهند الناشئة بمزيج من لغات أخرى. (١٢)

ويقول الحافظ محمود الشيراني وهو أحد المحققين في تاريخ اللغة الأردية أن اللفظ (أردو) نجده في اللغة التركية بعدة صور منها: ''أُورد، أُورده، أُوردو، وأخيراً أُردو'' ومعناه: الجيش، جزء من الجيش، المعسكر، وكذلك يطلق على: الخيمة، السوق، القصر، القصر الملكي، القلعة الملكية، أما البعض فينكرون أصل هذا اللفظ التركي، إنما ينسبونه إلى اللغات الهندوألمانية. (١٣)

قديماً وقبل أن يختص الاسم ''أُردو'' بهذه اللغة كان يطلق عليها اللغة الهندية أو الهندوية، وريختہ وغيرها من الأسماء كالهندوستانية، والحقيقة أن الأردية كانت تسمى بأسمائها المحلية فكلما ذهبت إلى مقام انتسبت إليه، فكانت البنجابية، والدكنية، والكجراتية، والدهلوية، بينما هي في الحقيقة ''أردية''، ولعل ذلك أن لهجات تلك المناطق وكلماتها أيضاً دخلت فيها فسميت كذلك، وعلى قول البعض أن علاقة الأردية من حيث انتسابها إلى

---

(١١) حميد الله الهاشمي، (س.ن). تاريخ اللغة والأدب الأردي، باكستان. ص ٣٤

(١٢) فيروز الدين، (٢٠٠٤م). فيروز اللغات، فيروز سنز، كراتشي، باكستان. ص ٨٢

(١٣) جميل جالبي، تاريخ الأدب الأردي، ١٣٣/١

المقامات المذكورة أعلاه إنما يرجع إلى انتشار اللغة الأردية فيها، ونستنتج أن المسميات المختلفة للغة الأردية تظهر الحالات التطويرية التي تعرضت لها اللغة، وكان القادمون من البلاد البعيدة يسمون الأردية، (الهندية)، وأودُّ أن أُشير هنا أن البعض ما زال يطلق عليها اسم الهندية، ولكن الحقيقة أن الهندية باتت تعرف على أنها لغة مختلفة عن الأردية رغم التشابه الكبير بين اللغتين إلا أن الهندية تختلف كونها تكتب برسم خط مختلف، وعلى كلِّ حال فكل تلك المسميات أصبحت متروكة، وبقت الكلمة (أُردو) تاجاً على رأس اللغة التي بها تعرف الآن.(١٤)

نشأة اللغة الأردية:

اختلف المؤرخون في بدايات اللغة الأردية اختلافا كبيرا من حيث محل وجودها ومصدرها، ولذا نجد كتب التاريخ الأردي مليئة بآراء كثيرة حول هذا الموضوع، ورغم وجود اختلافات في هذا الأمر إلا أن أغلب الآراء تتفق على أن نشأة اللغة الأردية كانت على أيدي فاتحي الهند المسلمين، وسنتناول في الأسطر الآتية بعض هذه الآراء:

يقول نصير الدين الهاشمي:

> ابتدأت اللغة الأردية في ''دَكَّن'' لوجود روابط تجارية قائمة بين تجار العرب والهنود، ونتيجة اختلاطهم ظهرت بوادر اللغة، إلا أن الرأي رُدَّ من قِبل بعض المحققين وهو: الدكتور غلام حسن ذو الفقار بقوله: بأن العلاقات العربية الهندية كانت سطحية بين التجار، إلا أننا لا ننكر النتائج الفكرية على اللغة جراء هذا الاختلاط، ويضيف أن علاقة اللغة الأردية بدكن ليست علاقة ابتداء، بل علاقة ارتقاء.(١٥)

يقول الدكتور جميل جالبي أحد روّاد الأدب الأردي ومؤرخيه: أن هذه اللغة وصلت مع المسلمين أينما حلُّو فكونت هيئتها من خلال تأثيرات المنطقة اللسانية عليها، تكوَّنت في السند وملتان، ثم ارتقت قليلا في بنجاب، ثم وصلت بعد مائتي سنة تقريبا إلى دهلي ومن هناك اختلطت باللغات المحلية وانتشرت في شبه القارة الهندية، فحينما حلت بالكجرات، قيل عنها الكُجرية، وفي دكّن سميت بالدكنية، فمن قائل أنها الهندية، ومن معبِّر عنها

---

(١٤) هاشمي، فريد الدين، (س.ن). تاريخ مسلمانان باكستان وبھارت، لاهور، باكستان. ٣٩/٢

(١٥) نصير الدين الهاشمي، (١٩٦٠م). *دَكّن ميں اُردو*، لاهور، باكستان. ص٦٥

أنها اللغة اللاهورية أو الدهلوية، وعلى هذا القياس أُنيطت اللغة ببِرج بهاشا، وكهري بولي، والبنجابية والسندية والسرائيكية على التَّوالي، فكل هذه الأمور والدَّعاوي في انتساب اللغة إليها لدليل على أن الأردية اقتبست نورها واكتسبت فيضها من جميع المناطق واللغات السائدة فيها ثم انفردَت بهيئتها الجميلة، لذا هي لغة اللغات الموجودة في شبه القارة الهندية. (١٦)

التعريف بالشاعر محسن نقوي:

كان محسن نقوي شاعرا بارزا وله مكانة مرموقة في الأدب الأردي الحديث واسمه الكامل هو: غلام عباس النقوي كما سمّاه أبوه. (١٧)

مولده ومسقط رأسه:

ولد محسن نقوي في الخامس من مايو سنة ١٩٤٧م في مقاطعة ديره غازي خان. وحصل تعليم الابتدائي في ديره غازي خان. ثم التحق في كلية الحكومية وأكمل تعليمه. ثم بعد ذلك أكمل ماجستير في نفسه الكلية. (١٨)

لقبه:

لقد غلب لقبه على اسمه كما أنه لقّب وتخلص باسم ''محسن'' وكان اسمه الكامل هو سيد غلام عباس كما ذكرت آنفا. (١٩)

نظم الشعر:

بدأ محسن نقوين ينظم الشعر في صغر سنه حينما كان يتعلّم في الكلية، وتلمّذ في هذا الفن على يدي شفقت كاظمي وعبد الحميد عدم. ثم بدأ أن يكتب على الموضوعات المختلفة في الجريدة ''هفت روزة''.

---

(١٦) جالبي، تاريخ الأدب الأردي، ص١/١٤٥

(١٧) محمد شمس الحق، پيمانۂ غزل، (٢٠٠٨م) مطبع مارشل، راولپنڈی، اسلام آباد، پاكستان-ج٢، ص٣٨٦

(١٨) نفس المصدر

(١٩) نفس المصدر

كان محسن نقوي من قادة بيبلز بارتي، وأنه حصل الوسام الذهبي من قبل ''بے نظير بھتو''.(٢٠)

وفاته:

توفي محسن نقوي في الخامس عشر من يناير في سنة ١٩٩٦م بمدينة لاهور، وأطلق الرصاصة عليه رجل غير مجهول.

تصانيفه:

لقد صنّف محسن نقوي كتبا على فنون مختلفة، منها: ''گنبد قبا، برگ صحراء، ريزه حرف، موج ادراک، ادائے خواب، عذابِ ديد، طلوع اشک، رخت شب، خيمہ جاں، فرات فکر، مرا نوحہ انہی گليوں کی ہوا لکھے گی'' وأبياته تحتوي على مدح آل النبي ﷺ كما أنه اشتهر كشاعر أهل البيت عليهم السلام.(٢١)

الوصف في شعر محسن نقوي

كان محسن نقوي شاعرا بارزا في الأدب الأردي، وأنه نظم الأبيات الكثيرة على الموضوعات الكثيرة منها الحب، والقيم الأخلاقية، والحب عن النبي ﷺ وآله. ولا أبالغ عن ذلك الرجل العظيم بأن أقول أنه كان شاعر أهل بيت الرسول في العصر الحديث كما نظم الشعراء أبياتا كثيرة عن حب آل النبي ﷺ في جميع الأزمنة وخاصا منذ العصر الأموي إلى العصر الحاضر. في هذا البحث نحن نقدّم ونعرض أبيات محسن نقوي التي تدلّ على الوصف من جهات مختلفة.

---

(٢٠) محمد شمس الحق، پيمانۂ غزل، (٢٠٠٨م) مطبع مارشل، راولپنڈی، اسلام آباد، پاکستان-ج٢، ص٣٨٦

(٢١) نفس المصدر

موضوعات الوصف عند محسن نقوي:

إن الوصف غرض من أغراض الشعر القديمة، حيث واكب الإبداع الشعري منذ الجاهلية، ولا يزال غرضا مطروقا حتى اليوم. إن الوصف يحتوي موضوعات كثيرة كالمدح والرثاء والغزل وغيرها.

وصف الرأس لسيدنا الحسين عليه السلام:

إن حادثة كربلاء هي توجد في كتب الحديث والتاريخ وهذه الحادثة هي كانت مؤلمة جدا في التاريخ الإسلامي، وقد نظم الشعراء أبياتا التي تشير إلى هذه الحادثة العظيمة، وكذلك يتذكر الشاعر في هذا البيت عن معركة كربلاء وهو يصف عن رأس لسيدنا الحسين رضي الله عنه قائلا:

جھک کے چومے نہ کیوں فلک محسن
جب سناں پر کسی کا سَر ٹھہرے(۲۲)

ترجمة البيت: لما لا تقبّل السماء يا محسن، لمّا يمكثُ ويُرى رأس الحسين رضي الله عنه على السِّنان.

يرى الشاعر محسن نقوي بأن الرأس الذي قُطع ورُفع على السنان له مكانة عظيمة في التاريخ الإسلامي. وكانت السماء تنظر إلى رأس سيدنا الحسين رضي الله عنه وإلى تلك الحادثة أشار محسن نقوي في بيته.

وصف رحلة المحبوب

إن الوصف عن رحلة المحبوب هو موضوع قديم جدا كما كان الشعراء نظموا الأبيات حينما رحلتْ أحبائهم من المكان إلى المكان الثاني، مثل امرئ القيس وغير ذلك وهذه العادة هي كانت شهيرة عند الشعراء الكبار من العصر الجاهلي. وقد نهج محسن نقوي على هذه العادة وهو عن فراق حبيبه ورحلته قائلا:

کہاں بھلایئے اُس کو کہ وہ بچھڑ کے سدا
خیال بن کے محیطِ حواس رہتا ہے

---

(۲۲) محسن نقوی،غزلیات، (۲۰۱۵م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص۱۲۳

بھٹک بھٹک کے اُسے ڈھونڈتے پھرو محسن
وہ درمیانِ یقین و قیاس رہتا ہے(٢٣)

ترجمة البيت: لا أستطيع أن أنساه، وأنَّ بعد فراقه هو يحيط جميع حواسي وعواطفي جميع الأحيان. يجب لك أن تبحث عنه، وأنه هو يسكن بين اليقين والقياس.

يقول مزيدا عن رحلة الحبيب قائلا:

وہ ایک پل کو روٹھا تو محسوس ہوا
جیسے بیت گیا اک سال جدائی میں(٢٤)

ترجمة البيت: إنه افترق مني لحظة، فظننتُ بأن الحول قد انقضى في افتراقه.

هذه الأبيات تشير بأن محسن نقوي أنه عانى وتألّم من فراق حبيبه وأنه يتألم ألما عظيما من أجل فراقه.

وصف جفاء المحبوب

إن الجفاء هو نقيض البر والصلة، وقد عرّف علماء اللغة معنى الجفاء، ويقول ابن فارس:

"الجفاء: خلاف البر ونقيض الصلة، وأيضًا غلظ الطبع، يقال: جفاه. إذا بعد عنه، وأجفاه: إذا أبعده، وجفوت الرجل أجفوه: أعرضت عنه أو طردته، وهو مأخوذ من جفاء السيل، وهو ما نفاه السيل، وقد يكون مع بغض، وجفا الثوب يجفو: إذا غلظ فهو جاف، ومنه جفاء البدو وهو غلظتهم"(٢٥)

يقول المناوي عن الجفاء قائلا:

---

(٢٣) محسن نقوی،غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص٩٢

(٢٤) محسن نقوی،غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص١١٧

(٢٥) ابن فارس، مقاييس اللغة، ج١، ص٤٦٥

''الجَفاء: هو الغِلَظ في العِشْرَة، والخُرْق في المعاملة، وترك الرِّفق في الأمور''(٢٦)

وقد ذكر الشعراء الكبار عن جفاء الناس والمرأة وإلى ذلك يشير محسن نقوي:

اک پیماں شکن سے کیا شکوہ؟
ہم رہے اپنے اعتبار میں گم(٢٧)

ترجمة البيت: لا أشكو من ناقض العهد، لأنني كنتُ مطمئنا عن عهوده ووفائه.

إضطراب محسن نقوي عن القُوْتِ:

يجب على المسلم أن يكسب قوته بالطريقة الإسلامية، وأنّ التكسّت والجهد عن كسب الحلال هو مباح وجائز وقد يقول الإسلام عن ذلك بالكثرة. لو ننظر إلى أبيات محسن نقوي لوجدنا بأن كان عنده قلقان واضطراب عن القوت وإلى ذلك هو يشير قائلا:

کتنے یاروں کے کارواں محسن
ہوگئے گردِ روزگار میں گم(٢٨)

ترجمة البيت: كانتْ جماعة وعصبة لأصدقائي، ولكن أنهم صاروا مفترقة لأجل كسب القوت والرزق.

في هذه الأبيات يشكو الشاعر عن قلة القوت ولحصول المعيشة في هذا الزمان وهو يذكر أصدقائه بالشدة.

وصف جفاء الأصدقاء:

إن الجفاء هو ضد البر والصلة ومحسن نقوي هو يذكر عن جفاء أصدقائه وهو يقول:

---

(٢٦) مناوي، عبد الرؤوف المناوي، (دون السنة)، التوقيف على مهمات التعاريف، ص١٢٨

(٢٧) محسن نقوی،غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص٩٤

(٢٨) محسن نقوی،غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص٩٤

دوستوں کی زبان تو کھلنے دو
بھول جاؤ گے زخم خنجر کے(٢٩)

ترجمة البيت:دعْ لسان الأصدقاء أن يفتتح، أنكم سوف تنسون جراحات الخنجر بعد افتتاح لسانهم.

يقول في مقامٍ آخر عن جفاء الأصدقاء:

اپنے دشمن سے میں بے وجہ خفا تھا محسن
میرے قاتل تو میرے اپنے حواری نکلے(٣٠)

ترجمة البيت: كنتُ مغتضبا عن عدوّي بدون السبب، ولكن كانت أعدائي هم أصدقائي.

هذه الأبيات تؤكد بأن أصدقاء محسن نقوي يهملون عنه وهو يذكر عنهم في أبياته.

الوصف لعيون المحبوب:

العيون هي نعمة من الله تعالى أنعم علينا بها، والعيون هي من أجمل أعضاء الجسم وأهمهان ومن غيرها لا يستطيع الإنسان فعل الكثير من أموره الشخصية، والوصف عن العيون هي فن قديم الذي ذكره الشعراء الكبار منذ العصر الجاهلي وإلى ذلك يشير محسن نقوي قائلا:

بھڑکائیں میری پیاس کو اکثر تیری آنکھیں؟
صحرا مرا چہرا ہے، سمندر تیری آنکھیں(٣١)

ترجمة البيت:لتزيدنَّ عطشي عيونك بالكثرة، إن وجهي هو مثل الصحرا، وعيونك هي مثل البحر.

يقول مزيدا عن وصف عيون المحبوب قائلا:

---

(٢٩) محسن نقوی،غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص٩٧

(٣٠) محسن نقوی،غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص١٢٥

(٣١) محسن نقوی،غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص٩٨

تجھ سے آنکھ ملانا کتنا مشکل ہے؟
ورنہ سورج کھل جائیں بینائی میں(۳۲)

ترجمة البيت: كم صعبا أن ألاقي عيني مع عيونك، إن صادفتْ عيوننا، تصبح الشمس مفتتحا للنظارة.

فقدان العدل في الجتمع:

إن العدل هو خلق عظيم في الإسلام، العدل والمساواة من أعظم القِيم النبيلة التي أمر الله تعالى بها، وسعى الرسولُ ﷺ لتطبيقها في المجتمع المسلم، فلا فرقَ بين عربي ولا أعجمي إلا بالتقوى. وقد جاء ذكر العدل والمساواة في القرآن الكريم مرات كما قال تعالى:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَى وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾(۳۳)

تؤكد على هذه النقطة الأحاديث الكثيرة كما جاء في الصحيح البخاري:

''عن عائشة رضي الله عنها أن قريشا أهمهم شأن المرأة المخزومية التي سرقت فقالوا ومن يكلم فيها رسول الله ﷺ فقالوا ومن يجترئ عليه إلا أسامة بن زيد حب رسول الله ﷺ فكلمه أسامة فقال رسول الله ﷺ أتشفع في حد من حدود الله ثم قام فاختطب ثم قال إنما أهلك الذين قبلكم أنهم كانوا إذا سرق فيم الشريف تركوه وإذا سرق فيهم الضعيف أقاموا عليه الحد وأيم الله لو أن فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها''(۳۴)

والعدل يعطي الحياة للمجتمع الإنساني كما أن مجتمنا هو كله معكوس عن الأصول والقواعد الإسلامية وإلى هذا يشير محسن نقوي قائلا:

---

(۳۲) محسن نقوی، غزلیات، (۲۰۱۵م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص۱۱٦

(۳۳) سورة النحل، ٩٠/١٦

(٣٤) بخاري، الصحيح، (١٩٨٧م)، ج٣، ص١٢٨٢، رقم:٣٢٨٨

وہ جو سچ بولتے رہنے کی قسم کھاتے ہیں؟
وہ عدالت میں گنہگار ہوا کرتے ہیں(۳۵)

ترجمة البيت:من يقسم بأنه لا يتكلّم إلا الحق، هو سوف يُذْهبُ في العدالة آثما..

هذا البيت يشير ويتكلّم عن المجتمع الحالي في باكستان، بأن الرجل الذي هو يتكلّم صدقا، في هذا المجتمع لا يُفيده صدقه.

وصف لمس الحبيب

إن الوصف للحبيب هو قسم الوصف الذي يوجد في الأدب الأردي وخاصا في جميع آداب جميع اللغات. ويصف محسن نقوي عن وصف لمس الحبيب:

کس قدر گرم ہے وجود کا لمس
برق چھو لے تو وہ بھی جل جائے(۳۶)

ترجمة البيت:كم ساخنًا وجود لمسه، لو يمسُّ البرق وجودَه، لصارَ محترقا.

وصف الموت:

إن الإيمان بالموت هو من الإيمان والموت هو الانتهاءِ كل حي، ولا علمَ لنا به، وأن الموت هو ساعة مختصة لكل إنسان وهو لا يعلم عنه إلا الله سبحانه وتعالى.

وهناك آيات وأحاديث كثيرة التي تدل على الموت كما ذكر الله تعالى عن الموت:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ 0 وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾(۳۷)

(۳۵) محسن نقوی،غزلیات، (۲۰۱۵م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان.ص۱۱٤

(۳٦) محسن نقوی،غزلیات، (۲۰۱۵م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان.ص۲۳۷

(۳۷) سورة الرحمن، ۵۵/۲٦-۲۷

فالموت هو إنتهاء كل حي ولا مفر لنا من الموت. وإلى هذا يشير الشاعر الشهير محسن نقوي ذاكرا عن الموت.

اس قدر محو رنج ہستی ہوں
موت آئے تو وہ بھی ٹل جائے(۳۸)

ترجمة البيت: إنني مشغول جدا في حياتي، لو حان وقت الموت، لتأخّر.

يقول مزيدا عن وصف الموت:

اے میرے بدن روح کی دولت پہ نہ اِترا
یہ تیر بھی ترکش سے نکل جائے گا آخر(۳۹)

ترجمة البيت: يا أيها الجسد، لا تفرح على روحك، لأن هذا الروح سوف يرتحل من جسدك.

يقول مزيدا عن وصف الموت:

ہر قدم پر فریب دیتے ہو
بندہ پرور یہ دوستی کیا ہے
آ مجھے اپنے شہر میں لے چل
اے مری موت سوچتی کیا ہے(۴۰)

ترجمة البيت: إنك تخدعني على جميع الخطوات، ما هي هذه الصداقة أيها الحبيب؟ إذهب بي إلى بلدك وماذا تتفكّر عنّي أيها الموت؟

(۳۸) محسن نقوی، غزلیات، (۲۰۱۵م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان.ص۲۳۷

(۳۹) محسن نقوی، غزلیات، (۲۰۱۵م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان.ص۲۳۸

(۴۰) محسن نقوی، غزلیات، (۲۰۱۵م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان.ص۲۸۷

ذكر المحبة والعشق

إن العشق والمحبة هو شعور الذي ينبثق في الإنسان ويميل إلى شخص آخر، وهذا الفن يوجد في الشعر العربي القديم مذ العصر الجاهلي إلى العصر الحاضر، والشعراء الأرديون أنهم نظموا على هذا الفن أبياتا كثيرة وإلى ذلك يشير محسن نقوي قائلا:

پہلی پہلی محبتوں کا خمار
باتوں باتوں میں رات ڈھل جائے

اب کے دل میں وہ درد اترا ہے
غیر ممکن ہے آج کل جائے(۴۱)

ترجمة البيت: تنقضي الليالي بشغل الكلام مع الحبيب في المحبة الأولى، الآن احتلّ الألم في قلبي، لا يمكن أن يرتحل اليوم ولا في غد.

وصف اتّحاد الناس:

إن القوة للمجتمع الإسلامي هو الاتحاد، ومِنْ أَعْظَمِ أُصُولِ الْإِسْلَامِ وَأَمْتَنِ قَوَاعِدِ الْإِيمَانِ: الْحِرْصُ عَلَى تَحْقِيقِ الْإِخَاءِ بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ، وَإِفْشَاءِ الْمَحَبَّةِ بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ، وَالتَّرَابُطِ بَيْنَهُمْ، يَقُولُ رَبُّنَا جَلَّ وَعَلَا:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾(۴۲)

إلى ذلك يشير نبينا ﷺ عن وحدة الأمة المسلة قائلا:

''مثل المؤمنين في توادهم وتراحمهم وتعاطفهم مثل الجسد إذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى''(۴۳)

---

(٤١) محسن نقوی، غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان.ص٢٣٨

(٤٢) سورة الحجرات، ١٠/٤٩

(٤٣) مسلم، الصحيح، ج٤، ص١٩٩٩، رقم:٢٥٨٦

تنبع أهمية وحدة المسلمين من أنّها سبيل لتوحيد صفوفهم، ولمّ شعثهم، وجعلهم كيانًا وجسدًا واحدًا، على اختلاف أعراقهم وأنسابهم وألوانهم وبلدانهم، والوحدة مطلب وهدف ترنو إليه المجتمعات البشرية كلّها، وتبذل كلّ ما لديها للوصول إليه، فوحدة المسلمين مؤدية إلى قوتهم ومنعتهم وعزتم، فلا ينال أعداؤهم بها منهم،ووحدة الأمة الإسلامية فرض واجب، وقد أقرّ الله تعالى هذا المفهوم، فكانت الأوامر والنواهي موّجهة للجماعة وليست للفرد الواحد، وإلى هذه الوحدة الإسلامية يشير محسن نقوي:

میں خوش ہوا کہ لوگ اکٹھے ہیں شہر کے
باہر گلی میں شور تھا لیکن ہوا کا تھا(٤٤)

ترجمة البيت: كنت مسرورا جدا في الخارج عن اجتماع الناس، لما خرجت وفهمتُ أن كان ذلك الضوضأ هو ضوضأ الهواء.

هذا البيت يشير بأن محسن نقوي هو كان شاعرا عظيما وكان يشتهي أن يتّحد الناس اتحادا تاما لأن الناس ليس لهم الفائدة إلا في الإتحاد.

وصف فقدان القيم الأخلاقية

إن المجتمع الإسلامي هو ينصح الأمة الإسلامية بأن يعتنقوا القيم الإسلامية وأن يعيشوا حسب القيم الأخلاقية والإسلامية والروحانية، كما أن القيم الخلقية هي المجموعة السلوكية التي تحدد السلوك الإنساني وتنظمه، وينبغي للإنسان أن يزيّن نفسه بالخلق العالية في حياته، فالمؤمن يجب له أن يزين نفسه بالأخلاق الإسلامية العالية مثل الوفاء والكرم والمروءة واجتناب الزور والبغي والخدع والأخلاق الرذيلة، وإلى هذه القيم يشير محسن نقوي:

اس جنس کا گاہک کوئی ملتا نہیں ورنہ
اس دَور میں سستا ہے بشر، لعل و گہر سے(٤٥)

---

(٤٤) محسن نقوی، غزلیات، (٢٠١٥م) سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان،-ص٢٤٤

ترجمة البيت: لا يوجد زبون مثل هذا في السوق، وإلا أن البشر هو رخيص جدا من العل والياقوت.

الوصف عن شَعر المحبوب

لقد نظم محسن نقوي أبياتا كثيرة عن وصف المحبوب، وأنه يصف الحبيب أحيانا ويصف عينه أحيانا ويصف خدّه أحيانا، ويصفه بالجهات المختلفة، وهو يقول:

تو نے اپنی زلف کے سائے میں افسانے کہے
مجھ کو زنجیریں ملی ہیں جرأتِ اظہار پر(٤٦)

ترجمة البيت: لقد نظمتَ الروايات والقصص في ظلِّ شَعرِك، ولكن حصلتُ السلاسل لأجل الرزانة.

يقول مزيدا:

بار ہا خواب میں پا کر مجھے پیاسا محسن
اُس کی زلفوں نے کیا رقص گھٹاؤں جیسا(٤٧)

ترجمة البيت: لقد وجدتْني في الأحلام ورقصتْ أشعاره مثل الغمام.

قلقانه عن إهمال الناس

إن الإهمال عن الناس هي شيء قبيح ولا يليق لمسلم أن يهمل عن أخيه وعن جيرانه، والإسلام هو يؤكد المسلمين بأن يعتنوا إخوانهم في جميع الأوقات، وأحيانا يكون الناس أعداء بينهم بعد وقوع الفجار. وهذه العادات هي ليست من عادات الإسلام، وإلى ذلك يشير محسن نقوي:

---

(٤٥) محسن نقوی، غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص٢٥٧

(٤٦) محسن نقوی، غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص٢٦٧

(٤٧) محسن نقوی، غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص٢٧٧

منسوب تھے جو لوگ میری زندگی کے ساتھ
اکثر وہی ملے ہیں بڑی بے رُخی کے ساتھ(۴۸)

ترجمة البيت: إن الناس لقوني بالجفاء الذين كانوا معي في حياتي.

موقفه عن الإخداع مع الناس البلهاء

إن الخداع هو عادة قبيحة ولا ينبغي للمسلم أن يخدع لأخيه، وأن الإسلام هو يمنع الخدع بين المسلمين، والخِدَاع له آثارٌ وأضرارٌ تعود على المخَادِع نفسه، وعلى المجتمع الذي مِن حوله، والخداع مضرات كثيرة منها: إن الخداع هو سبب موصل النار، كم أنه يولّد البغضاء والشحناء بين الناس. ومحسن نقوي هو يمنع الناس أن يخدعوا أنفسهم وإلى ذلك هو يشير:

چہرے بدل بدل کے مجھے مل رہے ہیں لوگ
اتنا بُرا سلوک مری سادگی کے ساتھ؟(۴۹)

ترجمة البيت: إن الناس هم يلقوني بتغييرات وجوههم، ولما هذا السلوك بي؟

موقفه عن الإخلاص والكرم

إن الكرم والإخلاص هذان عادتان لطيفان في الأدب الإسلامي، والإخلاص هو أصل العمل، وبه يُقبل ويتحقق الثواب، فإن حقيقة العبادة أنها سر يتعلق بالقلب، وينبع من الروح، وليست شكلاً يتعلق بالمظهر، وإلى إخلاص المحبوب يقول محسن نقوي قائلا:

محسن کرم کی لَے بھی ہو جس میں خلوص بھی
مجھ کو غضب کا پیار ہے اُس دشمنی کے ساتھ(۵۰)

---

(٤٨)محسن نقوی، غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص٢٦٩

(٤٩)محسن نقوی، غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص٢٦٩

ترجمة البيت: الرجل الذي عنده كرم وإخلاص، إنني أحبه حبا جما لو كان هو عدوًّا لي.

وصف لهجة المحبوب

إن لهجة الكلام هو يجلب الناس إلى الشخص، واللهجة تدل على مكانة الشخص وإلى ذلك يشير محسن نقوي قائلا:

یہ تلخ سا لہجہ، یہ تیز سی بات
مزاجِ یار کا عالم شراب جیسا ہے(۵۱)

ترجمة البيت: هذه اللهجة المريرة، وهذا الأسلوب السريع للكلام، هذه لهجة الحبيب مثل الخمر.

موقفه عن الحياة

إن الحياة هي وقت مؤقت للإنسان وهو يعمل فيه الأعمال الحسنة أم الأعمال القبية، وبعد ذلك سوف يسئل عنه عن الأيام التي قضى في حياته ولا شك فيه بأن الدنيا ليستْ لها ثبات ولا بقاء، ولا يفرح العاقل بالمال الكثير في الدنيا ولا يحزنه قلّته ولكن مال عقله عن الدنيا لأن الدنيا الدّنيا أيام وليالٍ نعيشها وعمراً طويلاً، كما جاء في القران الكريم

﴿وَمَا هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾(۵۲)

وقال تعالى في مقام آخر:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ○ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾(۵۳)

---

(۵۰)محسن نقوی، غزلیات، (۲۰۱۵م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص۲۶۹

(۵۱)محسن نقوی، غزلیات، (۲۰۱۵م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص۲۷۳

(۵۲) سورة العنكبوت، ۶۴/۲۹

(۵۳) سورة الرحمن، ۲۶/۵۵-۲۷

والحياة هي وقت مؤقت ومقيّد للإنسان وسوف ينقضي هذا الوقت وإلى هذه الحقيقة المريرة يشير محسن نقوي قائلا:

یہ اندھیرا یہ روشنی کیا ہے
آؤ سوچیں کہ زندگی کیا ہے(۵۴)

ترجمة البيت:هذا الظلام وهذا الضوء ما هذا الشيئان؟ تعالوا أن نتفكّروا عن الحياة.

موقفه عن إعطاء نظر الكرم

إن نظر المحبوب هو نظر عظيم وأحيانا هذا النظر يحيي المحب وقلبه، وأحيانا يميت المحب وقلبه، وهذا اِلتفات النظر له مكانة عظيمة عند الشعراء الكبار مهما يكون في الأدب العربي أم في الأدب الأردي، وإلى هذه العناية يشير محسن نقوي:

اُس نے آنکھ سے بخشی ہے وہ تاثیر کہ اب تک
ملتی ہے ہمیں گردشِ دوراں بھی ادب سے(۵۵)

ترجمة البيت:إنه أعطاني تأثيرا لطيفا، لأجله يلقونني أهل الزمان بالأدب والكرم.

وصف علاج القلب بنظر المحبوب

إن المحب هو يحتاج نظر المحبوب إلى نفسه جميع الأحيان، والمحب يريد أن ينظر إلى حبيبه ولا ينظر إلى شيء آخر بأن المحب هو يجد الشفا في نظرة حبيبه، وإلى هذه الحقيقة يقول محسن نقوي:

ترے بغیر یہاں کون زیرِ سایہ لب
جراحتِ دل و جاں کا علاج رکھتا ہے؟(۵۶)

---

(٥٤)محسن نقوی، غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص٢٨٧

(٥٥)محسن نقوی، غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص٢٨٩

ترجمة البيت: من هو يعالج جراحات قلبي بدونك؟

المنصب حسب المنزلة والقدر

إن المناصب والمنازل هي تأتي حسب الأقدار والمحاسن، وهذه هي الحقيقة المريرة بأن المنصب يتفضل عليه الشخص الذي هو يكون أهلا له، وإلى هذا يشير محسن نقوي:

منصب بقدرِ قامتِ کردار چاہیے
کٹے ہوئے سروں کو بھی دستار چاہیے(۵۷)

ترجمة البيت: إن المنصب هو يحتاج ويتقاضى حسب القدر والمنزلة وتحتاج الرؤس المقطوعة الأثواب.

في هذا البيت يقول الشاعر الشهير محسن النقوي عن المنصب والأجساد المقطوعة التي تحتاج الأثواب لتغطيتهم، وهو يقول عن المناصب الدنيوية قائلا: إن المناصب الدنيوية هي تحتاج المنزلة والقدر في الحقيقة ولكن الناس في هذه الأيام يُهملون عن هذا.

وصف الظلم في المجتمع الباكستاني:

إن الظلم هو ظلمات يوم القيامة، والظلم والتعدّي والعدوان ولا يجوز لأحد أن يظلم على المسلم، كما منع الله تعالى في القرآن وجاءت الأحاديث الكثيرة عن منع الظلم، والمظلوم له مكانة عند الله كما جاء في الحديث:

''واتق دعوة المظلوم فإنه ليس بينه وبين الله حجاب''(۵۸)

هكذا وردت الأحاديث الكثيرة والآثار عن الصحابة والتابعين بأنهم منعوا الظلم عن الناس وإلى ذلك يشير محسن نقوي عن وصف الظلم قائلا:

(٥٦)محسن نقوی، غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص٣١٤

(٥٧) محسن نقوی، غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص٣٣١

(٥٨) بخاري، الصحيح، ج٢، ص٥٤٤، رقم:١٤٢٥

ہے مدعی کی فکر نہ مجرم سے واسطہ
منصف کو صرف اپنا طرفدار چاہیے(٥٩)

ترجمة البيت: لا يفكّر المنصف عن المدعي والمجرم الظالم، وأنه هو يفكّر عن صديقه وأعوانه.

هذا البيت يمثّل ويعبّر في الحقيقة لمجتمع الباكستاني بأن الناس هم يظلمون ويتعدون على المسلمين ولا يخافون الله ولا يعرفون حقوق المسلمين، والحقيقة المؤلمة بأن محسن نقوي أنه عانى هذا الظم في المجتمع الباكستاني.

سبب البُعد من الله تعالى

إن البعد عن الله تعالى له أسباب كثيرة، منها الغفلة والكسلان عن ذكر الله وعن الصلاة، وأداء الزكاة، وصيام رمضان وأداء الأمانة إلى أهلها، وفقدان تكريم الكبار والضعفاء، ومنح العطاء للفقراء، وهذه الأسباب الأساسية التي جعلت بين الله وبين الناس حجاب، وإلى ذلك يشير محسن نقوي قائلا:

نعمتیں ہیں نہ عذابوں کا تسلسل اب تو!
مجھ سے رُخ پھیر لیا ہے میرے خدا نے کب سے(٦٠)

ترجمة البيت: لا تنزل عليَّ النِّعمُ ولا العذابُ، أظن أن ربي هو غاضبٌ عليَّ.

إضطرابه عن مشاعر الناس

كان محسن نقوي شاعرا منعطفا وعنده معاطف ومشاعر كثيرة عن الناس، ولكن حينما لاحظ المجتمع الإسلامي واضطرب جدا بأن الناس ليس لهم قدر ولا مكانة للناس، وأنهم يتجاوزون عن إخوانهم ولا يعتنون وإلى ذلك يشير محسن نقوي:

(٥٩) محسن نقوی، غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص٣٣٢
(٦٠) محسن نقوی، غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص٣٣٣

ڈوبنے والوں کی آوازیں خلا میں کھو گئیں
لوگ چنتے ہی رہے ساحل سے تازہ سیپیاں(٦١)

ترجمة البيت: إن أصوات الناس الغريقين قد افتقدوا، ولكن الناس هم كانوا مشغولين بإنتخاب الأصداف.

موقفه عن الحبّ

إن الحب هي كلمة الإحساس والعواطف وهذا الإحساس يوجد في كل إنسان، والحب هو الميل والإعجاب إلى شخص ما، وهو شعور نبيل طاهر، لا معنى للحياة دونه. يقول محسن نقوي عن وصف الحب قائلا:

ملنے والے کئی مفہوم پہن کر آئے!
کوئی چہرہ بھی نہ آنکھوں نے پڑھا تیرے بعد(٦٢)

ترجمة البيت: كان الناس يأتون إليَّ ولكن لم أقدر أن أقرأ وجهَ أيّ أحد بدونك.

وصف الليل

منذُ أن بدأ الإنسان سعيَه إلى التّعبير عن أفكارِه وآرائه، وتجسيد خواطره ومشاعره، سواء كان شاعرًا أم رسّامًا أم موسيقيًّا أم نحّاتًا، عمد إلى الطّبيعة وما تحتويه من إبداع وجمال، حيث رأى فيها مسارح فسيحة يتحرّك فيها عقله، ويسبح فيها خياله، وتحطّ عليها مشاعره وآلامه، فخلّف في متاحف الفنّ صورة لإبداعه، ومثلًا من أخلاقه، ويعدّ الوصف في الشّعر العربيّ من الأغراض الشّعريّة الأصيلة، حيث طرق الشّعراء به كلّ ميدان قرب من حسّهم وإدراكهم، أو قام في تصويرهم، فالشّاعر الواصفُ واسع الخيال قادر على تصوير المحسوس إلى صورة حيّة، يظهر فيها إبداعه النّاتج عن انفعالاته وتأثّره بما حوله، وكان للّيل نصيبُه في الوصف في الشعر العربيّ، فقد تعرّض الشّعراء لوصف اللّيل في كلّ العصور الأدبيّة، وتاليًا بَدءٌ بالعصر الجاهليّ. يقول امرؤ القيس عن وصف الليل:

---

(٦١) محسن نقوی، غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص٣٣٨

(٦٢) محسن نقوی، غزلیات، (٢٠١٥م)، سعید بک بنک، اسلام آباد، پاکستان. ص٣٤٢

وَلَيلٍ كَمَوجِ البَحْرِ أَرْخَى سُدولَهُ

عَليّ بأَنْواعِ الهُمُومِ ليَبتَلي(٦٣)

وهذا الفن يوجد منذ العصر الجاهلي كان شائعا في جميع العصور كما يذكر أبو الطيب أحمد بن الحسين المتنبي عن وصف الليل قائلا:

الخيل والليل والبيداء تعرفني

والسيف، والرّمح والقرطاس والقلم(٦٤)

وإلى هذه العادات لأهل العرب يسير محسن نقوي عن نظم شعر الوصف وهو يقول:

دل نے تنہا جھیلی رات

ہجر کی رات، اکیلی رات

اُس کی آنکھ سے چھلکی شام

اُس کی زلف سے کھیلی رات(٦٥)

ترجمة البيت: لقد عانى القلب عن ليل الهجر، لقد انفجر المساء من عيونه، ولعب الليل مع شَعْرِهِ.

هذا البيت يمثّل وصف الليل مثل الشعراء في العصر الجاهلي الذين هم كانوا يصفون الليل في أبياتهم، مثل امرء القيس وغيره ذلك.

---

(٦٣) امرؤ القيس، الديوان، ص٢٦

(٦٤) متنبي، الديوان، ص٢٣

(٦٥) محسن نقوى، غزليات، (٢٠١٥م)، سعيد بک بنك، إسلام آباد، پاكستان. ص٣٤٦-٣٤٧

خلاصة البحث:

الوصف هو فن من فنون الشعرية القديمة الذي كان شائعا منذ العصر الجاهلي وشاع منذ بداية اللغة الأردية في شبه القارة، وقد كتب محسن نقوي أبياتا كثيرة عن الوصف، منها الحب، والظلم، ووصف خد المحبوب، ووصف الليل، ووصف القمر، وهكذا أكثر أبياته تدور حول الوصف وأنه لم يترك أي فنا إلا طرقه ونظم عن ذلك الموضوع شعرا عظيما. ولا شك في هذا بأنه كان شاعرا بارزا ورائدا في للأدب الأردي ولا يزال يُذكر ذكره كما أنه أسهم إسهامات عالية لنشر الأدب الأردي في شبه القارة

☆☆☆☆☆

﴿المصادر والمراجع﴾

القرآن الكريم

أزهري، أبو منصور محمد بن أحمد، (٢٠٠١ء)، تهذيب اللغة، دار إحياء التراث العربي، بيروت.

بخاري، أبو عبد الله محمد بن إسماعيل، (١٩٨٧ء)، الصحيح، دار ابن كثير، بيروت، لبنان.

التّرمذيّ، أبو عيسى محمّد بن عيسى السّلميّ،(دون سنة الطبع). السّنن، دار إحياء التّراث، بيروت.

جبور عبد النور، الوصف في الأدب العربي، مصر

جالبي، جميل، تاريخ الأدب الأردي (١٩٨٢م). ايجوكيشنل ببلك هاؤس، دهلي، الهند

حميد الله الهاشمي، (س.ن). تاريخ اللغة والأدب الأردي، باكستان

الزّيّات، أحمد حسن، (١٩٩٣م)، تاريخ الأدب العربي، دار المعرفة، بيروت، لبنان

زمخشري، أبو القاسم محمود بن عمر، (١٩٧٩ء)، أساس البلاغة، دار الفكر، بيروت.

الطّبراني، أبو القاسم سليمان بن أحمد، (١٤١٥ھ). المعجم الأوسط، دار الحرمين، القاهرة.

محمد شمس الحق، پیمانۂ غزل، (٢٠٠٨م) مطبع مارشل، *راولپنڈی*، اسلام آباد، پاکستان

محسن نقوی،غزليات، (٢٠١٥م)، سعيد بک بنک، اسلام آباد، پاکستان

مناوي، عبد الرؤوف المناوي، (دون السنة)، التوقيف على مهمات التعاريف

ابن فارس، أبو الحسين أحمد بن فارس، (١٩٩٩ء)، مقاييس اللغة، دار الجيل، بيروت، لبنان.

فيروز الدين، (٢٠٠٤م). فيروز اللغات، فيروز سنز، كراتشي، باكستان

القيرواني، ابن رشيق، (١٩٧٢م)، العمدة في محاسن الشعر، دار الجيل، بيروت.

مسلم، أبو الحسين مسلم بن الحجاج، (دون السنة)، الصحيح، دار إحياء التراث العربي، بيروت.

مولوي عبد الحق، (١٩٦١م). قواعد اللغة الأردية، كراتشي، باكستان

نصير الدين الهاشمي، (١٩٦٠م). دکّن میں اُردو، لاهور، باكستان

هاشمي، فريد الدين، (س.ن). تاريخ مسلمانان باكستان وبھارت، لاهور، باكستان